اکتوبر۔دسمبر ۲۰۱۵

الاقربأ

ڈاکٹر جاوید اقبال (مرحوم)

الاقربا ءفاؤنڈیشن، اسلام آباد

سہ ماہی الاقرباء اسلام آباد

(تہذیب و معاشرت، علم و ادب اور تعلیم و ثقافت کی اعلیٰ قدروں کا نقیب)

جلد نمبر ۱۸ شمارہ نمبر ۴ اکتوبر۔ دسمبر ۲۰۱۵ء

الاقرباء فاؤنڈیشن، اسلام آباد

مکان نمبر ۳۶۴، سٹریٹ نمبر ۵۸، آئی ۸/۳، اسلام آباد (پاکستان)

Ph.051-4442686 Fax 051-8739058

website www.alaqreba.com

E-mail alaqreba@hotmail.com

بیرون ملک مشیرانِ اعلیٰ

بیرسٹر سلیم قریشی

2-A Barclay Chamber, Barclay Road, Leytonstone

London, E-11. 3 DG (U.K.)

Phone (0208)5582289, Fax (0208)5583849

Email: Barqureshi@ hotmail.co.uk

محمد اویس جعفری

3202, 140th street, SE

Mill Creek WA 98012- 4677 (USA)

Phone: (001) 425-385-8666

E-mail: Jafreyomi@gmail.com

زرِ تعاون

فی شمارہ	۳۰۰ روپے
سالنامہ ۲۰۱۵ء	۶۰۰ روپے
سالانہ (مع محصول ڈاک)	۱۲۰۰ روپے
بیرون ملک فی شمارہ (مع محصول ڈاک)	۱۰ امریکی ڈالر/ ۷ برطانوی پاؤنڈ
بیرون ملک سالانہ (مع محصول ڈاک)	۴۰ امریکی ڈالر/ ۳۰ برطانوی پاؤنڈ

کوائف نامہ

شمارہ	اکتوبر۔دسمبر ۲۰۱۵ء
کمپوزنگ	ثاقب جمیل
طابع	ضیاء پرنٹرز، اسلام آباد
ناشر	سیّد ناصر الدین

مندرجات

نمبر شمار	عنوان	مصنف	صفحہ
۱۔	مفسّرِ اقبال اور عظیم دانشور۔۔۔ڈاکٹر جاوید اقبال کی رحلت (اداریہ)	ادارہ	۶
۲۔	جمیل الدین عالی۔۔۔'اک چراغ اور بجھا اور بڑھی تاریکی' (ذیلی اداریہ)	ادارہ	

مضامین و مقالات

نمبر شمار	عنوان	مصنف	صفحہ
۳۔	شاہ ولی اللہ کی عمرانیات	محمد طارق غازی	۱۳
۴۔	جامع عقبیٰ اور جامعۃ القرویین	محمد اویس جعفری	۴۱
۵۔	غالب کے اردو کلام میں رموزِ اوقاف	محمد فیصل مقبول عجز	۴۶
۶۔	ابوالفاضل راز سرور چاند پوری کی غزلیہ شاعری	سرور عالم راز سرور	۵۷
۷۔	ماہر علوم نجوم ورمل اور صانعِ شعر و غزل عبدالغفور نساخ خالدی	سید انتخاب علی کمال	۷۶
۸۔	صادقین۔۔۔ایک خلاق مصور و مفکر	مسلم شمیم	۸۷
۹۔	فیض احمد فیض بحیثیت ایک عظیم مفکر	طارق بن عمر	۹۷

اقبالیات

نمبر شمار	عنوان	مصنف	صفحہ
۱۰۔	سپاس جنابِ امیرؑ (فارسی)	ڈاکٹر محمد اقبالؒ	۱۰۱

گوشۂ جمیل الدین عالی

نمبر شمار	عنوان	مصنف	صفحہ
۱۱۔	جمیل الدین عالی۔۔۔'ایک روشن دماغ تھا نہ رہا'	پروفیسر ڈاکٹر غلام شبیر رانا	۱۰۵

۱۲۔ جمیل الدین عالی۔۔۔ محمد طارق غازی ۱۲۸

۱۳۔ جمیل الدین عالی۔۔۔شناخت کی جستجو (انگریزی) ابوالحسنات ۱۴۲

۱۴۔ جمیل الدین عالی۔۔۔میری نظر میں صاحبزادی اُنیسہ بانو ۱۵۲

عالمی ادب

۱۵۔ ہرمن نارتھروپ فرائی پروفیسر ڈاکٹر غلام شبیر رانا ۱۵۷

افسانہ

۱۶۔ تنہائی سلیم زاہد صدیقی ۱۷۰

۱۷۔ تصویر بتاں عثمانہ اختر جمال ۱۷۷

۱۸۔ آج کا شروَن کمار فرزانہ اعجاز ۱۸۱

متفرقات

۱۹۔ 'الاقرباء' میں مطبوعہ سال ۲۰۱۵ء کی بہترین نظم ادارہ ۱۸۸

۲۰۔ پروفیسر ڈاکٹر اویس جعفری کی نظم سراپا۔تاثرات (انگریزی) پروفیسر ڈاکٹر نسیم اے ہائنز ۱۸۹

۲۱۔ استنبول (ترکی) میں عالمی اردو کانفرنس (رپورٹ) سید مجاہد علی ۱۹۳

۲۲۔ استنبول کانفرنس کا ایک اور رُخ رضا علی عابدی ۱۹۶

حمد و نعت

۲۰۰

۲۳۔ شفق ہاشمی۔صابر عظیم آبادی۔راشدہ شعیب۔ریاض ندیم نیازی

غزل ۲۰۳

۲۵۔ مضطر اکبرآبادی۔صابر عظیم آبادی۔محمد طارق غازی۔پرتو روہیلہ۔
انور جہاں برنی۔شفق ہاشمی۔زہیر کنجاہی۔ریاض ندیم نیازی۔کرامت بخاری۔
ڈاکٹر سید قاسم جلال۔سلیم زاہد صدیقی۔اویس الحسن۔نازیہ جلیل عباسی۔

نظم ۲۱۳

۲۶۔ علی احمد قمر۔محمد طارق غازی۔شفق ہاشمی۔پروین شیر۔محمد اویس جعفری۔
رشید آفریں۔اویس الحسن۔

رباعی

۲۷۔ صابر عظیم آبادی ۲۲۲

نقد و نظر ۲۲۳

۲۸۔ سید منصور عاقل۔ڈاکٹر جاوید احمد خورشید

مراسلات ۲۳۷

۳۰۔ انتخاب علی کمال۔بیرسٹر سلیم قریشی۔محمد طارق غازی سرور عالم راز سرور۔
پروفیسر محمد ابو خالد۔پروین شیر۔خواجہ مشتاق حسین۔عثمانہ جمال۔مسعود صدیقی۔
صوفیہ انجم تاج۔سید محبوب حسن واسطی۔اشرف علی۔قاضی ظہیر احمد۔
امجد قریشی۔محمد فیصل مقبول عجز۔صابر عظیم آبادی۔کرامت بخاری۔
سید قاسم جلال۔رشید آفریں۔صبیحہ رحمان

خبر نامہ الاقرباء فاؤنڈیشن

۳۱۔ احوال و کوائف — سیدہ سارہ سلمان ۲۷۳

۳۲۔ گھریلو چٹکلے — سیدہ سارہ سلمان ۲۷۴

مفسّرِ اقبالؒ اور عظیم دانشور۔۔۔ڈاکٹر جاوید اقبال کی رحلت

سال ۲۰۱۵ء جاتے جاتے اکتوبر ہی میں اہل پاکستان کو بالخصوص اور جہانِ علم و دانش کو بالعموم ایک ایسے سانحہ سے دوچار کر گیا جسکی کسک نہ جانے کب تک حساس دلوں کو اپنی گرفت میں لیے رہے گی۔ ڈاکٹر جاوید اقبال جنھوں نے آخر دم تک مفسّر و شارحِ اقبالؒ اور بین الاقوامی شناخت کے محقق۔ دانشور۔ فقہ اسلامی کے ماہر اور قانون دان کی حیثیت سے خود کو منوایا۔ وہ غالباً فیضان تھا مصوّرِ پاکستان حضرت علاّمہ اقبالؒ کی اُن دعاؤں کا جن کا اظہار شفقتِ پدری کی صورت میں علاّمہ کی فارسی نظم 'خطاب بہ جاوید' کے آخری شعر میں ہوتا ہے:

''اے کہ تو جاوید میری بیقرار جاں کے لئے تسکین کا باعث ہے۔ تو اگر رقصِ جاں سے تسکین حاصل کرلے پھر میں تجھے دینِ مصطفےٰ کا راز بتاؤں گا اور میں تیرے لیے قبر کے اندر بھی دعا کرتا رہوں گا'' (ترجمہ)

دینِ مصطفےٰ کا راز منکشف ہونا ہی سبب تھا کہ ہونہار فرزندِ اقبال نے اپنے یگانہء روزگار والد کی خواب میں زیارت کی اور ان کے تعمیل ارشاد میں اُن کی حیات اور فکر و نظر کی وسعتوں کو اپنی مرتب کردہ شاہکار کتاب ''زندہ رُود'' کی دو ضخیم جلدوں میں پیش کرنے کے ساتھ ساتھ اِسلامی تاریخ اور فلسفہ پر اپنی عمیق بصیرت، حق گوئی اور اُصول پسندی کے برملا شواہد سے خود کو حکیم الامت کے ورثۂ دانش کا حقیقی وارث ثابت کر دیا۔ ہر چند کہ ڈاکٹر جاوید اقبال مرحوم کی تعلیم میں تاریخ و فلسفہ، سیاست و قانون اور مذاہب کا مطالعہ شامل رہا لیکن اُن کی مصنفہ و مؤلفہ کتب جن میں اسلام، فلسفہ اور نظریۂ پاکستان (بفرمائش سابق صدر پاکستان فیلڈ مارشل محمد ایوب خان) کے موضوعات کے علاوہ بھی (خطباتِ اقبال۔۔۔ تسہیل و تفہیم) نیز دیگر کتب مثلاً علاّمہ کے شہرۂ آفاق لیکچرز (انگریزی) بعنوان 'اسلام میں مذہبی فکر کی تشکیلِ جدید'، اور فارسی تصنیف 'جاوید نامہ' کے

تراجم کے علاوہ خودنوشت سوانح 'اپنا گریباں چاک' 'قائداعظم کا ورثہ' 'افکار اقبال' 'اسلام اور پاکستان' 'اسلام میں ریاست کا تصور' وغیرہ شامل ہیں انکی خودنوشت سوانح کا مطالعہ یہ باور کرانے میں مدد فراہم کرتا ہے کہ اُنھوں نے اپنی زندگی میں خصوصاً ابتدائی عہد کی ناہمواریوں کے باوجود دانش وحکمت اور علم وتدبر کی دُنیا میں جو منزلت اور مقام حاصل کیے وہ اُن کی مسلسل سعی و کاوش کے روشن باب ہیں ۱۱ سال کی نوعمری میں ماں کی شفقت سے محرومی کوئی کم حادثہ نہ تھا کہ تین سال بعد ہی ایک عظیم باپ کی جانکاہ وفات کا صدمہ برداشت کرنا پڑا جس کا عکس ابتدائی تعلیم کے مراحل پر واضح نظر آتا ہے تاہم وقت کے مورّخ کو تسلیم کرنا پڑے گا کہ اقبال کے بیٹے نے کٹھن زندگی کے کسی بھی مرحلے پر سپرِ ہمت کو گرنے نہیں دیا۔ 'قراردادِ پاکستان' کے وقت اگرچہ اُن کی عمر ۱۶ سال تھی لیکن اسلامیانِ برصغیر کے ایک علیحدہ آزاد وخودمختار مملکت کے مطالبے نے جو قائداعظمؒ کی ولولہ انگیز قیادت میں کیا گیا تھا نوعمر جاوید اقبال کے دِل ودماغ میں حصول پاکستان کے نصب العین کو اور بھی پختہ کر دیا جس کا اظہار ۱۹۴۶ء میں اُن کے اخبار ڈان میں مطبوعہ دو اہم مضامین 'قائداعظم' اور 'اسلام اور پاکستان' سے ہوتا ہے۔ اُنھوں نے گورنمنٹ کالج لاہور سے انگلش اور فلسفہ میں ماسٹرز کیا۔ کیمبرج سے ڈاکٹریٹ کیا اور لنکنز اِن سے بیرسٹر (بارایٹ لاء) بن کر فارغ التحصیل ہوئے یہی نہیں بلکہ ان کی بین الاقوامی شہرت وعظمت کو امریکہ واُردن کی جامعات کی جانب سے پی۔ایچ۔ڈی کی اعزازی ڈگریوں نے سندِ اعتبار عطا کی۔

اگرچہ دو دن کم اکانوے (۹۱) سال کی زندگی کو طویل العمری سے بھی تعبیر کیا جاسکتا ہے لیکن مجموعی طور پر فرزندِ اقبال نے صفحۂ ہستی پر جو اَنمٹ نقوش چھوڑے ہیں تاریخ ہمیشہ ان کی گواہی دیتی رہے گی اُن کی کثیر الجہت زندگی جن اعلیٰ وارفع مراتب واعزازت سے مزین ہے۔ اُن میں چیف جسٹس عدالتِ عالیہ اور عدالتِ عظمیٰ کے سینیئر جج کے مناصب جلیلہ سے قبل ہائی کورٹ بارایسوسی ایشن کے صدر اور ایک بیرسٹر پار ایکسیلنس (Barrister Par Excellance) کی حیثیت سے قابلِ رشک شہرت ہی نہیں بلکہ تین بار اقوامِ متحدہ میں پاکستانی وفد کے ممتاز رکن کے طور پر ملک

کی نمائندگی کا شرف نیز ادب، فلسفہ اور اقبالیات پر دسترس کے حوالے سے 'ہلالِ امتیاز' کا بلند ترین قومی اعزاز حاصل کیا۔

اِس پس منظر کے باوجود گذشتہ برسوں میں ڈاکٹر جاوید کے انفرادی افکار و نظریات کو متنازعہ بنانے میں بعض جبریہ روّیوں کا کردار نظر آتا ہے ہر چند کہ بشمول ڈاکٹر جاوید اقبال کسی بھی شخص کو حضرت علامہؒ کے واضح اور دو ٹوک خیالات کی من پسند تعبیر و تشریح کرنے کا اختیار نہیں لیکن ذاتی نقطۂ نظر کا برملا ابلاغ آزادیٔ رائے کے عالمگیر فطری حق یا دُنیا کے کسی بھی آئین و قانون سے متصادم نہیں سمجھا جاتا۔ چنانچہ اس سیاق و سباق میں ڈاکٹر جاوید اقبال کے ۱۹۵۷ء میں پاکستان واپسی سے قبل اُن کا مسلسل سات برس انگلستان میں قیام محلِ نظر ہے جس کے دوران وہ مغربی تہذیب و تمدن کے دائرہ اثر میں رہے اور یہ حقیقت اُن کے اعلانات میں شامل ہے کہ تنہائی دور کرنے کے لئے اُنھوں نے مغربی تمدّن کو اپنایا اور لندن میں مغربی رقص بھی سیکھا۔ درج ذیل شعر ان کا بخوبی دفاع کرتا ہے:

درمیانِ قعرِ دریا تختہ بندم کردئی　　　　باز می گوئی کہ دامن تر مکن ہشیار باش

چنانچہ پاکستان واپسی پر اقبال اکادمی کراچی نے اُنھیں یومِ اقبال کی ایک تقریب میں مدعو کیا جہاں اُنھوں نے 'لبرلزم' کو اپنے مقالے میں نظریۂ پاکستان کی بنیاد قرار دیا اور یہیں سے اُن پر علامہ کے نظریات کی مختلف تعبیر و توضیح کرنے کے اعتراضات کا آغاز ہوا۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ ڈاکٹر جاوید اقبال کو بحیثیت فرزندِ اقبال اپنی شخصیت کی تعمیر و تشکیل اور منفرد شناخت قائم کرنے کے لئے ایک بہت بڑا چیلنج درپیش تھا۔ اُن کی زندگی کے حالات و قرائن بھی یہی بتاتے ہیں کہ اُن کے تحت الشعور میں دبی ایک چنگاری معرضِ اظہار میں آکر اس حقیقت سے پردہ اُٹھا دیتی تھی لیکن اُن کی یہ نفسیاتی نہج ایسی کچھ معیوب بھی نہیں کہ افراد میں خود کو منوانے کا جذبہ بھی ایک لابدی و ناگزیر نفسیاتی عمل ہے۔ بایں ہمہ اُن کی تخلیقی اور فکری جہتوں نے اُنھیں یقیناً ایک پُر افتخار شناخت عطا کی اور اُنھوں نے جس طرح اپنی وجدانی فکر کے

چراغ جلائے اُن سے جہانِ دانش تادیر منوّر رہے گا۔ ہر چند کہ ناقدین نے اُن کی اجتہادی فکر کی جزئیات کے حوالے سے اختلاف کیا لیکن مرحوم کے استدلال کی منطقی جہتیں بہر حال غور طلب ہیں۔ ان کی تصانیف و تالیفات کے علاوہ نظریۂ پاکستان لاہور کی آڈیو وژول لائبریری میں اُن کے خطبات و بیانات کا ایک ذخیرہ موجود ہے۔ ضرورت ہے کہ اس گنجینۂ علمی کی اشاعت کا بندوبست کیا جائے تاکہ آئندہ نسلیں بھی ان سے استفادہ کر سکیں اور مرحوم کے افکار و نظریات کی مزید وضاحت ہو سکے۔ ڈاکٹر جاوید اقبال خوش نصیب تھے کہ اُنھیں اقبالؒ جیسے عظیم باپ کی فرزندی کا شرف حاصل ہوا اور مستقبل کا ہر مورخ بھی اِسی کو اُن کا افتخارِ عظیم ٹھہرائے گا۔ اُن کی شخصی وجاہت بھی قدرت کا ایک عظیم عطیہ تھا جس نے اُنھیں شریکِ حیات کے طور پر بھی جہانِ قانون و انصاف کی ایک ممتاز شخصیت سے نوازا۔ جسٹس ناصرہ اقبال صاحبہ کی رفاقت نے مرحوم کی زندگی کو اور بھی گراں مایہ بنا دیا تھا جو مستقبل میں بھی انشاءاللہ اپنے دونوں فرزندوں کے لئے جو خود بھی اپنے لئے قانون کے پیشے کا انتخاب کر چکے ہیں تربیت و رہنمائی کا مینارۂ نور بنی رہیں گی۔

'این دعا از من و از جملہ جہاں آمین باد!'

جمیل الدین عالی۔۔۔ 'اک چراغ اور بجھا اور بڑھی تاریکی'

موت برحق ہے اور مبارک ہیں وہ لوگ جو اپنے پیچھے خوشگوار یادوں اور اعمالِ خیر کا ذخیرہ چھوڑ جاتے ہیں۔ یہی وہ ابدی دولت اور سرمایہ ہے جو دین اور دُنیا دونوں میں انسان کو سرخروئی عطا کرتے ہیں اور موت کے مادی تصور کو شکست سے دوچار کر جاتے ہیں۔

قاروں ہلاک شُد کہ چہل خانہ گنج داشت
نوشیرواں نہ مُرد کہ نامِ نکو گذاشت

جمیل الدین عالی بھی ایسی ہی ایک شخصیت تھے جن کے کثیر الجہت اوصاف حمیدہ

ناقابلِ فراموش ہیں اور مستقبل کا کوئی بھی مورخ اُن سے صرفِ نظر کرنے کا متحمل نہ ہو سکے گا۔ اُن کی اکتسابی اور وہبی صلاحیتوں کو اُن کی نسبی نجابت نے پروان چڑھایا۔ وہ ایک ایسے خانوادے کے چشم و چراغ تھے جس کی شناخت کے اجزائے ترکیبی ہی تہذیب و تمدن اور ادب و ثقافت پر مشتمل ہیں۔ عالی جی کی پیدائش بھی دلّی جیسے اعلیٰ شخصیات پرور شہر میں ہوئی جس کے کوچے بھی بزبانِ میرؔ اوراقِ مصوّر کہے جاتے تھے۔ غالبؔ اور داغؔ اردو شعری روایت کے دو عظیم نام بھی لوہارو کے حکمران خاندان کی شخصیات کی کہکشاں کے درخشاں ستارے تھے بلکہ غالبؔ کے لئے تو لوہارو ریاست 'کوچۂ جاناں' کی حیثیت رکھتی تھی کہ یہ اُن کی سسرال بھی تھی۔ عالی صاحب کی ہمشیرہ محترمہ طاہرہ بانو صاحبہ اپنی کتاب بعنوان ''خاندانِ لوہارو'' میں جو انھوں نے راقم الحروف کو عنایت کی تھی رقمطراز ہیں کہ:

''متحدہ ہندوستان میں چھوٹی بڑی تقریباً ۶۰۵ ریاستیں تھیں جن میں سے ایک ریاست لوہارو تھی۔ یہ ریاست چھوٹی ہونے کے باوجود ممتاز اور اہم ریاست تھی جس کی لمبائی ۳۰ میل اور چوڑائی ساڑھے چھ میل تھی۔ اس میں ستّر قصبات شامل تھے یہ ریاست صوبہ پنجاب کے جنوبی حصے میں واقع تھی۔ اس ریاست کی بنیاد ۱۸۰۴ء میں پڑی جس کے پہلے والی نواب احمد بخش خاں تھے اور نواب امین الدین احمد خاں ثانی شہریار مرزا آخری نواب تھے جن کی وفات ۱۹۸۲ء میں ہوئی اور ۱۹۴۸ء میں انڈیا کی دیگر ریاستوں کے ساتھ ریاست لوہارو بھی ختم ہو گئی تھی۔''

عالی صاحب کی ہمشیرہ محترمہ کی کتاب کا مطالعہ لوہارو خاندان کی شخصیات کے پیشِ نظر 'ایں خانہ ہمہ آفتاب است' کا ثبوت پیش کرتا ہے۔ راقم الحروف کو اِسی خانوادے کے ایک اور بزرگ مرزا اصلاح الدین محشر خلف الرشید نواب مرزا اعزاز الدین اعظم (نواب لوہارو) سے ۱۹۵۰ء کی دہائی میں جب وہ سابق ریاست بہاولپور کے ایک ضلع بہاول نگر میں بحیثیت ٹریژری آفیسر تعینات تھے تعارف اور تقرب کا شرف حاصل رہا ان کا کلام ''دیوانِ محشر'' اُن کی صاحبزادی

اُنیسہ بانو نے مرحوم کے انتقال کے بعد ۲۰۰۷ء میں طبع کرایا جس کی تقریظ اور محشر مرحوم کے حالات زندگی پروفیسر ڈاکٹر سید محمد عارف نے نہایت جامع انداز میں تحریر کیے ہیں۔ محشر صاحب اعلیٰ تعلیم یافتہ اور اُردو۔ انگریزی نیز فارسی زبانوں کے رموز و نکات اور فن عروض پر دسترس رکھتے تھے۔ اُنھیں داغؔ دہلوی کے داماد اور رشتے کے دادا سائل دہلوی اور بعد میں بے خود دہلوی سے بھی شرف تلمذ حاصل رہا۔ محشر مرحوم کو اپنے پھوپھا نواب ذوالفقار علی خاں کے ساتھ کئی بار علامہ اقبالؒ سے ملنے کا شرف بھی حاصل ہوا۔ محشر صاحب ہندی زبان کے بھی قادر الکلام شاعر تھے اور ایک ہندی رسالے 'کلیان' بمعنی بخشش میں اُن کے بھجن اور مضامین شائع ہوتے رہے ان کے افسانوں اور ناولوں میں اِسی لئے ہندی الفاظ کی چاشنی ہے اور یہ سب عالی جی کو بطور خاندانی ورثہ منتقل ہوا۔

عالی صاحب اردو ڈکشنری بورڈ کے صدر رہے۔ ۱۹۶۵ء کی پاک بھارت جنگ کے دوران اُنھوں نے حُبِّ وطن سے سرشار ہو کر جو ملی نغمے لکھے اُنھیں نہ صرف پوری قوم میں آج تک پذیرائی حاصل ہے بلکہ محاذ جنگ پر بھی پاک فوج کے جوانوں کے خون کو گرماتے رہے۔ انھوں نے کئی سفرنامے بھی لکھے۔ رائٹرز گلڈ کے بانی رکن کی حیثیت سے گرانقدر خدمات انجام دیں۔ وہ کم و بیش نصف صدی تک انجمن ترقی اُردو سے وابستہ رہے اور اُتنی ہی مدت اخباری کالم لکھ کر شہرت کا ریکارڈ ہی نہیں بلکہ اور بیرونِ ملک قارئین میں ہر دلعزیزی حاصل کی۔ اُنھوں نے اپنی زندگی کو وسعت دیکر ادب و صحافت کے علاوہ سیاست کے خارزار میں بھی آبلہ پائی کا حق ادا کیا اور سینیٹر منتخب ہو کر منفرد اعزاز حاصل کیا۔ حکومت نے اُنھیں اُردو ادب میں اُن کی خدمات کے اعزاز میں ۱۹۹۱ء میں تمغۂ حسنِ کارکردگی اور ۲۰۰۴ء میں تمغۂ امتیاز سے نوازا۔ عالی جی کی ایک بڑی خوبی یہ تھی کہ وہ ایک کھرے اور سچے انسان تھے۔ اس کا اندازہ راقم الحروف کے نام اُن کے ایک خط کے درجِ ذیل اقتباس سے کیا جاسکتا ہے:

''آپ کا خط بتاریخ ۳۱ اکتوبر ملا۔ شکریہ! افسوس ہے کہ آپ نے اپنے اتنے اچھے جریدے کی ترسیل میں سہواً میرا پتہ غلط لکھا اور میں چار شماروں سے محروم رہا، نہیں

حضرت! نہ میں مرزا غالب ہوں اور نہ یہ کراچی دلّی ہے کہ صرف میرا نام اور شہر بلکہ آپ کے بقول پاکستان لکھا اور مطمئن ہو گئے کہ خط مل گیا ہوگا۔ اُس وقت بھی مرزا صاحب قبلہ کو غیر متناسب خوش فہمی ہی تھی اور اگر آج کے کراچی میں ہوتے تو نہ جانے کیا حشر ہوتا۔ ممنون ہوں مگر۔۔۔۔اپنی دانست میں سچا آدمی ہوں پر چہ ملا ضرور مگر اُوپر نیچے رہتے ہیں اُن میں سے ایک سنا ہے ڈاک گھر آتے ہی لے گیا۔ (ماں نے اجازت دے دی) کل میں اسلام آباد اور لاہور جا تا ہوں ۱۶ نومبر تک واپس آؤں گا۔ انشااللہ پھر پڑھوں گا۔ آپ سے اِس بار نہ سہی (کہ میں تیز سفری کا شکار ہوں گا) کبھی تو ملاقات ہوگی ’مے باقی۔۔۔مہتاب باقی‘۔“

محمد طارق غازی (ٹورانٹو) کینڈا

شاہ ولی اللہ کی عمرانیات

شاہ ولی اللہ دہلوی دنیا کے دوسرے ہرمس عمرانیات ہیں۔ اول ہرمس عمرانیات ابن خلدون کے فلسفہء تاریخ نے یورپی نشأۃ الثانیہ میں کلیدی کردار ادا کیا اور یورپ کی راہ سے ساری دنیا کو متاثر کیا، لیکن شاہ ولی اللہ کے علوم کو وہ توجہ حاصل نہ ہوئی جو عالمی نشأۃ الثانیہ کا سبب بن سکتی تھی اور بن سکتی ہے۔ اسلامی علمی میدان میں البتہ گزشتہ سات صدیوں کے عرصہ میں تین عبقری مفکروں نے اس موضوع پر انقلاب آفریں کام کیا ہے، اگر چہ کچھ ہماری بے نیازی کے سبب سے انقلاب نہیں آیا۔

تین اسلامی ماہرین عمرانیات معاشرہ کو روح کے تابع ایک جسدی قوت قرار دیتے ہیں۔ ابن خلدون (۱۳۳۲۔۱۴۰۶ء)، شاہ ولی اللہ (۱۷۰۳۔۱۷۶۲ء) اور حامد الانصاری غازی (۱۹۰۶۔۱۹۹۲ء) سات صدیوں کی اسلامی عمرانی روایت کے علم بردار ہیں۔ عہد مابعد کے باوجود ان کے افکار میں تسلسل کی کیفیت پائی جاتی ہے۔ تینوں کے نظریات میں روح کو جسد پر تاثیری فوقیت حاصل ہے۔ ان تینوں مفکرین کے نزدیک فرد اور معاشرہ دونوں کی ہیئت حاکمہ روح ہے اور ان احکام کے نفاذ میں جسد مکمل طور پر روح کا پابند ہے۔ ان اسلامی مفکرین کے برعکس، بالخصوص شاہ ولی اللہ کے بعد آنے والے مغربی مفکرین کے نظریات فقط جسد کی غلامی پر مبنی ہیں کیونکہ ان دانشوروں کو یا تو روح کا کوئی عملی تجربہ ہی نہیں ہے یا وہ اس کے قطعی منکر ہیں۔ درحقیقت ان سب کے افکار چارلس ڈارون (۱۸۰۹۔۱۸۸۲) کے فلسفہ ارتقائیات کے برگ و بار ہیں۔ کارل مارکس (۱۸۱۸۔۱۸۸۳ء)، آرنلڈ ٹائن بی (۱۸۸۹۔۱۹۷۵ء)، ول ڈیوراں (۱۸۸۵۔۱۹۸۱ء) وغیرہ نے علم تاریخ کی جو جدید مغربی تعریفیں طے کی ہیں ان کے مقابلہ میں امام شاہ ولی اللہ دہلوی (حجۃ اللہ البالغہ، شرح مولانا عبیداللہ سندھی ۲۳۵) چند لفظوں میں اسے بیان کر دیتے ہیں کہ کسی فلسفہ یا مسلک فکر کے صحیح ہونے کا ثبوت اس کے سوا کچھ نہیں ہو سکتا کہ اس

کے ذریعہ جو نظری نتائج نکالے جائیں وہ خارج میں انسانی زندگی میں نظر آجائیں۔ حکیم الاسلام مولانا قاری محمد طیبؒ (جواہر حکمت ۳۹) نے اسی نکتہ کو قدرے مختلف انداز میں بیان کیا کہ "عملی زندگی محض اصول سے نہیں بنی بلکہ جزئیاتِ عمل ہی سے بنتی ہے"۔ یہی اسلامی عمرانیات کی روح ہے۔ اس اصول سے انسانی ماضی کا مطالعہ کسی عہد کے معاشرتی محرکات کو ایک مختلف پس منظر میں بیان کرتا ہے اور کسی زمانہ یا قوم کے بارے میں درست نتائج مرتب کرتا ہے۔ نظریہ تاریخ کی اساس بھی یہی ہے۔ تاریخ ہنگامی حالات کی سطحی صحافتی وقائع نگاری سے کہیں زیادہ سنجیدہ فکری عمل اور نتیجہ آفریں تحریری عمل ہے۔

خلدونی نظریہ کی قرآنی اساس

علم عمرانیات کے مؤسس علامہ ابن خلدون گروہی اصطلاحات میں بات نہیں کرتے۔ ان کا فلسفۂ عمرانیات ثبوت مہیا کرتا ہے کہ لفظ انسان لغوی، مرادی، معاشرتی، معاشی، سیاسی، تہذیبی اور عمرانی ہر معنی میں تنہائی کی نکیر کرتا ہے اور ہم جنسوں میں ارتباط اور موانست اور مساہمت کی تصدیق کرتا ہے جس سے معاشرہ مرتب ہوتا ہے۔ اسی لئے وہ معاشرہ کو ایک عمرانی اکائی کی حیثیت سے دیکھتے ہیں اور اس میں عملاً مؤثر جماعت کی اقدامی قوت کو عصبیت کا نام دیتے ہیں۔ یہ قوت عمرانی اکائی کی اجتماعیت کو روبہ عمل لاتی ہے۔ اساسی طور پر انسان کی تنہائی کی نکیر کا یہ اعلان قرآن حکیم میں کیا گیا ہے۔ حضرت آدم علیہ السلام کی تخلیق ایک فرد کی تخلیق تھی جن کے وجود میں اجتماعیت کی روح رکھ دی گئی تھی۔ یہ روح فرد سے معاشرہ بننے کو بے تاب تھی۔ چنانچہ معاشرت کے آغاز کے طور پر ایک ہم جنس مہیا کر دی گئی اور ہدایت کی گئی کہ: یٰاٰدَمُ اسۡكُنۡ اَنۡتَ وَ زَوۡجُكَ الۡجَـنَّةَ (البقرہ ۲:۳۵) = اے آدم تم اور تمہاری زوجہ سکونت کرو رسکون پاؤ جنت میں۔ جنت جیسی جگہ پر بھی تنہائی آدم کے لئے وحشت اور بے کیفی کا سبب ہوتی، بلکہ اس پُر فضا مقام پر ... بھی سوہانِ روح تھی۔ اس لئے موانست کی خاطر انہی کے بدن سے ایک ساتھی کی تخلیق کی گئی۔ مولانا خالد سیف اللہ رحمانی (راہ عمل ۱:۱۲ ارزمزم پبلشرز کراچی ۲۰۰۹ء) لکھتے ہیں کہ "انسان انس

سے ماخوذ ہے اس لئے وہ کسی انیس کے بغیر ہمیشہ بے سکون ہی رہتا ہے۔ چنانچہ اللہ نے آدم علیہ السلام کو ایک اِنسی بھی عطا فرمایا اور آپ ہی سے آپ کے جوڑے حضرت حوا علیہ السلام کی تخلیق فرمائی"۔ جب ہم جنس مہیا ہوئی تو روح و جسد میں کشمکش پیدا ہوئی۔ روح فطری طور پر خلد کی ابدیت کو مرغوب رکھتی تھی اور جسد اپنے جبلی اظہار کے لئے ارض کی طرف جھکاؤ رکھتا تھا۔

ہم جنس کی اس تخلیق میں مزاجوں کی فطری مناسبت کا لحاظ رکھا گیا تھا، یعنی انسان کی مونس و ہمساز کوئی مختلف اور مستقل شخصیت نہیں بلکہ وجود آدم ہی کا ایک جزو ہے۔ یہ ایک اہم قرآنی نکتہ ہے کہ آدم کا وجود تو مستقل اور آزاد بنایا گیا ہے، جبکہ ہم جنس کا وجود مستقل اور آزاد اور اپنی ذات میں مکمل نہیں ہے بلکہ اصلی جسد کا ایک حصہ ہے جو اصل وجود سے متعلق ہو کر ہی مکمل ہوتا ہے۔ اگر وہ بجائے خود مستقل وجود ہوتی تو ہم جنس نہ کہلاتی۔ ایک لطیفہ کے طور پر یہ بھی دلیل ہو سکتی ہے کہ میراث میں مرد کا حصہ زیادہ کیوں رکھا گیا ہے۔ اس پہلے انسانی جوڑے کی موانست ہی سے نسل انسانی بڑھی، اور اسی نسل میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کو جب آتش نمرود میں ڈالا گیا تھا تو ان کی تنہائی دور کرنے کے لئے بھی ایک روحانی ہم جنس یعنی ملک الظل (سایہ کے فرشتہ) کو اللہ تعالیٰ نے آتش خانہ میں ان کی موانست کے لئے بھیجا تھا (امام رازی، مفاتیح الغیب ۲۲:۱۶۳) قرآن حکیم میں ایک اور مقام پر ابنائے آدم کو باہم انسیت رکھنے والا اور بات چیت کا خوگر بتایا گیا ہے: مُسْتَئْنِسِينَ لِحَدِيثٍ (الاحزاب ۳۳:۵۳) باتوں میں جی لگا کر بیٹھنے والے؛ وہ لوگ جو باہم انسیت رکھتے ہیں بات چیت کے واسطے سے (معجم الفاظ القرآن الکریم رمصر ۹۵) استأنس کا مطلب وحشت دور ہونا آتا ہے، اُنس کے مشتقات میں اُنس، اُنسیت، مونس، انیس، مانوس، انسانیت، یونس، ایناس وغیرہ آتے ہیں۔

مذکرہ بالا آیت میں سکونت کی بات بھی کی گئی ہے جو تہذیب کا نقطۂ اول ہے۔ یہ بھی ایک کثیر المفاہیم لفظ ہے۔ اس سے قرار و قیام بھی مراد ہے جیسا کہ خود اس آیت میں آدم کو اپنی زوجہ کے ساتھ جنت میں سکونت کی اجازت دی گئی تھی۔ شاہ ولی اللہ دہلوی (حجۃ اللہ

البالغہ رشرح مولانا عبید اللہ سندھی ۲۶۱) کہتے ہیں مسکن وہ ہے جہاں انسان کی ضروریات زندگی آرام دہ طریقہ سے پوری ہوں اس کے علاوہ اسکن سے اطمینان اور طمانیت بھی مراد ہے۔ حدیث نبویؑ میں سکینت کو حکمت و دانائی بھی کہا گیا ہے۔ گویا انسان میں حکمت و دانائی، اطمینان اور طمانیت کا تعلق سکون، سکونت اور سکینت سے ہے جو موانست کا سبب بھی ہے اور نتیجہ بھی۔ سکونت سے تسکین حاصل ہوتی ہے اور سکون قلب سے سکینت کا در کھلتا ہے۔ احادیث میں سکینت کے لئے رحمت اور نور کے الفاظ بھی وارد ہوئے ہیں۔ مستدرک میں امام حاکم نیشاپوری نے روایت نقل کی ہے کہ صحابہ کی ایک جماعت ذکر الٰہی میں مشغول تھی۔ پاس سے گزرتے ہوئے رسول اللہؐ بالقصد اس جماعت کے قریب تشریف لائے تو وہ لوگ تعظیماً خاموش ہو گئے۔ رسول اللہؐ نے فرمایا کہ میں نے اس جماعت پر رحمت نازل ہوتے دیکھی تو پسند کیا کہ خود بھی اس رحمت میں شریک ہو جاؤں۔ تاریخ بخاری، بیہقی اور ابو نعیم کی روایت حضرت انس ابن مالکؓ سے ہے کہ مسجد نبوی میں ایک جماعت دعا میں مشغول تھی تو رسول اللہؐ نے ان کے ہاتھوں میں نور دیکھا۔ ابن عساکر حضرت سعد ابن مسعودؓ سے ایک حدیث مرسل روایت کرتے ہیں کہ ایک مجلس میں رسول اللہؐ نے نظر مبارک آسمان کی طرف اٹھائی پھر بتدریج نظریں نیچی کر لیں، پھر نظر اٹھائی کسی نے سبب دریافت کیا تو فرمایا میرے سامنے یہ لوگ جو اللہ کے ذکر میں مشغول تھے اور ان پر سکینہ نازل ہوا جو گنبد کی مانند تھا اور فرشتے اسے اٹھائے ہوئے تھے پھر جب وہ قریب پہنچے تھے کسی نے کوئی لغو بات کہی تو اس سکینہ کو اٹھا لیا گیا (تینوں راوایات: امام جلال الدین سیوطی، الخصائص الکبری ۲: ۱۷۸)

ان احادیث سے ثابت ہوتا ہے کہ مادی زندگی جب روحانی نظام سے ہم آہنگ ہوتی ہے تو سکینت اپنے مختلف مظاہر میں نازل ہوتی ہے جسے بعض بزرگ شخصیات دیکھ لیتی ہیں اور عام انسان اس سے بے خبر مگر فیضیاب ہوتے ہیں اور جب اس کیفیت میں ایک سے زائد ہم خیال، ہم مشرب، ہم مزاج، ہم مقصد افراد یکجا ہو کر ایک جمعیۃ بن جائیں تو وہ مجتمع تہذیب بنانے کا فطری عمل شروع کر دیتا ہے۔ اسلامی اصطلاح میں اس عمرانی اور معاشرتی اور سیاسی اجتماعیت کو امت

اور اس کے تہذیبی اظہار کو ملت کہا گیا ہے جس پر تفصیلی گفتگو اس (زیر قلم) کتاب کے مقدمہ کے باب ۲ میں آچکی ہے۔ مقصد مثبت ہوگا تو تہذیب مفید رخ اختیار کرے گی اور مقصد منفی ہوگا تو تہذیب معاشرتی مضرتیں ظاہر کرے گی۔

عصبیت اور اجتماعیت کا ربط

یہی انسانی فطری کیفیت خلدونی نظریہ عصبیت کی بنیاد ہے جو معاشرتی مقناطیسیت کا دوسرا نام ہے۔ عصبیت انسان کی اجتماعی کیفیت کا اظہار ہے۔ یعنی جماعت ہی میں عصبیت ظاہر ہوگی۔ جماعت اور اردو کے مفہوم میں ہجوم، یا گروہ یا انبوہ دو مختلف سماجی کیفیات ہیں۔ جماعت کے لئے ہم خیال، ہم فکر، ہم مزاج، ہم مقصد ہونا لازم ہے۔ اسی کا نتیجہ اتحاد اور عمل کی یگانگت ہوتا ہے۔ گروہ یا ہجوم میں یہ سب نہیں پایا جاتا۔ بازار یا کسی ملک کی پارلیمان میں سیکڑوں لوگ ہوتے ہیں مگر ان پر جماعت کا اطلاق نہیں ہوتا۔ جبکہ جماعت صرف دو ہم خیال اور ہم منزل افراد کے یکجا ہونے سے بن جاتی ہے، یہاں تک کہ فرد کے مقابلہ میں عبادت کا ثواب بھی ۲۷ گنا زیادہ ہو جاتا ہے۔ گروہ میں ہزاروں افراد بھی ہوں تو ان کی منزلیں اور راستے اور مقاصد جدا ہوتے ہیں اس لئے وہ جماعت کی تعریف میں نہیں آتے اور تہذیب سازی تو کیا معاشرہ سازی سے بھی ان کا کوئی عملی ارادی تعلق نہیں ہوتا۔ وہ مختلف مقاصد کے لئے اتفاقاً کسی ایک جگہ پہنچ جانے والا اور جلد ہی بکھر جانے والا محض ایک گروہ یا ہجوم یا انبوہ ہیں، جبکہ مدرسہ جانے والے دو بچے بھی ہم جماعت کہلاتے ہیں اور دو افراد ہوں تو نماز کی جماعت کا ثواب حاصل کر لیتے ہیں کیونکہ ان کا ایک ہی مقصد ہوتا ہے، ایک ہی خیال اور ایک ہی راستہ ہوتا ہے اور ایک ہی منزل ہوتی ہے۔

مسلم اتحاد کے پر جوش وکیلوں کو یہ نکتہ معلوم نہیں کہ اتحاد بجائے خود کوئی شے نہیں ہے بلکہ مقصد اور سمت و منزل کی یکسانیت کا نتیجہ ہوتا ہے۔ مقصد، سمت، راہ و منزل کے فقدان یا سنگین انبوہی تضادات ہی کی وجہ سے بین الاقوامی اسلامی تنظیموں میں سیاسی، اقتصادی اور تہذیبی اتحاد کا فقدان ہے اور ان کی پہچان افتراق و انتشار سے ہے کیونکہ وہ تنظیمیں جماعت کے بجائے گروہ اور

ہجوم ہیں۔ یہی حال ان تنظیموں میں بٹی ہوئی قوموں کا بھی ہے۔

چنانچہ خلدونی عصبیت یا ولی اللہی معاشرتی ارتفاق اور ہم آہنگی اور پیوستگی جماعت ہی سے پیدا ہوتی ہے گروہ سے نہیں۔ مولانا غازی کی شرح میں یہ جماعت ہی امامت کبریٰ کی شرط ہے اسی کو کہا گیا کہ اِنَّهُم اُناسٌ یَتَطَهَّرُونَ (الاعراف ۷:۸۲) یہ انسان بڑے پاکباز ہیں۔ اس آیت میں باہم انسیت رکھنے والے۔ اُناس۔ ایک ہی خیال، ایک ہی مزاج اور ایک ہی مقصد کے افراد کی ایک جماعت کی نشان دہی کی گئی ہے کہ انسانوں کی یہ جماعت پاکیزگی اور طہارت پر متفق ہی نہیں بلکہ اس مقصد سے انسیت رکھتی ہے یہی انسیت اس جماعت کی عصبیت یعنی باہم پیوستگی اور ہم آہنگی کی دلیل ہے۔ ابن خلدون اسی قرآنی عمرانیات سے اجتماعی زندگی اور معاشرتی مقناطیسیت کے اُصول مستنبط کرتے ہیں۔

ولی اللہی اجتماعیت

اس موضوع پر امام شاہ ولی اللہ دہلوی (حجۃ اللہ البالغہ، شرح مولانا عبید اللہ سندھی ۴۷) بعثت محمدیؐ کا سبب بتاتے ہوئے کہتے ہیں کہ زمین کے تمام انسانوں کی اجتماعی حالت اللہ کی نظر میں ناپسندیدہ تھی اس لئے رسول اللہؐ کو الہام کیا گیا کہ لوگوں کو سیدھے راستہ پر لانے کے لئے اول بُرے انجام سے ڈرائیں اور پھر جہاد کریں تاکہ ''اس اجتماع (معاشرہ) میں سے ایک جماعت، جسے اللہ پسند کرتا ہے، تاریکیوں میں سے نکل کر نور کی طرف آجائے'' شاہ ولی اللہ دوسری بات یہ کہتے ہیں کہ انسان میں خیر و شر کی قوتیں رکھ دی گئی ہیں جن کے ٹکراؤ اور تصادم سے کئی نئی چیزیں پیدا ہو جاتی ہیں اور شر سے خیر نکل آتا ہے۔ چنانچہ جب اللہ کسی قوم کو خیر کی تہذیب کے مقام پر اٹھانا چاہتا ہے تو اس قوم کے ان لوگوں کو جن کے دل صاف ہوں بعض تعلیمات الہام کرتا ہے جن پر عمل کرنے والی ایک جماعت تیار ہو جاتی ہے جو انقلاب لے آتی ہے۔ اسلامی اصطلاح میں اسے تدبیر کہا گیا ہے اور یہ اصول بھی قرآن حکیم سے ماخوذ ہے۔

اس مقام پر انقلاب سے پہلے بحران کا اصول سمجھ میں آتا ہے۔ معاشرہ جب کسی خاص

حالت پر جم جائے تو اس سے ہٹنے کو تیار نہیں ہوتا جس کی وجہ سے تبدیلی کے آغاز میں، بحران کا شکار ہوتا ہے۔ بحران کے اس دَل بادل میں انقلاب کی باران رحمت پوشیدہ ہوتی ہے۔ جو معاشرے بحران سے خوفزدہ ہوتے ہیں ان میں کوئی انقلاب نہیں آتا لیکن بحران پر قائدو ہادی کی گرفت ہونی ضروری ہے ورنہ انقلاب خود بحران کا شکار ہو جائے گا۔ لہذا ہر بحران کی رگوں میں انقلاب نہیں دوڑتا۔

ولی اللٰہی نظریہ ٹائن بی کی اختراعی اقلیت سے مختلف ہے۔ ٹائن بی کا خیال ہے تہذیب کے دورِ آغاز میں ایک اختراعی اقلیت پیدا ہوتی ہے جو ایجادات سے تہذیب کا معیار اور مزاج طے کرتی ہے۔ ٹائن بی کی اقلیت مزاجاً مثبت بھی ہو سکتی ہے اور منفی بھی لہذا اس کے عمل سے ویسے ہی نتائج نکلیں گے جیسا اس اقلیت کا مزاج ہوگا۔ اس کے مقابلہ میں ولی اللٰہی نظریہ کی جماعت کی خصوصیات یہ ہیں کہ اس کے دل صاف ہوتے ہیں۔ اسے بعض تعلیمات الہام کی جاتی ہیں اور وہ جماعت انقلاب آفریں ہوتی ہے، محض تہذیب ساز نہیں۔

یہ اصول اسلامی تاریخ کے ایک بہت اہم زمانہ میں سیاسی نظریہ کے طور پر یوں روبہ کار آیا کہ ۱۳۰۰ سال کی اسلامی تاریخ میں سے ۶۰۰ برس تک نہایت محکم تہذیب کی بنیاد بنارہا۔ سلطنت عثمانیہ ترکیہ کا بانی عثمان خان اول خود کوئی عالم دین تھا نہ سیاسی فلسفی، لیکن اَخی (برادر) سلسلۂ طریقت و معیشت کے شیخ اَدہ بالی کے مرید کی حیثیت سے اس کی روح پر بلاشبہ ربانی دریچہ تو رکھلا ہوا تھا۔ بستر مرگ پر دو بڑے اساطین سلطنت ترغوت الپ اور سلتوک الپ اور دو علماء اخی شمس الدین اور اخی حسن کی موجودگی میں اپنے دو بیٹوں علاء الدین خاں اور اُرخان کو مستقبل کے بارے وصیت کرتے ہوئے اس نے ہدایت کی تھی کہ ہمہ قسم کے دنیاوی علوم دینی تعلیمات کے تابع رہیں تاکہ رشد و ہدایت کا سلسلہ موقوف نہ ہو اور معاشرہ عدل و انصاف کی راہ پر بڑھتا رہے۔ اس نے وصیت کی تھی کہ علماء کی تعداد میں اضافہ کیا جاتا رہے۔ علماء کی تعداد بڑھے گی تو ان کی علمی کوششوں سے علم کی توسیع ہوگی جو سلطنت کو قابل، مفید اور اچھی استعداد کے لوگوں کی فراہمی کا باعث

ہوگی (محمد طارق غازی، سلطنت عثمانیہ باب ۵: سیاسی تصور، سہ ماہی الاقرباء، اسلام آباد)۔

ولی اللّٰہی نظریہ اور خلدونی نظریہ دراصل ایک ہی عمرانی حقیقت کی دو شرحیں ہیں۔ بابائے تاریخ اور بانیٔ عمرانیات کا تصورِ عمرانیات یہ ہے کہ ہر انسان انفرادی طور پر یہ احساس و ادراک رکھتا ہے کہ اس کے افعال معاشرہ میں تمام دوسرے انسانوں کے افعال سے متأثر بھی ہوتے ہیں، ان پر مؤثر بھی ہوتے ہیں اور انفرادی زندگی میں عمل و کردار کی حدود متعین کرتے ہیں۔ چنانچہ فرد کی آزادیٔ عمل رضا کارانہ طور پر مشارکت اور باہمی ربط و نظم سے متعین ہوتی ہے۔ اسی احساس کے نتیجہ میں اجتماعی ذہن، اخلاقی قوت، معاشرتی اقدار، سیاسی نظام اور اقتصادی مزاج بنتا ہے اور ملت تشکیل پاتی ہے۔ انہی خوبیوں کا معاشرتی اظہار کسی قوم میں عصبیت ایک مثبت عمرانی عمل ہے، مرورِ زمانہ سے بدہیئت ہو جانے والا ہنگامی اور فانی جسدی تجربہ نہیں ہے۔ اس امر پر غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ روح اگر مضمحل و کمزور ہوگی تو لازماً فرد اور مجتمع دونوں کی جسدی قوت بھی توانائی کھو دے گی اور اس کے نتیجہ میں عصبیت اور اجتماعیت بھی غیر مؤثر ہو جائے گی۔ اس اصول پر کسی بھی زندہ یا مردہ معاشرہ کا تجزیہ کر کے نتائج برآمد کیے جا سکتے ہیں۔

معاشرہ اور تہذیب کا فرق

اس نظریہ کی خلدونی بنیاد اسی حقیقت پر رکھی گئی ہے جو روحانی اور مادی علوم کے متناسب امتزاج سے مرتب ہوتی ہے، اسی طرح جیسے ہائیڈروجن اور آکسیجن ہواؤں کے ایٹموں کے متناسب امتزاج ہی سے پانی کا سالمہ بنے گا، یہ عمل غیر متناسب ہوگا تو مقصود حاصل نہیں ہوگا۔ انسان کے تہذیبی عمل کی ایجابیت اور سلبیت کی وضاحت قرآن حکیم کی ایک بہت مختصر سورہ میں کی گئی ہے: وَالْعَصْرِ۔ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَفِیْ خُسْرٍ۔ اِلَّا الَّذِیْنَ آمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَتَوَاصَوْا بِالْحَقِّ وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ۔ (العصر ۱۰۳:۱۔۳) قسم ہے وقت/زمانہ کی۔ بے شک انسان بڑے گھاٹے میں ہے، سوائے ان کے جو ایمان لائے، جنہوں نے بھلے کام کیے، اور باہم حق کی تفہیم کی اور (تقدیرِ الٰہی) پر رضامندی کا اظہار کیا۔ یہاں ایجابیت سے روگردانی کو سلبیت اور گھاٹے کا

معاملہ بتایا گیا ہے اور صاف صاف کہا جا رہا ہے کہ روحانی نگرانی کے بغیر انسان خسارہ میں رہتا ہے۔
اس کی شرح میں شیخ عبدالحق حقانی دہلوی (۱۲۶۷ـ۱۳۳۵ھ) (فتح المنان رتفسیر حقانی ۸: ۲۱۶) لکھتے ہیں کہ ایمان کا مطلب ایک طرف ''معرفت اور حقائق الاشیاء کے علم صحیح اور اس کے وسائل'' کے ذریعہ نیک کام کرنا ہے کہ وہ شکوک وخطرات یا توہمات وتخیلات سے اس درجہ پاک ہوں کہ ان میں عقلی قیاسات اور وہمی تنگ بندیوں کو دخل نہ ہو: اور دوسرے اس راستہ سے بھلے کاموں کی سنت بعد کی نسلوں میں باقی رہتی ہے اور صدقۂ جاریہ بن جاتی ہے۔ ہر روز نت نئی اختراعات اور ''ایجادات'' ہنگامی افادہ کی دلیل بھی نہیں ہوتیں چہ جائیکہ طویل مدت تک صدقۂ جاریہ کی ضمانت دیں۔ یعنی حقائق الاشیاء کے یقینی علم سے جس معاشرہ اور تہذیب کی تشکیل ہوگی ان کے اثرات کئی نسلوں تک انسانوں کو فائدہ پہنچاتے رہیں گے۔ شیخ عبدالحق حقانی کے مطابق حق کا مطلب دین حق پر قائم رہنے کے علاوہ راست بازی، نفع خلائق، اخلاق کریمانہ، معاشرتی انتظامات، عمدہ تصانیف اور تعلیم و تدریس سب کو شامل ہے، اور صبر نہ صرف دشمنوں کی ایذا رسانی اور بدگوئی کو برداشت کرنا ہے بلکہ دشوار حالات میں عالی حوصلگی کا مظاہرہ کرنے کو بھی صبر کہتے ہیں۔ اس کے علاوہ بھلے کام کرنا بجائے خود صبر کی ایک مثال ہے۔ مولانا حقانی نے سورہ العصر کو ماسبق سورہ التکاثر سے مربوط بتایا ہے جو اپنے سے پہلے کی سورۃ القارعہ سے تسلسل رکھتی ہے، اور یہ کہ التکاثر میں مال کی حرص، اس پر فخر وغرور اور باطل تمناؤں کے خلاف تنبیہ کی گئی ہے کیونکہ عمرانی زاویہ سے یہی تہذیبوں کے زوال بلکہ خاتمہ کا وقت ہوتا ہے۔ چنانچہ تہذیبوں میں عروج وزوال نشیب وفراز کے تواتر کے معنی میں آتا ہے، قوموں اور نسلوں کے مابین ارتقاء کی زنجیرِ مسلسل کی شکل میں نہیں۔

یہ ایک باریک نکتہ ہے جس کے غلط فہم کی وجہ سے زندگی کے تسلسل کو تہذیبوں کا تسلسل باور کرلیا جاتا ہے جیسا کہ پاکستانی عمرانیاتی ڈاکٹر بشارت علی نے خلدونی تصور تہذیب پر تبصرہ میں لکھا ہے کہ معاشرہ اپنی زمانی ومکانی علتوں اور ارتباط میں ایک تسلسلِ کل ہے، اس میں حال ماضی اور مستقبل کے رشتے باہم مربوط ومتواصل ہیں جس سے زندگی کے تسلسل اور کلیت کا پتا چلتا ہے یہ

شرح غلط نہیں لیکن اس شرح سے معاشرہ کو تہذیب سمجھنے کی غلطی ممکن ہے۔ ان دونوں میں فرق ہے۔ معاشرہ انسانی گروہوں کی زندگی کا ماحصل ہے اور مسلسل ہے۔ تہذیب ایک معاشرہ کا علمی اور اختراعی ظہور ہے، خود معاشرہ نہیں ہے۔ قوم نوح کا ایک معاشرہ تھا اور ایک تہذیب تھی۔ چونکہ دونوں ایک ساتھ سامنے آتے ہیں اس لئے ظاہر بیں مؤرخ بھی انہیں ایک ہی حقیقت باور کر سکتا ہے۔ حقیقت یہ نہیں تھی۔ طوفان نوح میں قوم نوح فنا ہوگئی تھی اور اس کے ساتھ اس قوم کی تہذیب بھی اپنے تمام تر لوازمات و ترقیات کے ساتھ معدوم ہوگئی تھی، مگر طوفان کے دوران سفینہ میں اور طوفان کے سمٹنے کے بعد زمین پر حضرت نوحؑ اور ان کے ۷۹ رفقاء کی صورت میں انسانی معاشرہ باقی رہا تھا۔ اس باقی ماندہ گروہ نے ایک نیا شہر بھی آباد کیا جو تفاسیر میں قریۃ الثمانین۔ اَسّی (انسانوں) کی بستی۔ کے نام سے معروف ہے۔ وہ قصبہ اور اس کا چھوٹا سا معاشرہ جدید نوحی تہذیب کا نقطہ آغاز تھا۔ اس کی دوسری مثال یہ ہے کہ اسلام سے پہلے حجاز مقدس میں قریش کا ایک معاشرہ بھی تھا اور کسی نہ کسی درجہ میں مکہ کی تہذیب بھی تھی، لیکن ٹھیک اسی وقت نجد میں بنی غطفان کی خیمہ گاہیں ایک معاشرہ کا ثبوت تو دیتی تھیں مگر ان کی بدویت کسی تہذیب کا عنوان نہ تھی افریقہ کے جنگلوں میں آج بھی ایسے قبائل موجود ہیں جو ایک معاشرہ ہیں مگر تہذیب سے بیگانہ رہتے ہیں۔ یہ کیفیت ان تمام بڑے شہروں میں بھی دیکھی جا سکتی ہے جہاں انسانی گروہ ایک معاشرہ کی شکل میں کام کرتے ہیں مگر تہذیب نا آشنا ہوتے ہیں۔ ان مثالوں سے تہذیب اور تمدن کا فرق بھی واضح ہوتا ہے۔

دو عمرانی حقیقتیں

قرآن حکیم میں ان دونوں عمرانی حقیقتوں کے اشارے ملتے ہیں۔ ایک طرف وہ اقوام اور الناس کو مخاطب کرتا ہے اور دوسری طرف انسانوں کو معبود کی وحدانیت اور احکام شریعت اور اخلاقی ضابطوں پر عمل کی دعوت دیتا ہے۔ اقوام اور الناس معاشرہ کی اصطلاحیں ہیں؛ توحید اور شریعت اور اخلاقیات تہذیب کی ضرورتیں ہیں اور اس کی تعریف طے کرنے میں مدد دیتی ہیں۔ توحید اور

شریعت کا انکار کرنے والے یا دیوتاؤں کی کثرت کو ماننے والے قوم اور الناس کی تعریف پر تو پورے اتریں گے، مگر ضروری نہیں کہ تہذیب کی تعریف میں بھی آئیں۔ بے شمار آیات ان دونوں اجتماعی کیفیات کی وضاحت کرتی ہیں۔ مثلاً دو آیات مورخ کو بیک وقت دونوں باتوں پر توجہ دلاتی ہیں: ☆ اٰمِنُوْا کَمَآ اٰمَنَ النَّاسُ (البقرہ ۲:۱۳) ایمان لاؤ جیسا کہ لوگ (عوام) ایمان لائے۔ هُدًى وَّرَحْمَةً لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ (النحل ۱۶:۶۴) (یہ قرآن/قانون) ہدایت ورحمت ہے ایمان لانے والی قوم کے لئے۔

قرآن حکیم کے علاوہ کسی اور آسمانی کتاب نے اس طرح معاشرے کے نظم وضبط کے قوانین اور عمرانی قوتوں کی وضاحت نہیں کی ہے۔ امور دنیا میں انہی ضوابط اور وضاحتوں کو اصطلاحاً شریعت کہا جاتا ہے اور اسی کا دوسرا نام روحانی علم ہے یہی النفس کی دنیا ہے اس بنیاد پر یہ سمجھنا آسان ہو جاتا ہے کہ قرآن حکیم میں ماضی کی اقوام کے قصص محض تفنن طبع، وقت گزاری اور تفریح، حنان، یادگاری اور ماضی گزینی کے لئے نہیں بیان کر دیئے گئے، بلکہ ان قصص کے بیان میں دو نکات سامنے آتے ہیں: ایک یہ کہ اجتماعی زندگی میں افادیت کا تقاضا ہے کہ انسان اللہ کی وحدانیت پر یقین اور ایمان رکھے کیونکہ اس کے بغیر معاشرہ مادی یا روحانی یا اخلاقی کسی قسم کے قانون کا پابند نہیں رہتا اور نہ بسیط انسانی معاشرہ کے ہمہ گیر مفادات پر اس کی نظر رہتی ہے۔ بسا اوقات وہ خود ایسے قوانین بناتا ہے جو تہذیب کی نفی کرتے ہیں اور فطرت سے مغائرت کی وجہ سے انسان اور معاشرہ اس قانون کی عمل داری کو رد کرنے یا نظر انداز کرنے میں آزاد ہوتا ہے۔ توحیدِ رب پر یقین کی معاشرتی نمود کو شریعت کہا جاتا ہے۔ شریعت کو رد یا نظر انداز کرنے کے بعد انسان خود قانون سازی پر مجبور ہوتا ہے، مگر چونکہ اس کی نگاہِ عقل بیک وقت تمام عواقب و جوانب کو نہیں دیکھ سکتی اس لئے ہر نئی حالت اور کیفیت میں انسان بار بار نت نئی قانون سازی کرتا ہے اور ضابطوں کے طومار میں خود اپنے وجود کے مقصد سے غافل ہو جاتا ہے، معاشرہ میں فساد و شر اور تہذیب میں اختلال اور زوال کا سبب بن جاتا ہے۔ چنانچہ توحید کا عمرانی فائدہ یہ ہے کہ انسان خود

ایک مثبت معاشرتی اکائی بن جاتا ہے اور نتیجہ میں اپنے معاشرے اور اپنے وطن کو اور پھر انسان اور اس دنیا کو اکائی اور اتحاد کی سمت میں لاتا ہے۔ یہ وہی جماعت اور امت اور ملت کا تصور ہے جسے اوپر بیان کیا جا چکا ہے۔

ایک سیدھی سی بات ہے کہ کوئی اللہ کو ایک نہ مانے تو اس کے انکار یا اغماض سے خود اللہ رب جلیل کی ذات، وحدانیت اور ربوبیت وجلالت کو ادنیٰ فرق بھی نہیں پڑتا اور کسی کے مان لینے سے اللہ کی شان کبریائی میں رتی بھر اضافہ نہیں ہو جاتا۔ چنانچہ حق یہ ہے کہ اللہ کی وحدانیت پر ایمان خود انسان کے اپنے مفاد میں ہے اور اس کے انکار سے دنیا اور آخرت دونوں جگہ خود انسان ہی گھاٹے میں رہتا ہے۔ آخرت کا گھاٹا تو بعد کی بات ہے۔ نقصان اسی دنیا میں سامنے آجاتا ہے۔ اسی نقصان اور خسارہ کی نشان دہی کے لئے قرآنی اساس پر تاریخ کا علم مرتب ہوا ہے اور اس کی کوکھ سے عمرانیات کا علم نکلا۔

خلدونی نظریۂ تغیر

دوسرا نکتہ یہ کہ اس دنیا میں نہ انسان کو ہمیشگی کی ضمانت حاصل ہے اور نہ اس کی ایجادات اور اختراعات کو، نہ اس کی معاشرت، سیاست اور اقتصاد کو۔ لہٰذا ایک عارضی کیفیت پر مستقل کیفیت کو نافذ کرنا عقل کی بات نہیں ہے۔ اسی لئے دنیا کا استعمال کرتے ہوئے آخرت سے پہلو تہی کرنا بھی بے عقلی کی بات ہے۔ شریعت انسان کو اس بے عقلی اور سفاہت سے محفوظ رکھتی ہے۔ اس سلسلہ میں ابن خلدون ایک اور اہم نکتہ پیش کرتے ہیں۔

اس صورت حال پر ان کے بیان کو نظریۂ تغیر کے طور پر پیش کیا جا سکتا ہے۔ یہ نظریہ بھی خلدونی عمرانیات کی طرح قرآن حکیم ہی سے مستنبط ہے۔ قرآن حکیم میں ایک حیران کن آیت آتی ہے: اِنَّ اللّٰہَ لَا یُغَیِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتّٰی یُغَیِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِھِمْ (الرعد ۱۳:۱۱) بے شک اللہ کسی قوم کی حالت میں تغیر نہیں کرتا جب تک وہ قوم خود ہی اپنی حالت کو متغیر نہ کرے۔ مولانا اشرف علی تھانوی (بیان القرآن ۵۲۳) نے اس متغیر حالت سے عذاب مراد لیا ہے، یعنی کسی بھی قوم کو برباد کیا

معدوم کرنا اللہ کا منشاء نہیں ہے بلکہ قومیں خود اپنے کرتوتوں سے اپنی تباہی کو دعوت دیتی ہیں اور اپنی حالت کو بہتر سے بد میں اور صلاح سے فساد میں بدل ڈالتی ہیں۔ مگر اس سے پہلے اللہ کی طرف سے ہدایت کی طرف واپسی کا دروازہ کھلا رکھا جاتا ہے یہاں تک کہ ایک دن در توبہ بند ہو جاتا ہے۔ اس شرح کی دلیل اس آیت میں بعد کا فقرہ ہے کہ پھر جب اللہ کسی قوم کے برے انجام کا فیصلہ کر لیتا ہے تو اس کے ہٹنے کی کوئی صورت نہیں ہوتی۔ اس آیت کو جب وَتِلْكَ الْاَيَّامُ نُدَاوِلُهَا بَيْنَ النَّاسِ (آل عمران ۳: ۱۴۰ = یہ زمانہ ہے جسے ہم انسانوں میں لوٹ پلٹ کرتے رہتے ہیں) کے تناظر میں دیکھا جائے تو کسی قوم کا خاتمہ یا تباہی کسی دوسری قوم کی ابتداء اور عروج کی نشانی بن جاتی ہے۔ ابن خلدون نے اس سے انسانی زندگی میں متواتر تغیر و تبدیلی کا نظریہ قائم کیا جس سے تمام مغربی مفکرین کے ذہن اور افکار خالی ہیں کیونکہ وہ سب ڈارونی فلسفہ کی خوشہ چینی کرتے ہوئے خود اپنے تہذیبی تسلسل کا اندھا غیر تاریخی گمان رکھتے ہیں۔

نظریہ تغیر کا ایک اشارہ قرآن حکیم کے موضوعات کے انتخاب میں ملتا ہے۔ شاہ ولی اللہ (الفوز الکبیر ۴۲ تا ۴۸) کا بیان ہے کہ قرآن حکیم نے "اللہ تعالیٰ کی قدرت کی نشانیوں اور نعمتوں میں صرف ان کا ذکر کیا ہے جن کو شہری اور دیہاتی، عربی اور عجمی سب یکساں طور پر سمجھ سکتے ہیں۔۔۔ (اور) ان روحانی نعمتوں کا ذکر نہیں کہ جو علماء اور اولیاء اللہ کے ساتھ مخصوص ہیں (اور)۔۔۔ ان تمدنی وسائل اور عیش و عشرت کے سامانوں کا بھی ذکر نہیں کہ جو بادشاہوں اور امیروں کے ساتھ مخصوص تھے۔" اس صراحت کے بعد وہ بتاتے ہیں کی قرآن حکیم نے پانچ موضوعات کو چنا ہے: (۱) زمین و آسمان کی پیدائش، (۲) دن رات کا باری باری آنا، (۳) ہواؤں کی گردش، (۴) بادلوں سے پانی کا برسنا، (۵) بارش سے طرح طرح کے پھلوں اور اناج وغیرہ کا پیدا ہونا۔ (☆ اضافی تعلیق مضمون کے آخر میں دیکھیے)

اس تفصیل میں نکتہ یہ ہے کہ مادی عناصر اور ان کے مظاہر کی کسی ترتیب سے تہذیب بنالینا اہم نہیں ہے بلکہ ان مظاہر کی حقیقت کو سمجھ کر ان کے خالق تک پہنچنا انسان کا مقصد اور اللہ کی قدرت کا

عرفان حاصل کرنا تہذیب کی اصل ہے۔ اس طرز علم کو شاہ ولی اللہ تذکیر بآلاء اللہ (اللہ کی نشانیوں اور نعمتوں کا ذکر اور یاد گیری) کہتے ہیں اور اس کے ذیل میں تاریخ پر نظر کو علم تذکیر بایام اللہ (اللہ کے دنوں یعنی انسانی ماضی اور تاریخ کا تذکرہ) کہتے ہیں جس سے ان کا نظریہ تہذیب اور نظریہ تاریخ متعین ہوتا ہے۔

ولی اللّٰہی ارتفاقات

شاہ ولی اللہ تہذیب اور تمدن سے وہ سب کچھ مراد نہیں لیتے جو آج کل سمجھا جاتا ہے۔ ان کے نزدیک تہذیب کا دائرہ بہت وسیع اور تہہ دار ہے۔ ان معاشرتی تہوں اور وسعتوں کو وہ ارتفاقات کا نام دیتے ہیں۔ ان کے نزدیک تمام رفاہی اور نفع بخش کام تہذیب یا مدنیت میں شمار ہوتے ہیں، مثلاً زبان و بیان، کاشتکاری اور ذرائع آبپاشی، غذائیں اور کھانوں کی ترکیبیں، ظروف سازی، جانوروں کو سدھانا خواہ معاشی ضرورت کے لئے ہو خواہ فوجی یا تفریحی مقاصد کے لئے، سیاسی نظام اور اس سے فائدہ اور استحکام اور نقصان پہنچانے والی چیزیں، جنگ کے ضوابط، قیام گاہیں، لباس، نکاح اور اولاد کی پرورش، صنعتیں اور حرفتیں، مبادلۂ زر و اشیاء کی صورتیں، فن معاملات، موانست، معاشرتی تعاون اور امداد باہمی، ذرائع معاش کا استحکام، کھانے پینے، اٹھنے بیٹھنے اور گفتگو کے آداب، نظافت و پاکیزگی کے ضامن حفظان صحت کے طریقے، امراض اور وباؤں کی روک تھام اور ادویات کا نظام، آفات ناگہانی کی پیش بینی اور ان سے نپٹنے کے طریقے، خوشی کے مواقع کی دعوتیں اور غم کے موقعوں کے آداب، خانگی نزاعات اور طلاق وغیرہ کے طور طریقے، اہل مصائب اور معذوروں کی نگہداشت، میتوں کی تدفین وغیرہ سب کچھ تہذیب کے دائرہ میں آتا ہے۔ شاہ ولی اللہ ان سب کو آداب معاش کے عنوان سے بیان کرتے ہیں (حجۃ اللہ البالغہ: ۷۴۳ تا ۷۰ ۴)۔ سادہ لفظوں میں عام لوگوں بلکہ خواص کے لئے بھی اس قسم کے امور تہذیب تو کیا تمدن کے ذیل میں بھی نہیں آتے بلکہ یہ سب ایک معاشرہ کی سیاست کا نتیجہ ہوتے ہیں۔ چونکہ ان سے شہری زندگی استوار ہوتی ہے اس لئے بالواسطہ طور پر انہیں تمدن کا عنوان دیا

جاتا ہے۔ جدید اصطلاح میں اس قسم کی بہت سی باتوں کو کلچر کے ذیل میں رکھا جاتا ہے اور کلچر میں بھلی بری ہر قسم کی باتیں شامل ہوتی ہیں جو ضروری نہیں تہذیب کے تقاضے بھی پوری کرتی ہوں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ تہذیب سے مراد فقط شہری زندگی رہ گئی خواہ وہ اچھی ہو یا بری، قانون کی پابند ہو یا قانون شکن، مفاد عامہ کے لئے ہموار ہو یا اس کے خلاف متحرک۔ مگر ایسی صورت میں تہذیب کا منشا پورا نہیں ہوتا۔

شاہ ولی اللہ کے نزدیک انسانی عمرانی تعامل کی چار سطحیں یا چار ارتفاقات ہیں اور اسی تدریج سے تہذیب بنتی ہے۔ ارتفاق کا مصدر ''رفق'' ہے۔ اس لفظ اور اس کے مشتقات کا مطلب مہربانی کا برتاؤ، نرم دلی، رحم کرنا، اعتدال، ساتھ اور دوستی، معیت، ہمکاری، مساہمت، تعاون، ربط باہم، نفع پہنچانا ہے، شریک حال ہونا، خود ارتفق کا مطلب لوگوں کا باہم دوست اور معاون و مددگار ہو جانا، باہمی اعتماد، تعاون اور مدد طلب کرنا اور مدد کرنا آتا ہے (مولانا بلیاوی۔ المنجد اردو ۳۰۴؛ مولانا کیرانوی۔ قاموس الوحید ۶۵۱۔۶۵۲)۔

ارتفاقات کی تعریف بیان کرتے ہوئے شاہ ولی اللہ کہتے ہیں کہ پہلا ارتفاق معمولی درجہ کی دیہی معاشرت ہے۔ دوسرا ارتفاق شہری معاشرت ہے جہاں فی الحقیقت تمدن کا آغاز ہوتا ہے۔ معاشرت کی بلند تر سطح علاقائی یا شہری حکومت ہے جو تیسرا ارتفاق ہے اور یہ چوتھے ارتفاق کی طرف رہنمائی کرتا ہے یعنی معاشرہ ایک مرکزی حکومت قائم کرتا ہے۔ تیسرے ارتفاق میں شاہ ولی اللہ نے حکومت کو ایک زمینی ضرورت کے طور پر پیش کیا کہ اس کا مقصد ایک خطہ کے لوگوں کے درمیان پائے جانے والے ربط و تعلق، یعنی باہمی انسیت، کو محفوظ رکھنے کے طریقوں سے بحث کی جاتی ہے۔ مملکت کو اختلال سے بچانے کے لئے سربراہ ضروری ہے۔ سربراہ کی ذمہ داری لوگوں کو انصاف کی رہ پر قائم رکھنا اور ان کے نزاعات کا فیصلہ کرنا ہوتی ہے۔ (حجۃ اللہ البالغہ ۱: ۲۶۲)۔ سربراہی کے اس اصول کی وضاحت آگے مولانا حامد الانصاری غازی کے نظریۂ امامت کبریٰ میں آتی ہے۔ شاہ ولی اللہ کہتے ہیں کہ اس معاشرتی تنظیم کو ایک اصول کے طور پر صالح امتوں کی عقلوں نے ثابت کیا ہے

اوران کو مسلمہ طریقہ کے طور پر اپنالیا ہے۔ (حجۃ اللہ البالغہ ۱: ۴۲۶۔۴۲۷)۔اس کے بعد وہ کہتے ہیں کہ ملک کی درستی کا دارومدار معاشرتی تعاون پر ہے۔ یہ تعاون اور تعلق جس قدر توانا ہو گا ملک اتنا ہی مستحکم ہوگا۔ البتہ شہریوں میں الفت و محبت پیدا کئے بغیر شہر (یعنی تمدن) کی درستی مکمل نہیں ہو سکتی۔ بارہا یہ الفت ہی ضرورت کی چیزیں ہبہ، عاریت، صدقہ اور خیرات کے وسیلوں سے بلا معاوضہ خرچ کرنے والوں تک پہنچاتی ہے (حجۃ اللہ البالغہ ۱: ۴۶۱)۔ چنانچہ شہریوں میں باہم الفت و محبت تمدن کی بنیادی شرط ہے کہ جن معاشروں میں اس موانست وایلاف کا فقدان ہوگا وہاں شہر تو موجود ہو سکتے ہیں مگر وہ تمدن سے عاری ہوں گے اور نتیجہ میں تہذیب سے تہی ثابت ہوں گے۔

اس تعریف سے ایک اضافی بات یہ ثابت ہوتی ہے کہ شہریوں میں باہمی نفرت معاشرے اور تہذیب دونوں کے لئے مضر ہے۔ اس کا ثبوت تہذیبوں کی تاریخ میں بھی ملتا ہے اور بہت سے عصری معاشروں میں بھی۔

گمراہی اور زوال کے اسباب

شاہ ولی اللہ نے قوموں کے زوال و انحطاط اور گمراہی کے دو بنیادی سبب بتائے ہیں: تشبیہ اور اشراک اس کی وضاحت یہ کرتے ہیں کہ اللہ میں مخلوق کی صفات کو ماننا تشبیہ کہلاتا ہے اور مخلوق میں اللہ کی صفات کا ماننا اشراک یعنی شرک ہے۔ یہ دونوں باتیں عقیدۂ توحید کے مغائر ہیں۔ اس کا سبب وہ یہ بتاتے ہیں کہ عام انسان پر کچھ ایسے اوقات گزرتے ہیں جب وہ مروجہ رسوم کے حجاب میں ڈوب جاتا ہے۔ اس وقت اس کو فقط یہ فکر ہوتا ہے کہ بات چیت، لباس، اخلاق و عادات، رہن سہن میں وہ اپنی قوم کے عقل مندوں (چودھریوں، سرداروں، پوہتوں، کاہنوں، پجاریوں، سرمایہ داروں، صنعت کاروں، سیاست دانوں) کی مشابہت اختیار کرے اور ان باتوں پر کان دھرے جنہیں وہ اپنے آباؤاجداد سے سنتا آیا ہے، اور خود اپنی عقل و فراست سے جرات کی باتوں اور عالم میں تدبیر غیبی پر دھیان نہ دے۔ (حجۃ اللہ البالغہ ۱: ۵۶۷)۔ چنانچہ شرک و تشبیہ متوارث

بیماریاں ہیں اور ایک سے دوسری نسل میں منتقل ہوتی رہتی ہیں۔ یہی وہ مرحلہ ہے جب قوم کے چودھری اور رئیس اور اہل ثروت اور قائدین یا تو اللہ کی صفات خود اپنے اندر دکھانے لگتے ہیں اور خدائی کا دعوی کرتے ہیں یا عام لوگوں پر اپنی بڑائی مسلط کرنے کی غرض سے اللہ کے وجود میں خود اپنی صفات ثابت کرنی شروع کر دیتے ہیں اور بالآخر پوری قوم کو لے ڈوبتے ہیں، جیسا کہ تاریخ انبیاء میں نظیریں ملتی ہیں اور احادیث نبویؐ میں بھی ایسے اشارے پائے جاتے ہیں۔ ضروری نہیں کہ کسی تہذیب کے چودھری نمرود وفرعون کی طرح خدائی کا دعوی اور عوام سے عبودیت کا مطالبہ کریں۔ اس کے بغیر بھی تکبر کی یہ کیفیت ظاہر ہو سکتی ہے۔ کسی بڑے حادثہ پر برہم ہو کر ایک بڑے ملک کے کسی چودھری نے اپنے مفروضہ دشمنوں کو انتقام کی دھمکی دیتے ہوئے کہا تھا ''جو ہم چاہتے ہیں ہوتا وہی ہے'' (What we say, goes)۔ بس اسی کا نام خدائی کا دعوی اور اللہ کی صفات خود اپنے اندر دکھانا ہے۔ اس کو اشراک کہا جاتا ہے۔

اس اخلاقی اور روحانی اصول کی وضاحت کے بعد شاہ ولی اللہ نے زوال وانحطاط کے مادی اسباب کو بھی نظر انداز نہیں کیا۔ خرابی کا ایک بڑا سبب انہوں نے سرکاری خزانہ پر غیر ضروری بھاری مصارف کو بتایا ہے۔ اس کی ایک مثال وہ جنگیں ہیں جن کے دوران بہت سے لوگ قومی خزانہ (بیت المال) ہی کو ذریعہ معاش بنا لیتے ہیں۔ موجودہ زمانہ میں لاکھوں پر مشتمل بھاری فوجی نفری رکھنے کے علاوہ ملکی خزانوں پر ایک بڑا بوجھ جنگی صنعت کاروں کی ہوس کا ہے جو آئے دن نت نئے ہتھیار بنا کر بے ضرورت بھی حکومتوں کو بیچتے رہتے ہیں، یعنی یہ لوگ قومی خزانہ کو غیر ضروری طور پر زیر بار کر کے ملک اور قوم کو زوال کے راستہ پر ڈال دیتے ہیں۔ شاہ ولی اللہ کے نزدیک خزانہ پر دوسرا بوجھ وہ لوگ ہوتے ہیں جو محض پیٹ پالنے کے لئے حاکم سے بھیک مانگنے کے عادی ہو جاتے ہیں حالانکہ وہ ریاست کی کوئی ضرورت پوری نہیں کرتے۔ عہد ماضی کے قصیدہ گو شاعر اور دین فروش عالم اس زمرہ میں آتے تھے۔ موجودہ زمانہ کی جمہوریتوں میں پارلیمان اور اسمبلیوں

کے ممبر، پیشہ ور سیاست داں، میونپلٹیوں کے کونسلر وغیرہ اس طفیلی اور مفت خورے گروہ کی بقا کا سبب ہیں جن کو عوامی خزانہ سے کروڑوں روپے اور ڈالر اور پاؤنڈ اور یورو ادا کیے جاتے ہیں حالانکہ وہ اپنی تنخواہوں اور دیگر خرانی مراعات کے مساوی کام نہیں کرتے اور نہ معاشرہ کے لئے اس درجہ سود مند ہوتے ہیں جیسا کہ باور کیا جاتا ہے۔ یہ گروہ آئے دن اپنی تنخواہوں اور مراعات میں اضافے کر کے قومی معیشت کو کھوکھلا کرتے رہتے ہیں۔ ایسے گروہ اپنی قوموں کے زوال کا سبب بن جاتے ہیں۔

شاہ ولی اللہ کے نزدیک قوموں کے انحطاط و زوال کا تیسرا سبب کاشتکاروں، تاجروں اور پیشہ وروں پر بھاری ٹیکس لگانا ہے جس سے حکومت کے خیر خواہوں کی تعداد گھٹ جاتی ہے اور رفتہ رفتہ ختم ہو جاتی ہے، دولت اندوزی کی وجہ سے صنعتوں کی بہتری کا نظام ڈھیلا پڑ جاتا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ سخت جنگجو لوگ قوت پکڑ لیتے ہیں اور بغاوتیں پھوٹ پڑتی ہیں۔ لہٰذا ملک کو ویرانی سے بچانے کا طریقہ (جباية اليسيره و اقامة الحفظه الضروره) ہلکے ٹیکس اور صرف بقدر ضرورت سرکاری عملہ ہے (حجۃ اللہ البالغہ ۱: ۶۹ ۴ ـ ۴۷۰)۔

عہد رواں میں قدامت پسند سیاسی جماعتیں نعروں کی حد تک ''چھوٹی حکومت'' (small government) کی حمایت کرتی ہیں، لیکن ان کا مقصد عام رفاہی مدوں سے رقوم کم کر کے انہیں عوامی خزانہ سے سرمایہ داروں کی تجوریوں میں منتقل کرنا ہوتا ہے جو بجائے خود زوال کا زینہ ہے۔ شاہ ولی اللہ کی مجوزہ حکومت میں بقدر ضرورت اور مختصر سرکاری عملہ پر خرچ کم کر کے عام رفاہی امور میں زیادہ خرچ کرنا مقصود ہے تا کہ قوم کی تہذیبی حالت میں انحطاط نہ آئے۔

ایک صدی کے دو مزاج

شاہ ولی اللہ (۱۷۰۳ـ۱۷۶۲ء) اور چارلس ڈارون (۱۸۰۹ـ۱۸۸۲ء) کے مابین پوری ایک صدی کا فصل ہے۔ شاہ ولی اللہ برصغیر میں مسلمانوں کے انتہائی زوال کے زمانہ کی شخصیت

ہیں اور ڈارون دنیا میں یورپی عیسائی غلبہ اور تسلط کے انتہائی عروج کے دور کا نمائندہ ہے۔ ان دونوں کے نظریات کا متوازی مطالعہ کچھ عمرانی گرہیں کھولتا ہے اور عصری تاریخ کی تدوین میں معاون ہے۔ ولی اللہی فلسفہ ارتفاقات اور ڈارونی فلسفہ ارتقائیات کے ایک اجمالی موازنہ سے معلوم ہوتا ہے کہ شاہ ولی اللہ معاشرہ کی اثباتی قوتوں کو مخاطب کرتے ہیں جبکہ ڈارون انہی قوتوں کا انکار کرتا ہے۔ یا معاشرہ کی منفی قوتوں کی حوصلہ افزائی کرتا ہے۔ یہ دونوں ذہن ان دونوں افراد کے متضاد پہلو اور الگ الگ عمرانی مقاصد کی نشانیاں ہیں جو ان دونوں افراد کے اپنے اپنے دینی معتقدات کے پس منظر سے ابھرتے ہیں۔ ان دونوں کے ذہن و افکار کی تشکیل ایک اعتبار سے متصادم حالات نے کی ہے اس لئے ان کے اخذ کئے ہوئے معاشرتی نتائج میں ہم آہنگی نہیں پائی جاتی۔ شاہ ولی اللہ انسان کی بہترین اخلاقی، تعمیری اور مثبت صلاحیتوں میں تحریک پیدا کرتے ہیں، جبکہ ڈارون مخلوقات کی بہیمیت کو انسانی وجود کی بنیاد بنا کر آدمی کے اندر درندوں کی صفات پیدا کرنے یا انہیں تلاش کرنے اور ان کا اقرار کرنے کا وکیل ہے۔ دونوں فلسفوں کے اطلاقی نتائج، خواہ عملی ہوں یا نظری، کسی باشعور انسان سے چھپے نہیں رہ سکتے۔ اس حقیقت سے بھی مفر نہیں کہ شاہ ولی اللہ کا فلسفہء حیات وعمرانیات تین سو برس میں دنیا میں کہیں بھی کلی یا جزوی طور پر بروئے کار نہیں لایا گیا اس لئے اس کے عملی فائدے انسانی تجربہ میں نہیں آئے، اگرچہ اہل علم کے ایک محدود طبقہ میں اس نظریہ کی فلسفیانہ افادیت پر بحث یا اس کی تدریس قلبی طمانیت یا تعلیمی حجت کے لئے کافی سمجھی جاتی ہے اس کے برعکس ڈارون کے فلسفہ نے سات آٹھ نسلوں کے ذہنوں کی ساخت بدل دی، نیز استعماری سیاست اور بے محابا نسلی برتری کے ظاہری عزائم کی شکست و پسپائی کے باوجود اس نظریہ نے عملی میدان میں انسانی سرشت کے طغیان و سرکشی کو بہیمیت کا وہ مزاج دیا جس کے نتیجہ میں دو عالمی جنگوں میں کروڑوں انسانوں کو باہم متصادم برتری کے جنون کی بھینٹ چڑھا دیا گیا، بلکہ ان جنگوں کے بعد لڑی جانے والی پچاس سے زیادہ ''علاقائی'' لڑائیوں میں انسانی خون بہانے کو ابلاغیہ کی شاندار تفریح کا رنگ دے دیا۔

انسانی فطرت خود سے بغاوت کو زیادہ دیر برداشت نہیں کرتی: بغاوت کی اصلاح کر دیتی ہے یا باغی کو تباہ کر دیتی ہے۔ نسلی تفاخر اور دماغی برتری کے فلسفوں نے جب ۱۹۱۴ء سے ۱۹۴۵ء کے دوران کروڑوں بے گناہ انسانوں، جنگی محاذوں پر روندے جانے والے پھول سے معصوم جوانوں، پر امن شہریوں، بوڑھوں، عورتوں اور بچوں، ان کی املاک، ان کے گھروں، ان کے ارمانوں اور خوابوں، ان کے وسائل حیات کو نیست و نابود کیا تو چیختی کراہتی انسانیت سے دہشت زدہ لوگوں نے انسانی حقوق کا سیاسی نعرہ ایجاد کر کے اس کے پیچھے سر چھپانے کی سعی کی۔ مگر آخر اس نعرہ کو بھی اسی نسلی برتری کا شکار بنا کر اس کا نشانہ انہی کمتر قوموں اور نسلوں اور ملکوں کو بنا دیا گیا جن کو کسی بھی مادی میدان کار میں سابق استعماری اقوام کا ہم پلہ تسلیم نہیں کیا جاتا۔

اس وحشی سیاست کا سرا ڈارون کے نظریہ میں مل جائے گا لیکن مورخین اور اجتماعیات کے ماہرین نے بھی اس نکتہ پر توجہ کی زحمت نہیں اٹھائی کیونکہ ظاہری طمع کے باوجود فی الواقع آزاد و مستقل رائے آفرینی ان کی تعلیمی یا معاشرتی تربیت کا جزو نہیں ہے اور نہ ایسے عمل کو عصری تہذیب کی تائید حاصل ہے۔

تہذیب نفس کی اولیت

اس جائزہ کے بعد دیکھا جائے تو شاہ ولی اللہ تمدن سے پہلے نفس کی تہذیب کا اصول پیش کرتے ہیں۔ یہ کلیہ تمام اسلامی ماہرین عمرانیات و سیاست، فقہا اور صوفیاء کے مابین مشترک اور اساسی ہے۔ ارتفاقات میں شاہ ولی اللہ کے ہاں پہلی شرط معاشرہ میں نظام صالح (نظاماً صالحاً فی المدینہ) ہے جس کا اولین مقصد دنیا کی تہذیب سے پہلے عذاب آخرت سے انسانوں کے تحفظ کا یقین ہے اور ثانوی درجہ میں لباس فاخرہ، حاجات میں لذت نفس کا اہتمام، ذائقہ دار کھانا، خوبصورت زوجہ جیسی آنکھوں کو ٹھنڈک دینے والی جائز خواہشات آتی ہیں (حجۃ اللہ البالغہ: ۴۲۰۔۴۲۲)۔ انفرادی ضروریات کے بعد معاشرتی ضرورتیں آتی ہیں۔ ان امور کی بجا آوری کے دو فطری طریقے ہیں۔ ان میں ایک کو شاہ ولی اللہ نے رائے کلی کہا جو مفاد عامہ میں

منہمک عقل تام اور فکر کامل ہے اور دوسری رائے جزوی ہے جو شخصی اور ذاتی اغراض کی تکمیل میں کام آتی ہے۔ رائے کُلی معاشرتی ضروریات کی تکمیل میں نفاست، تدابیرِ نافعہ اور ان کے نفاذ میں رہنمائی کرتی ہے۔ رائے کُلی کا اظہار مختلف تمدنی کیفیات میں ہوتا ہے۔ خانہ بدوشوں اور پہاڑی باشندوں کی تہذیب (یعنی رسوم و رواج) وہ معاشرت ہے جس میں رائے کُلی اجتماعی نظم کو برقرار رکھنے سے زیادہ مدد نہیں دیتی۔ البتہ معتدل اقالیم کے شہروں کی ترقی یافتہ حضارت میں ضروری ہے کہ وہاں بڑی تعداد میں اچھے اخلاق والے لوگ اور حکماء موجود ہوں جو زراعت، صنعت و تجارت کے واسطوں سے معاشرہ کی جملہ رفاہی ضروریات اور حاجات کو بروقت مہیا کرنے کی ذمہ داری لیں، دشمنوں سے معاشرہ و ملک کے دفاع کا نظام کریں، حرص و ہوس اور جرائم کا سد باب کریں۔ یہ تمام محرکات خلافت کبریٰ پر منتج ہوتے ہیں جس کا حاصل انسان میں طہارت، نیازمندی اور کسرِ نفسی (اِخبات)، فیاضی اور حوصلہ مندی (سماحت) اور انصاف، اعتدال و مساوات (عدالت) کی صفات کو فروغ دینا ہے جو تہذیب کا اصل اصول ہے۔ امام غزالی اور شاہ ولی اللہ کے حوالہ سے ان امور کی شرح مولانا سید سلیمان ندوی نے علامہ شبلی کی سیرۃ النبیؐ (۴:۲۸۔۳۵) میں بہت تفصیل سے کی ہے۔

فقط شہر تعمیر کر دینا، ان میں رفاہی سہولتیں مہیا کرنا تمدن کی غرض و غایت نہیں ہے اور نہ یہ انسانی زندگی اور انسانی صلاحیت کا درجۂ کمال اور منتہائے مقصود ہے۔ زندگی کا حقیقی مقصود سعادت اور خوش بختی ہے۔ اس کا ایک مادی وسیلہ معاش اور دنیاوی مشاغل ہیں اور دوسرا عبادات اور ریاضیات کا طریقہ ہے جو انسان میں پائی جانے والی حیوانی شہوات کو ملکوتی صفات کے تابع کرتا ہے۔ پہلے وسیلہ میں نقصان کا اندیشہ ہے جیسا کہ قرآنی قصص، تاریخ عالم اور عصری دنیا کے عمرانی مطالعہ سے ثابت ہے۔ چنانچہ عبادات اور ریاضتوں کا اہتمام معاشرتی مشاغل کے ساتھ کرنا لازم ہے تاکہ زندگی کا توازن برقرار رہے (حجۃ اللہ البالغہ ۱::۵۲۱)۔ سعادتِ حقیقیہ کا حصول فقط عبادات سے ممکن ہے۔ سادہ لفظوں میں یہ کہ تہذیب و تمدن اسی صورت میں مفید عام ہوتے ہیں

جب اس کو عبادات الٰہی کے اصول پر استوار کیا جائے، یعنی فسق، فجور، بدعات، شرک اور کفر کی آمیزش سے محفوظ رکھا جائے۔

غازی کا نظریۂ امامت کبریٰ

اس مرحلہ پر حکیم الامت مولانا حامد الانصاری غازی کا نظریۂ امامتِ کبریٰ رہنمائی کرتا ہے۔ عبادت و ریاضت کی بنیادی شرط معبود کا وجود ہے۔ اس معاملہ میں انسان کو آزاد نہیں چھوڑا گیا کہ جسے چاہے معبود بنا لے۔ تاریخ سے ثابت ہے کہ یہ گمراہی اور معاشرتی وتہذیبی اختلال، زوال اور خاتمہ کا نسخہ ہے۔ مولانا غازی انبیاء کی حکومتوں کے عنوان سے اثباتی انداز میں یہ نکتہ اٹھاتے ہیں اور انسان کو یاد دلاتے ہیں کہ عصری عمرانیات اور انسیات (anthropology) کے فلسفوں کے علی الرغم اللہ کا وجود خیالات کی اُپج، خانہ ساز اور انسان کا پیدا کردہ نہیں ہے بلکہ اس حقیقت کا برملا اعتراف ہے کہ انسان کو اللہ نے پیدا کیا ہے اور اسی نے حکومت کو پیدا کیا ہے۔ لہٰذا سلطنت اللہ کی پیدا کی ہوئی تنظیم ہے (اسلام کا نظام حکومت ۶۹) جس کا مطلب یہ ہے کہ حکومت کا وجود اللہ کی وحدانیت کے اقرار اور اس کی عبادت سے مربوط ہے۔ اس سے نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ حکومت چونکہ معاشرہ کی ضرورت ہے اس لئے معاشرہ بھی اللہ کی بنائی ہوئی اجتماعی شکل ہے جو انسانی ہاتھوں میں آ کر اچھا بھی بن سکتا ہے اور بگڑ بھی سکتا ہے۔ اسی مرحلہ پر انسان کا اختیار ظاہر ہوتا ہے جو دنیا و آخرت کے پس منظر میں قانون کی اساس ہے۔

یہ تصور انسان کے دماغ میں از خود پیدا ہونا تقریباً ناممکن ہے۔ عام انسان، جیسا کہ شاہ ولی اللہ بھی بیان کرتے ہیں، اپنے معاشرہ کے اشراف کی نقل کرتے ہیں اور اپنی فراست و کیاست کے آزادانہ استعمال پر قادر نہیں ہوتے، نہ ان کے اندر تجزیہ اور فیصلہ کی وہ قوت ہوتی ہے جو آزادانہ اقدام کی شرط ہے۔ اس وضاحت سے اسلامی فقہ میں مجتہد ائمہ اور تقلید ائمہ کے اصول کو بھی دلیل ملتی ہے۔ اس بنا پر مولانا غازی کا کہنا ہے کہ "ہر اجتماع سے پہلے اس ایک فرد کا ہونا ضروری ہے جس کے اپنے تمام اوصاف کمال کے ساتھ ظہور سے دنیا پر قدرت کا منشاء کُھل سکے"۔ یہی دلیل

ہے کہ گمراہ معاشروں میں انبیاء بھیجے جاتے تھے اور اب امت محمدیہؐ میں ایک طرف ہر قرن میں مجدد دین ظاہر ہوتے ہیں اور خیر القرون میں فقہ اور حدیث اور پھر تفسیر کے ائمہ ظاہر ہوئے اور باقی مدت میں ہدایت و رہنمائی کے لئے علماء اور فقہاء کی بڑی تعداد موجود رہتی ہے۔ عام انسانوں کی اس شعوری کمزوری کا اعتراف امام راغب اصفہانی نے بھی کیا ہے (الذریعہ الی مکارم الشریعہ ۱٤٤:٤/اسلام کا نظام حکومت ۹۰) کہ انسان کی بڑی کمزوری یہ ہے کہ وہ حقیقی اور دائمی منافع اور نقصانات سے غافل ہو جاتا ہے اور اپنے اصولی فوائد اور جزوی مفاد کو نظر انداز کر دیتا ہے۔ اس لئے مولانا غازی انبیاء کی بعثت کو انسانی معاشرہ کی بنیادی ضرورت قرار دیتے ہیں کیونکہ ایسے منتخب افراد ہی زندگی کے پسندیدہ مقاصد کی تنظیم و تہذیب کرتے ہیں تاکہ عام انسان جنہیں اپنے سے برتر اور بہتر انسانوں کی تقلید و اتباع کے سوا چارہ نہیں ہوتا راہ راست پر قائم رہیں۔ چنانچہ انسانی معاشروں کے لئے منشاء الٰہی یہی ہے کہ تمام برائیوں اور انسانیت عامہ کے منتشر اور فاسد عناصر کا خاتمہ ہو، تمام اچھائیوں کا ظہور ہو اور اللہ کی وحدانیت اور عبودیت پر مبنی ایسا معاشرہ تشکیل پائے جو دنیا کی مادی اور روحانی طاقتوں کی متناسب ترکیب سے وہ فطری نظام معاشرت و سیاست بروئے کار لا سکے جس کا مطمح نظر انسانیت ہو (اسلام کا نظامِ حکومت ۱۹۳-۱۹۴) یہ منشاء الٰہی نظریہ تہذیب کو وہ رخ دیتا ہے جو قرآنی قصص میں انبیاء کی تعلیمات میں بار بار سامنے آتا ہے اور جو رسول اللہؐ کے قائم کردہ معاشرتی اور سیاسی نظام میں دنیا کی پہلی مکمل تہذیب میں نمودار ہوا۔

جماعت کی تہذیبی اہمیت

احادیث میں اسلامی معاشرہ کو جماعت سے تعبیر کیا گیا ہے اور افراد کو اس جماعت سے ہر قیمت پر مربوط رہنے کا حکم بار بار دیا گیا۔ حضرت ابو مالک اشعریؓ سے صحیح کے درجہ کی ایک روایت ہے کہ رسول اللہؐ نے فرمایا: وَاَنا آمرکم بِخَمس: امرنی الله بِهِن: الجماعه و السّمع و الطاعة و الهِجرَة و الجِهَاد فی سَبیل الله۔ وَمَن فارق الجَماعَة قید شِبر فَقَد خلع ربقَة الاسلام مِن عُنُقِهِ او من راسِه۔ الا ان یرجع من ادعی دعویٰ جَاهلية فهومِن جثا

جهنم۔ قیل یا رسول الله و اِن صَام وَصلی؟ قال و اِن صَام وصلی و یدعی بدعویٰ الله التی سماکم بها المؤمنین المسلمین عباد الله (امام حاکم نیشاپوری۔ مستدرك علی صحیحین رکتاب الصوم ۱:۵۸۳:۱۵۳۵/حافظ علی الہیثمی۔ مجمع الزوائد و منبع الفوائد ۵:۲۱۷) میں تم لوگوں کو پانچ باتوں کا حکم دیتا ہوں۔ میں تم کو حکم دیتا ہوں جماعت (کا)، (باہم بات) سننے کا، اطاعت کا، ہجرت اور اللہ کے راستے میں جہاد کرنے کا۔ پس جو بھی جماعت سے بالشت بھر باہر گیا اس نے اپنی گردن یا سر سے اسلام کی رسی نکال پھینکی تا آنکہ وہ لوٹ آئے اور جس نے کوئی اور دعویٰ کیا تو وہ جاہلیت کا دعویٰ کیا۔ سو وہ اوندھے منہ جہنم میں جائے گا۔ کسی نے پوچھا یا رسول اللہ خواہ وہ روزے رکھتا او رنماز پڑھتا ہو؟ رسول اللہؐ نے فرمایا (ہاں) چاہے وہ روزے رکھتا ہو اور نماز پڑھتا ہو اور مومنوں مسلموں جیسے اللہ کے بندوں کے نام رکھتا ہو۔ حضرت عبداللہ ابن مسعود کی ایک روایت (ابن ابی شیبہ۔ مصنف ۷:۴۵۷ ح ۳۷۱۹۲) میں کہا گیا کہ وَعَلَیکُم بِالجَمَاعَة = تم پر جماعت (سے وابستگی) لازم ہے۔ اس کا دوسرا ترجمہ یہ ہوگا کہ جماعت تمہارے لئے فرض کے درجہ کا قانون ہے۔ حضرت ابن مسعودؓ ہی سے دو دیگر احادیث میں آتا ہے کہ اطاعت اور جماعت کا لازم پکڑ لو کیونکہ یہی اللہ کی رسی (فانه حبل الله) ہے جس (کو تھامنے) کا حکم قرآن حکیم (آل عمران ۳:۱۰۳) میں بھی دیا گیا ہے تو جو لوگ جماعت کی خیر سے کراہت کرتے ہیں بے شک وہ فرقہ بازی پسند کرنے والے لوگ ہیں (ابن ابی شیبہ۔ مصنف ۷:۴۷۴ ح ۳۷۳۳۷) اور دوسری حدیث کا مفہوم ہے کہ اگر تم جنت کے وسط میں قیام کرنا چاہتے ہو تو جماعت یا لوگوں کی جماعت سے جُڑے رہو (ابن ابی شیبہ۔ مصنف ۷:۴۸۸ ح ۳۷۴۵۱)۔ خطبہ حجۃ الوداع میں ایک بار پھر رسول اللہؐ نے فرمایا لزوم جماعة المسلمین (نثار احمد۔ خطبہ حجۃ الوداع ۸۱) مسلمانوں کی جماعت کا لازم پکڑ لو۔

جماعت نہ تو کسی تنظیم کا نام ہے جس کا کوئی صدر سکریٹری، امیر و ناظم ہو، نہ کسی فرد یا گروہ یا سوادِ اعظم سے کٹے ہوئے کسی فرقہ کی یہ خوش فہمی کہ ہم اپنی ذات میں خود انجمن ہیں۔ بلکہ جماعت تو

خود رسول اللہؐ نے قائم فرمادی تھی اور اس جماعت کے ہر فرد فرید اور رکن رکین کو حجۃ الوداع کے موقعہ پر جبل الرحمۃ کی بلندی سے حکم دیا تھا کہ فلیبلغ الشاھد الغائب (امام بخاری۔ الجامع الصحیح ۱:۱۰۵ ح ۱۰۵ عن عمرو ابن سعید وعن ابن عباسؓ رشار احمد۔ خطبہ حجۃ الوداع ۸۲) جو موجود ہیں وہ بعد میں آنے والوں کو یہ بات پہنچادیں۔ یہ دائمی حکم ہے کہ قیامت تک ہر فرد اور ہر نسل اپنے بعد آنے والوں کو اس علمی، معاشرتی، عمرانی، قانونی اور شرعی تسلسل سے مربوط اور متواصل رکھے۔ یہ کبھی نہ ٹوٹنے والا وہ سلسلہ ہے جو ایک کڑی سے دوسری کڑی اور ایک نسل سے دوسری نسل کے واسطہ سے ہمارے زمانۂ وجود کو علمی، عملی، عمرانی، تہذیبی، اخلاقی، حیثیت سے رسول اللہؐ کے عہد میمون و مسعود سے ملائے رکھے ہے۔ اسی کا نام جماعت ہے اور اس سے علیحدگی کا نام فرقہ بندی ہے۔

یہ اصول معاشرہ میں عمرانی اور سیاسی تسلسل پیدا کرتا ہے جس سے نہ صرف تہذیب بنتی ہے بلکہ اس میں مثبت ارتقائی عمل مرتب ہوتا ہے۔ اسلامی سیاسیات میں اس اصول کا سب سے پہلا نفاذ خلافت راشدہ کے تیسرے انتخاب کے الیکشن کمشنر حضرت عبدالرحمٰنؓ ابن عوف نے امیدواروں سے اس سوال کے ذریعہ کیا تھا کہ آئندہ خلیفہ گزشتہ دو خلفاء کی قائم کردہ روایات کی پاسداری کرے گا یا نہیں۔ چنانچہ یہ اصول امامت کبریٰ کی تعریف اور حدود عمل بھی متعین کرتا ہے۔

امامت کبریٰ کی اساس

عمرانی اصول کی رو سے جماعت ہی معاشرہ کو امامت کبریٰ سے جوڑتی ہے جس کی وضاحتیں امام شاہ ولی اللہ دہلوی اور حکیم الامت مولانا حامد الانصاری غازی نے کی ہیں۔ خود یہ جماعت حبل اللہ۔ یعنی اللہ کے ساتھ اس کی اطاعت کے عہد پر قائم رہنے کا نتیجہ ہے۔ لہٰذا یہ جماعت ہی انسانی معاشرت و تہذیب کا معیار ٹھہری اسی لئے احادیث ہیں اس عہد پر مضبوطی سے قائم رہنے کا حکم بہ تکرار دیا گیا ہے۔ اس نوعیت کے قوانین کو مولانا غازی نے ان فطری تصورات کا ایک نیا اور متوازن نظام قرار دیا ہے جو ایک طرف ملک کو سیاسی استحکام دیتے ہیں اور دوسری طرف معاشرہ کو عمرانی تسلسل اور تہذیبی بنیادیں فراہم کرتے ہیں۔ ان بنیادوں کا نام اوامر و نواہی اور اصطلاحی معنی

میں شریعت ہے۔ مولانا غازی کا کہنا ہے کہ حکومت اسی لئے معاشرہ کی ضرورت ہے کہ وہ ان اوامر ونواہی کو نافذ کرتی ہے اور یہی امامت کبریٰ ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ اسلامی حکومتوں کی ساری تاریخ اس سے زیادہ اور کچھ نہیں کہ وہ جمہور کو ان امور کا پابند بنانے پر زور دیتی ہیں جن سے عوام الناس کی بہتری کے پروگرام کو تقویت پہنچے۔ علامہ ابوالبقاء حنفی (کلیات العلوم۔ باب الحا: الحکم ۲۸) کے حوالہ سے اس نکتہ کی مزید وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ حکم ایک تصرف ہے جس کا مطمح نظر دو پہلو سے سامنے آتا ہے۔ ایک یہ کہ انسان کو ایسا کرنا چاہئے اور دوسرے یہ کہ ایسا نہیں کرنا چاہئے انسانی مجتمع میں اوامر ونواہی کو نافذ کرنے کی قوت ہی کو حکومت کہا جاتا ہے۔

اس کی تائید مزید مولانا سید سلیمان ندوی (سیرۃ النبی ۶: ۳۴۱۔۳۴۳) نے قرآنی اور حدیثی اخلاقیات کے عنوان سے کی ہے۔ دو سو سے زیادہ اخلاقی خوبیاں اور احکام تحریر کرنے کے بعد وہ لکھتے ہیں کہ ''انسان بڑا بہانہ جو اور حیلہ طلب واقع ہوا ہے۔ اس کے لئے اخلاقیات کے کلّی اصول کافی نہیں کہ وہ لفظوں کے ہیر پھیر کے سایہ میں پناہ لے اور صرف چند رسوم کی لفظی تقلید پر قناعت کر لے۔ اس کے لئے ضرورت ہے کہ ہر خوش اخلاقی یا بد اخلاقی کے ایک ایک جزئیہ کا استقصاء کیا جائے اور اس کے ایک ایک ریشہ کو کھول دیا جائے اور اس کی تہہ کی اصلی گہرائیوں تک پہنچا جائے، اس کے وسائل اور ذرائع کا بھی پتا لگایا جائے اور ان کے متعلق صریح احکام دے جائیں''۔

علماء اسلام نے جو کچھ اخلاقیات کے ذیل میں بیان کیا ہے وہ بنیادی طور پر تہذیب کے اجزائے ترکیبی ہیں اور انہی اجزاء پر عمل کے نتیجہ میں اسلامی تہذیب مرتب ہوئی تھی، اور معاشرہ میں انہی اجزاء کے نفاذ یا ان کے انکار و غفلت پر کسی تہذیب کے وجود یا عدم کا انحصار ہوتا ہے۔

چنانچہ مولانا غازی کے نقطہ نظر سے حکم اور حکومت آسمانی اقتدار کا جوہر ہے اور انسان میں جو اختیار آتا ہے وہ بھی اسی جوہر کا فیض ہے۔ اس جوہر کا جو عطیہ انسان تک پہنچتا ہے وہ اس وقت تک مستقل باقی رہتا ہے جب تک مظاہر خارجی میں اس کے لئے صلاحیت مند قالب یا (اجتماعی) ہیئت موجود ہو۔ اگر ایسا نہیں ہوتا تو وہ جوہر اپنے اصل سرچشمہ کی طرف لوٹ جاتا ہے اور سازگار

زمانہ اور صلاحیت مند قوم کا انتظار کرتا ہے (اسلام کا نظام حکومت ۲۴۶) اسی کا نام حکمت ہے۔ یہی قوموں کے وجود وعدم کا پیمانہ اور عروج وزوال کی موجوں کو دیکھنے کی دور بین ہے۔

اس بیان سے قومِ نوح، عاد وثمود، قوم نمرود وغیرہ ان تمام قوموں کی تاریخ سمجھ میں آجاتی ہے جنہوں نے اس جوہر سے فیضیاب ہونے سے انکار کر دیا تھا اور اس کا خمیازہ بھگتا۔

(☆) شاہ ولی اللہ کی اس وضاحت سے ذیلی طور پر رویت ہلال کے مسئلہ پر بھی روشنی پڑتی ہے جو عہد جدید میں کم و بیش دنیا کے ہر شہر میں بے معنی نزاع کا سبب بنتا رہتا ہے۔ اسلامی اصول قانون کی رو سے رویت ہلال کو سائنسی ارتقاء، خلائے بسیط کے پیٹ میں اتر کر دیکھنے والی دور بینوں، مشینوں اور آلات، ہوائی جہازوں اور خلائی جہازوں، پہاڑوں پر چڑھنے اور نہایت ذی مرتبہ سائنسدانوں کی عقلوں اور کلوں کے بجائے ایک عام آدمی کے وسائل اور اس کو حاصل بنیادی مادی سہولتوں یعنی اپنے گھر کے دالان یا مسجد کے صحن یا محلہ کے چوک میں کھلی آنکھ سے ہلال کے مشاہدہ پر موقوف رکھا ہے۔ جو لوگ ان بنیادی سہولتوں کا انکار کر کے رویت ہلال کو اعلیٰ یا مالدار طبقات کی اپنی عقل اور موجودہ سائنسی وسائل کا پابند کرنے پر اصرار کرتے ہیں وہ ساری دنیا میں رمضان اور عیدین کے موقعہ پر شرمناک نزاع اور جھگڑا پیدا کرنے کا سبب بنتے ہیں۔ اس نزاع کا الزام براہ راست مولوی کو اور بالواسطہ طور پر اسلامی قانون کو دیا جاتا ہے۔

کتابیات

القرآن الحکیم: البقرہ ۲، آل عمران ۳، الاعراف ۷، الرعد ۱۳، النحل ۱۶، الاحزاب ۳۳، القارعہ ۱۰۱، التکاثر ۱۰۲، العصر ۱۰۳

شیخ عبد الحق حقانی دہلوی۔ فتح المنان تفسیر حقانی۔ الفیصل لاہور ۲۰۰۹ء

مولانا اشرف علی تھانوی۔ بیان القرآن۔ ادارہ تالیفات اشرفیہ۔ ملتان ۱۴۲۶ھ

امام بخاری۔ الجامع الصحیح تفہیم البخاری از مولانا ظہور عبد الباری اعظمی، دار الاشاعت کراچی

امام محمد ابن عبداللہ الحاکم نیشاپوری۔ مستدرک علی الصحیحین، دار الکتب العلمیہ بیروت

حافظ علی الہیثمی۔ مجمع الزوائد ومنبع الفوائد، دار الکتاب العربی بیروت۔

ابن ابی شیبہ۔ مصنف، دار التاج بیروت ۱۹۸۹ء

امام جلال الدین سیوطی۔ الخصائص الکبری، ممتاز اکیڈمی لاہور

امام راغب اصفہانی۔ الذریعہ الی مکارم الشریعہ، دار اسلام قاہرہ ۲۰۰۷ء

امام ابو البقاء مکی حنفی۔ کلیات العلوم، مؤسسۃ الرسالہ بیروت ۲۰۱۰ء

امام شاہ ولی اللہ دہلوی۔ حجۃ اللہ البالغہ (متن مع اردو شرح رحمۃ اللہ الواسعہ از مولانا سعید احمد پالنپوری) زمزم پبلشرز کراچی ۲۰۰۵ء

مولانا عبید اللہ سندھی۔ شرح حجۃ اللہ البالغہ، حکمت قرآن انسٹیٹیوٹ کراچی ۲۰۱۰ء

علامہ شبلی نعمانی۔ سیرۃ النبی، دار المصنفین اعظم گڑھ / لاہور اشاعت ۱۴۰۸ھ

مولانا سید سلیمان ندوی۔ سیرۃ النبی، ادارہ اسلامیات لاہور ۲۰۰۲ء

حکیم الاسلام مولانا قاری محمد طیب، جواہر حکمت، ادارہ تالیفات اشرفیہ ملتان ۱۴۲۷ھ

مولانا حامد الانصاری غازی۔ اسلام کا نظام حکومت، ندوۃ المصنفین دہلی ۱۹۴۳ء

مولانا خالد سیف اللہ رحمانی۔ راہ عمل، زمزم پبلشرز کراچی ۲۰۰۹ء

ڈاکٹر نثار احمد۔ خطبہ حجۃ الوداع، بیت الحکمت لاہور ۲۰۰۵ء

محمد طارق غازی۔ سلطنت عثمانیہ، باب ۵: سیاسی تصور، سہ ماہی الاقرباء اسلام آباد

مولانا عبد الحفیظ بلیاوی۔ المنجد اردو، خزینہ علم وادب لاہور

مولانا وحید الزماں کیرانوی۔ قاموس الوحید، ادارہ اسلامیات لاہور ۲۰۰۱ء

معجم الفاظ القرآن الکریم / مصر

محمد اویس جعفری۔سیاٹل (امریکہ)

جامع عقبیٰ دُنیا کی چوتھی عظیم مسجد اور

جامعۃ القرویین دُنیا کی سب سے پہلی یونیورسٹی

تیونس کے عروس البلاد شہر قیروان کی بنیاد ۷۰ء عیسوی میں عربوں کے مرہونِ منت ہے۔ حضرت معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے دورِ ملوکیت (۱ء تا ۸۰ء) میں علوم اسلامی کی ترویج و فروغ میں قیروان کو ایک مرکزی مقام حاصل رہا ہے اس شہر کو یہ فخر و امتیاز بھی حاصل ہے کہ اس میں اُس دور کی وسیع و خوبصورت مسجد ''عقبیٰ'' کا نام اس کے فاتح مشہور مسلم سپہ سالار حضرت عقبیٰ بن نافع رحمت اللہ علیہ کے نام پر رکھا گیا۔ اس مسجد کو جامع مسجد قیروان بھی کہا جاتا ہے، مکہ مکرمہ، مسجد نبویؐ اور مسجد اقصیٰ کے بعد اس کو نہ صرف سب سے بڑی مسجد بلکہ اس مسجد میں سات مرتبہ ادا کی گئی نماز کو مکہ مکرمہ میں ایک مرتبہ ادا کی گئی نماز کے مساوی تصور کیا جاتا تھا۔

اسی شہر قیروان کے ایک نادار خوانچہ فروش نے جس کا نام محمد بن عبداللہ فہری تھا اپنی بے پناہ محنت، دیانتداری، ذہانت اور پیہم جدوجہد سے ملک کے تجار اور سوداگروں میں نہ صرف ایک اعلیٰ مقام حاصل کر لیا بلکہ اپنے ہمعصر رئیسوں میں اس کا نام بطور مخیّر سرِ فہرست رہا۔ اس کی دو ہونہار، نیک اور خوبرو بیٹیاں فاطمہ اور مریم تھیں۔ فاطمہ بڑی تھیں۔ مشیتِ ایزدی تھی کہ عبداللہ فہری کے انتقال کے بعد خاندان کے مرد یکے بعد دیگرے دنیا سے رخصت ہو گئے اور فاطمہ اور مریم ہی مرحوم باپ کی دولت کی وارث قرار پائیں۔ تیونس سے کچھ خاندان مراکش کے شہر فیض جا کر آباد ہو گئے تھے۔ فاطمہ اور مریم نے بھی نویں صدی کے اوائل میں جب ادریس دوم مراکش کے سلطان تھے اس شہر کا رخ کیا اور اسی میں سکونت اختیار کی۔ ان دو بہنوں کی معیت میں کچھ اور خاندانوں نے بھی تیونس سے ہجرت اختیار کی۔ دونوں بہنوں نے یہ طے کیا کہ باپ کی دولت کو کسی کارِ خیر میں صرف کیا جائے۔ تیونس کے تارکینِ وطن کے لئے فیض میں کوئی قابلِ ذکر مسجد نہ پا

کر دونوں بہنوں نے ایک ایک مسجد تعمیر کرانے کا فیصلہ کیا۔ مریم نے مسجدِ اندلس تعمیر کرائی جبکہ فاطمہ نے مسجد قرویین کی تعمیر و تکمیل کے لئے روزہ رکھنے کی نیت کی اور ۲۴۵ ہجری/۸۵۹ عیسوی سے دو سال کے عرصہ تک مستقل اس وقت تک روزے رکھتی رہی جب تک کہ مسجد کی تعمیر مکمل نہیں ہوگئی اور تکمیل کے دن جس کا شدید انتظار تھا، دونوں بہنوں نے اسی مسجد میں نمازِ شکرانہ ادا کی۔ دونوں مساجد فنِ تعمیر کی اعلیٰ وارفع مثالیں ہیں ''ڈکشنری اوف افریکن بایوگرافی'' میں مریم کی تاریخِ پیدائش اور وفات کا ذکر نہیں ہے البتہ فاطمہ کا سنِ ولادت ۸۰۰ اور انتقال ۸۸۰ دیا گیا ہے۔ فاطمہ کو ''اُم لبنین'' یعنی بیٹوں کی ماں کے لقب سے بھی یاد کیا جاتا تھا۔ مسجد عقبیٰ اپنے حسن، کشادگی، نقش ونگار و آرائش میں گویا صوفیہ، استنبول اور جامع مسجد اصفہان سے زیادہ پُرکشش ہے۔ مسجد کی موجودہ شکل دراصل ایک ہزار ایک سو سال کی ارتقائی کاوش کا نتیجہ ہے۔ اس کی سب سے پہلے توسیع ۹۵۶ سن عیسوی میں قرطبہ کے اموی خلیفہ عبدالرحمٰن سوم کے دور میں ہوئی۔ اس کے بعد کے آنے والے سلاطین نے بھی اس کی توسیع اور تزئین وآرائش میں اہم کردار ادا کیا حتیٰ کہ یہ براعظم افریقہ کی سب سے بڑی مسجد قرار پائی جس میں بہ یک وقت بائیس ہزار (۲۲۰۰۰) نمازی با جماعت نماز ادا کر سکتے تھے۔ ۱۱۳۵ عیسوی میں سب سے بڑی توسیع المرابطونی سلطان علی ابن یوسف کے دور میں ہوئی۔ ابتدا ہی سے مسجد کے ساتھ دینی تعلیم کے لئے ایک مدرسہ بھی قائم کیا گیا تھا جو بتدریج ترقی کرتے کرتے اُس وقت کی ایک عظیم عالمی درسگاہ میں تبدیل ہوگیا۔ طلباء ٹاٹ کے فرش پر استاد کے گرد حلقہ بنا کر بیٹھتے تھے۔ حفظِ قرآن، فقہ اسلامی، عربی زبان کے قواعد، ادب، علمِ اجرامِ فلکی، کیمیاء، نباتیات، جغرافیہ، تاریخ، منطق، ریاضی، طب، سیاسیات، علم کلام، عمرانیات اور تصوف جیسے مضامین نصاب میں شامل تھے۔ درسگاہ کے قریب طلباء کی اقامت گاہیں، گرم حمام وضروری اشیاء خورونوش کی دکانیں بھی تھیں۔ منتخب اساتذہ اور طلباء براعظم افریقہ اور مشرقِ وسطیٰ سے درس وتدریس اور حصول علم کے لئے کھنچے چلے آتے تھے اور ایک اندازہ کے مطابق ایک وقت میں یہاں تقریباً آٹھ ہزار (۸۰۰۰) طلباء سے زیادہ زیرِ تعلیم رہتے تھے۔ اس درسگاہ نے قرون

وسطیٰ (۵۰۰۔۔۔۔۱۵۰۰) کے یورپ سے تہذیبی روابط قائم کرنے میں بھی ایک اہم کردار ادا کیا۔

ابتدا میں یہ درسگاہ مراکش کے گورنر کے زیرِ انتظام تھی۔ اساتذہ کا انتخاب اور تقرر سلطانِ مراکش خود کرتے تھے، لیکن طلباء کو یہ حق حاصل تھا کہ وہ اپنی مرضی کے اساتذہ اور اپنے مضامین کا انتخاب کریں۔ عالمِ اسلام اور یہود و نصاریٰ کے بھی بہت سے درخشاں مشاہیر اس درسگاہ میں یا تو استاد کے عہدہ پر فائز رہے یا بحیثیت طالب علم اس سے وابستہ رہے۔ مثلاً:

۱۔ الادریسی القرطبی جنھوں نے ابتدائی تعلیم قرطبہ میں حاصل کی۔ یہ جغرافیہ میں اور نقشہ نگاری میں دسترس رکھتے تھے۔ اور دُنیا کا پہلا نقشہ انہی کا مرہونِ منت ہے یہ جزیرہ صیقلیہ کے بادشاہ روجر دوم کے دربار سے بھی وابستہ رہے۔

۲۔ ابوبکر ابن العربی۔ یہ مالکی فقہ کے عالم تھے اور منصف کے عہدہ پر بھی فائز رہے۔

۳۔ ابن الخطیب۔ یہ شاعر، ادیب، مورخ، فلاسفر، حکیم اور سیاست داں تھے۔

۴۔ نورالدین البنرو جی ۔ یہ ماہرِ فلکیات تھے۔

۵۔ ابن ہرزیہم۔ معلم، علم تصوف میں خصوصی مہارت رکھتے تھے۔

۶۔ ابن خلدون بابائے عمرانیات، وقائع نگار، تاریخ نویس، ماہر اعداد و شمار، مشہور عالم ''مقدمہ'' کے مصنف

۷۔ محمد الآل لفسی۔ ادیب، شاعر۔ سیاستداں، استقلال جماعت کے بانی اور صدر۔

۸۔ حسن ابن محمد الوزن لافاسی، مصنف، جغرافیہ داں۔

۹۔ محمد بن عبدالکریم الخطابی۔ صحافی، مدرس، مترجم، فرانس کے خلاف گوریلا جنگ کے بانی۔

۱۰۔ موسیٰ بن میمون۔ یہودی عالم، توراۃ کے مفسر، طبیب، فلاسفر۔ فقیہ۔

۱۱۔ محمد تقی الدین بن عبدالقادر الحلالی۔ ''صحیح بخاری'' اور ''قرآن پاک'' کے انگریزی زبان کے مترجم۔ انھوں نے یورپ اور ہندوستان میں تدریس کے فرائض انجام دیے۔

۱۲۔ عبدالعزیز بن الصدیق داعی، مصنف، ماہر دینیات، صوفی المسلک۔

بے شمار یوروپی دانشوروں نے بھی اس درسگاہ سے اکتساب فیض کیا جن میں سب سے مشہور پوپ سلوسٹر دوم تھے جنہوں نے یورپ میں عربی ہندسوں اور علم فلکیات، ریاضی جیسے علوم کے علاوہ عرب تہذیب و تمدن کو بھی روشناس کرایا۔ سب سے زیادہ مسحور کن اور دلچسپ روایت جو مدتوں اس درسگاہ میں قائم رہی وہ یہ تھی کہ موسم بہار کے آغاز میں ایک جشن کا اہتمام کیا جاتا جس میں یونیورسٹی کے طلباء ''ایک ہفتہ'' یعنی ایک جمعہ سے دوسرے جمعہ تک کے لیے اپنے ہی درمیان سے ایک منتظم و حاکم اعلیٰ کا انتخاب کرتے اس سردار کو ''ایک گھنٹہ کے خلیفہ'' کے لقب سے نوازا جاتا اور اس طالب علم خلیفہ کو یہ منفرد اعزاز بھی حاصل ہوتا کہ وہ ایک گھنٹہ کے لیے مراقش کے سلطان کا مہمان ہوتا اور بلا خوف و خطر یونیورسٹی کے مسائل، سیاسی و مذہبی امور پر اظہار خیال کرتا اور تجاویز سے سلطان کو آگاہ کرتا۔ سلطان اپنے وزراء اور جامعہ کے اساتذہ سے صلاح و مشورہ کے بعد مجوزہ تجاویز پر عمل درآمد کے احکام جاری کرتا۔

چودھویں صدی میں یونیورسٹی کے کتب خانہ کو مثالی وسعت دی گئی اور اب اس کا شمار دُنیا کے قدیم ترین کتب خانوں میں ہوتا ہے اور اس میں اسلامی دُنیا کے تاریخی قلمی نسخے اور دستاویزات شامل ہیں۔ ان میں سے امام مالک کی ہرن کی کھال پر تحریر شدہ مشہور تصنیف ''موطا'' ابن اسحاق کی ''سیرۃ'' ابن خلدون کی ''اِبار'' اور سلطان احمد المنصور کا ۱۶۰۲ء میں قرآن پاک کا قدیم قلمی نسخہ بھی موجود ہے۔

جب ۱۹۱۲ء میں فرانس نے مراکش پر اپنا نوآبادیاتی نظام مسلط کیا تو اس درسگاہ میں طلباء کی تعداد بری طرح متاثر ہوئی۔ اس غیر ملکی تسلط کے دوران اہم سیاسی فیصلے، وفاداری یا نوآبادیاتی نظام کی مخالفت اور مزاحمت و جنگ کے فیصلہ کا اختیار اس یونیورسٹی کے اساتذہ کی جماعت کرتی تھی یونیورسٹی کے خزانہ کی خطیر رقم بھی مزاحمتی جنگ میں بہ وقت ضرورت صرف کی جاتی تھی۔ فرانسیسی افواج نے عمارت کے بعض حصوں کو گھوڑوں کے لیے اصطبل کے طور پر استعمال کرنا شروع کر دیا تھا اور جامعہ کو ''تاریک خانہ'' کہہ کر پکارتے تھے۔

مراکش کے بالائی طبقۂ امراء جوفرانس کی حکومت کے مداح اور اس کے صلہ میں مراعات یافتہ افراد نے اپنے بچوں کو نئے قائم شدہ مغربی طرز کی درسگاہوں میں بھیجنا شروع کر دیا۔ آزادی کے بعد ۱۹۴۷ء میں یونیورسٹی کو حکومت کے نظام تعلیم سے منسلک کر دیا گیا اور پھر ۱۹۵۶ء میں فرانس سے آزادی حاصل کرنے کے بعد اس درسگاہ پر خصوصی توجہ دی گئی اور ۱۹۶۳ء سے اسے وزارت تعلیم کے ماتحت کر دیا گیا ہے۔

ہر چند کے تیونس کا "زیتونیہ مدرسہ" ۷۰۳ سن عیسوی میں قائم کیا گیا تھا لیکن "گنز بک اوف ورلڈ ریکورڈس" نے اساتذہ کی لیاقت، طلباء کی تعداد اور خصوصی طور پر نصاب کے تنوع کے پیش نظر جامعۃ القرویین" کو دنیا کی سب سے قدیم اسناد دینے والی درسگاہ قرار دیا ہے۔ یونیسکو اور دوسری معتبر بین الاقوامی تنظیموں اور اداروں کے مطابق یہ جامعۃ اپنے قیام ۸۵۹ء ہی سے یونیورسٹی کے امتیازی مرتبہ پر قائم رہی ہے۔ یہاں یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ مصر میں الازہر یونیورسٹی ۹۷۰ عیسوی میں یورپ میں یونیورسٹی اوف بلوگنا ۱۰۸۸ عیسوی میں اور مغرب کی مایۂ ناز یونیورسٹی اوف اوکسفورڈ ۱۰۹۶ء میں قائم ہوئی تھی۔ آج مراکش میں ۲۷ بڑی جامعات [یونیورسٹیز] ہیں جہاں جدید علوم پڑھائے جاتے ہیں۔

Bibliography

Esposito, John L.

Oxford Dictionary of Islam, - Oxford , Oxford University Press, 2003.

Lulat, Y. G - M,

A history of African Higher Education from antiquity to the present: a critical synthesis . (Developing Economics. Vol. 45, Issue 2, pages: 2445 - 248.) California, Praeger Publisher, 2005.

Makdisi, George,

Madrasa and university in the Middle Ages. (Studia Islamica, No. 32, pages: 255 - 264). Paris, Maisonneuve & Larouse,1970.

Najjar , Fauzi M.

The Karaouine at Fez, (The Muslim World, Vol. 48, Issue 2, April 1958, Pages : 104 - 112). Connenticut, Hartford Seminary , 1958.

Park, Thomas K., and Amar Boun

Historical Dictionary of Morocco, 2nd ed. Maryland , Scarecrow Press, 2006.

محمد فیصل مقبول عجز

غالب کے اردو کلام میں رموز و اوقاف

غالبؔ کی شعری جمالیات قدیم و جدید روایات کی امین ہیں جس نے نہ صرف شاعری بلکہ مکتوب نگاری کو اُن کی شخصیت کا حوالہ بنا دیا ہے۔ غالبؔ نے انسانی جذبات و احساسات کی نفسیاتی کیفیات کو شعری آہنگ عطا کیا۔ اُردو فارسی زبانوں میں انسانی طرزِ فکر اور نفسیاتی احوال کو بیان کرنے کا فن غالبؔ کی شاعری میں اُس دور کے اجتماعی شعور کی دین ہے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ ان کی شاعری کے لئے ایک خاص ادبی ذوق اور فہم و فراست کی ضرورت رہتی ہے۔ اُن کو اپنی زندگی میں وہ شہرت نہ مل سکی جس کے وہ حق دار تھے۔

نہ ستائش کی تمنا، نہ صلے کی پروا　　گر نہیں ہیں مرے اشعار میں معنی نہ سہی

علاؤالدین احمد خان کو ایک خط میں لکھتے ہیں۔

"گرچہ یک فنا ہوں۔ مگر مجھے ایمان کی قسم میں نے اپنی نظم نثر کی ادا بہا اندازۂ زیست پائی نہیں۔ آپ ہی کہا، آپ ہی سمجھا۔" (۱)

غالبؔ کی شاعری میں جدتِ مضامین اور طرفگیٔ خیالات ہی نہیں بلکہ مشکل پسندی اور پہلوداری بھی ہے۔ کلامِ غالب کو سمجھنے کے لئے جس سمجھ بوجھ کی ضرورت ہے اس میں ان کی آرائشِ کلام اور طرزِ بیان کو خاص عمل دخل ہے۔ ان کی شاعری صرف لفظی کھیل نہیں بلکہ پختہ شعری روایات کا دل کش اظہار اور اس دور کی تہذیبی و معاشرتی اقدار کی بہترین عکاسی ہے۔ غالبؔ نے شاعری میں کائنات کے سربستہ رازوں اور زندگی کے حقائق کو نئے مفاہیم عطا کیے۔ غالبؔ کے قصرِ شاعری کی بنیاد جدت طرازی پر ہے جس میں جدتِ تخیل جدتِ ادا، جدتِ استعارات و تشبیہات، جدتِ محاکات اور جدتِ الفاظ سب میں محاسنِ شعری کا عمل دخل ہے۔ غالبؔ اپنے کلام میں صرف الفاظ کا سہارا نہیں لیتے بلکہ انسانی کیفیاتِ نفسانی کو بڑی کامیابی سے

مفاہیم عطا کرتے ہیں۔ محاسن شعری کی تفہیم کے لئے اگر شعری ذوق کی ضرورت در پیش ہوتی ہے تو نظم و نثر کی تفہیم کے لئے رموز و اوقاف بھی ضروری قرار پاتے ہیں۔

کسی بھی زبان میں جب گفتگو کی جاتی ہے تو کہیں ٹھہرا جاتا ہے اور کہیں ٹھہرا نہیں جاتا، کہیں کم ٹھہرا جاتا ہے اور کہیں زیادہ رُکنے اور نہ رُکنے کے عمل سے بات کے سمجھنے میں مدد لی جاتی ہے۔ اس کے لئے کچھ علامتیں مقرر ہیں جنھیں ''رموز و اوقاف'' (۳) کا نام دیا جاتا ہے۔ تحریر (خواہ نثر ہو یا نظم) میں رموز و اوقاف کا صحیح استعمال بہت اہمیت کا حامل ہے۔ اگر انہیں موقع محل کے مطابق استعمال نہ کیا جائے تو عبارت کے مفہوم میں کئی طرح کا خلل واقع ہو جاتا ہے۔

''اُردو میں رموز و اوقاف کا استعمال انگریزی کے زیرِ اثر شروع ہوا۔ انگریزی عہد سے پہلے ان کے باقاعدہ استعمال کی شہادت نہیں ملتی۔ لیکن اس کا یہ مطلب بھی نہیں کہ اہل زبان اُردو رموز و اوقاف کے تصور سے بالکل نا آشنا تھے۔ کم از کم مسلمانوں کے سامنے قرآنِ مجید کے اوقافِ قرأت کا جامع و مکمل نمونہ ضرور موجود تھا جو صدیوں سے رائج تھا۔،، (۴)

غالب نے اپنے کلام میں اس بات کا خاص خیال رکھا ہے کہ لفظ و معنی میں ربط و تسلسل قائم رہے لہٰذا انہوں نے بڑی چابک دستی سے ان علامات کو اپنی شاعری میں برتا ہے۔ ان علامات کے استعمال سے غالب نے اپنے کلام کو نہ صرف حسنِ تحریر سے مزّین کیا ہے بلکہ ابہام اور تعقیدِ لفظی و معنوی جیسے عیوب سے دامن بچانے کی سعی کی اور شاعری کے علاوہ نثر بالخصوص مکتوب نگاری میں اس بات کا خیال رکھا ہے۔

شاعری میں سکتہ، سوالیہ، فجائیہ اور واوین کا استعمال بہ کثرت ملتا ہے جب کہ رابطہ اور تفصیلیہ کا استعمال شاذ و نادر کیا گیا ہے۔ حسن بیان اور نیرنگی مضامین نے کلامِ غالب میں گہرائی اور گیرائی پیدا کر دی ہے۔

آتے ہیں غیب سے، یہ مضامین خیال میں   غالبؔ ! صریر خامہ نوائے سروش ہے

سکتہ (،): (۵)

غالب نے نئی فارسی تراکیب کو برتا لہذٰا 'سکتہ' کے استعمال سے شعر کو قابل فہم بنانے کا فن بھی خوب جانتے ہیں۔ لفظوں کے برجستہ استعمال سے کلام میں الہامی کیفیات کا گماں ہوتا ہے۔ صنعت لفظی ''مراعاۃ النظیر'' کا استعمال غالب بڑی مہارت سے کرتے ہیں اور کلام کی تفہیم کے لئے سکتہ کے بروقت استعمال سے بات کو تہہ دار اور پُر اثر بنا دیتے ہیں۔ قاری اگر ان جگہوں پر سکتہ کے استعمال سے ناواقف ہو یا شعر کی ادائیگی میں اس بات کا خیال نہ رکھے تو معنی بدل جانے کا احتمال رہتا ہے۔

چار موج اُٹھتی ہے طوفان طرب سے ہر سو موجِ گل موجِ شفق، موجِ صبا، موجِ شراب

جب مے کدہ چُھٹا، تو پھر اب کیا جگہ کی قید مسجد ہو، مدرسہ ہو، کوئی خانقاہ ہو

جن اشعار میں کسی خاص واقعہ یا منطقی نتیجہ کی جانب اشارہ ملتا ہے ایسے اشعار میں سکتہ کا استعمال بات میں وزن پیدا کرنے کا سبب بنتا ہے۔ ایسے موقعوں پر مختصر ٹھہراؤ سے بات کو نیا موڑ دینے کا فن غالبؔ کے ہاں عام ملتا ہے۔

یہ نہ تھی ہماری قسمت کہ وصال یار ہوتا اگر اور جیتے رہتے ، یہی انتظار ہوتا
ہوئے مر کے ہم جو رُسوا، ہوئے کیوں نہ غرق دریا نہ کبھی جنازہ اُٹھتا، نہ کہیں مزار ہوتا

چھوٹے چھوٹے اجزاء سے مصرعوں کی تشکیل کا فن غالبؔ نے بخوبی برتا ہے۔ فارسی میں دو یا زاید اشیا کے بیان میں علامت عطف 'واؤ' کا استعمال عام ہے۔ غالبؔ بھی فارسی کے دل دادہ ہیں لہذٰا اشعار میں اس کا استعمال کثرت سے کرتے ہیں۔ جہاں بھی مختلف الفاظ سے معنی پیدا کرنے کی کوشش کرتے ہیں سکتہ بھی استعمال کرتے ہیں۔

سادگی و پُرکاری، بے خودی و ہشیاری حُسن کو تغافل میں جرأت آزما پایا

ہاں! وہ نہیں خُدا پرست، جاؤ وہ بے وفا سہی جس کو ہو دین و دل عزیز اس کی گلی میں جائے کیوں

مصرعوں میں صلہ اور جوابِ صلہ کے اظہار سے نئے نئے مفہوم پیدا کرنے کا رجحان بھی

غالب کے ہاں موجود ہے اس لیے وہ سکتہ کی علامت کو ایسے مصرعوں میں جا بجا برتتے ہیں۔ بات سے بات پیدا کرنے میں لفظوں میں جو تعقید پیدا ہوتی ہے اُس سے بچنے کے لئے ضروری ہے کہ لفظوں کے معنی جدا جدا بیان کیے جائیں۔ غالب اس شعری ضرورت سے بخوبی آشنا ہیں۔

قیامت ہے کہ ہووے مدعی کا ہم سفر غالب   وہ کافر، جو خُدا کو بھی نہ سونپا جائے ہے مجھ سے

پیدا ہوئی ہے، کہتے ہیں، ہر درد کی دوا   یوں ہو، تو چارۂ غمِ الفت بھی کیوں نہ ہو!

الفاظ یا تراکیب کے الٹ پھیر سے نئے مفاہیم پیدا کرنا غالب کی شاعری کا خاصہ رہا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انہوں نے جہاں مصرعوں کو چھوٹے چھوٹے اجزاء میں بیان کیا ہے وہیں انہوں نے تراکیب کے ہیر پھیر سے نئے مفاہیم و مطالب کو جنم دیا۔ جدید طرزِ فکر، اسلوبِ بیان اور موزوں الفاظ کے انتخاب نے اُن ک کلام میں معنویت پیدا کی ہے۔

ہے، خیالِ حُسن میں، حسنِ عمل کا سا خیال   خُلد کا اک در ہے میری گور کے اندر کُھلا

لیتا نہ اگر دل، تمھیں دیتا، کوئی دم چین   کرتا، جو نہ مرتا، کوئی دن آہ و فغاں اور

غالب کی شاعری میں فارسیت کا غلبہ ہے یہی وجہ ہے کہ ان کی شاعری میں تعقید لفظی و معنوی کا شکوہ کیا جاتا ہے۔ انہوں نے ان عیوب کو ختم کرنے کے لئے بھی سکتہ کی مدد سے معنی کی تفہیم کو ممکن بنایا ہے۔

کم نہیں، جلوہ گری میں، ترے کوچے سے بہشت   یہی نقشہ ہے ولے اس قدر آباد نہیں

دل نہیں، تجھ کو دکھاتا ورنہ داغوں کی بہار   ان چراغوں کا کروں کیا، کار فرما جل گیا

نئے مفاہیم پیدا کرنے کے لئے شاعر اکثر اوقات چند الفاظ کو حذف کر دیتے ہیں۔ اس سے قاری کا ذہن خود بہ خود ان الفاظ تک رسائی حاصل کرتا ہے۔ ایسے مصرعوں میں تہہ دار معنی پیدا کرنے کا ہنر شاعر کی قادر الکلامی کی علامت ہے۔ دیوانِ غالب میں بے شمار ایسے اشعار موجود ہیں جن میں الفاظ

حذف کیے گئے ہیں۔ایسے الفاظ تک رسائی ممکن بنانے کے لیے سکتہ کا استعمال مددگار ہے۔

دل اس کو، پہلے ہی ناز و ادا سے،دے بیٹھے ہمیں دماغ کہاں، حسن کے تقاضے کا

سوالیہ(؟):(۶)

غالبؔ نے اپنے مخصوص مکالماتی اندازِ بیاں سے بھرپور استفادہ کیا۔اس انداز بیاں میں انفرادیت بھی ہے اور جدت پسندی بھی۔ غالبؔ کا اندازِ بیاں نثر سے بہت قریب ہے۔بعض اوقات گمان ہوتا ہے کہ وہ بہ صورت شعر نثر لکھ رہے ہیں۔

ہر اک بات پہ کہتے ہو تم "کہ تُو کیا ہے" تمھی کہو کہ یہ اندازِ گفتگو کیا ہے؟

غالب کے اسلوبِ بیاں میں یہ خوبی ہے کہ اپنے محبوب کو اس انداز سے مخاطب کرتے ہیں کہ اس سے کچھ جواب نہیں بن پاتا۔وہ نہ صرف خود ان کیفیات سے لطف اندوز ہوتے ہیں بلکہ قاری کو بھی ان احساسات و کیفیات میں شامل کر لیتے ہیں۔یہی وجہ ہے کہ اہلِ ذوق آج بھی کلامِ غالبؔ کو پڑھ کر سر دُھنتے ہیں اور انسانی رویوں کے نفسیاتی طرزِ عمل سے محظوظ ہوتے ہیں۔

ع کیوں اندھیری ہے شبِ غم؟ ہے بلاؤں کا نزول

ع کہ خوشی سے مر نہ جاتے،اگر اعتبار ہوتا

ع مجھے کیا بُرا تھا مرنا اگر ایک بار ہوتا؟

غالبؔ کے کلام میں کہیں طنطنہ اور گرج دار آواز ملتی ہے اور کہیں مکالماتی اندازِ بیاں۔اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ اُن کی شاعری انسان کو سوچنے پر مجبور کرتی ہے اور منفرد طرزِ فکر اور اندازِ بیاں سے روشناس کراتی ہے۔انسان میں پوشیدہ اور خوابیدہ تلاطم کو جگاتی ہے اور اس میں جینے کی تڑپ اور اُمنگ پیدا کرتی ہے۔

کیوں جل گیا نہ تابِ رُخِ یار دیکھ کر جلتا ہوں، اپنی طاقتِ دیدار دیکھ کر

اُن کے کلام میں بہت سی ایسی غزلیں ملتی ہیں جن میں مکالماتی اندازِ بیاں کا خاص خیال رکھا

گیا جس سے اشعار میں معنویت کی نئی جہتیں متعارف ہوئی ہیں۔ یہ اندازِ بیاں نہ صرف مکالماتی ہے بلکہ ڈرامائی بھی ہے۔ اس انداز بیاں سے غالبؔ نے جذبات اور ڈرامائی کیفیات کی منظر کشی کی ہے۔

دیا ہے دل اگر اس کو بشر ہے، کیا کہیے؟ — ہوا رقیب، تو ہو، نامہ بر ہے، کیا کہیے؟

اپنا احوالِ دلِ زار، کہوں یا نہ کہوں — ہے حیا مانعِ اظہار، کہوں یا نہ کہوں

غالبؔ کو اس اندازِ بیان پر کامل مہارت حاصل ہے یہی وجہ ہے کہ یہ خوبی اُن کی شاعری کے علاوہ نثر بالخصوص مکتوب نگاری میں بھی پوری آب وتاب سے موجود ہے۔

فجائیہ رندائیہ (!): (۷)

شاعری جن وارداتِ قلبی کا بے ساختہ اظہار ہے اس میں شاعر کی شخصیت کا پرتو بہر حال موجود رہتا ہے۔ شاعر اپنے تخلص کی معنویت کو غزل کے مقطع میں مہارت سے برتنے کی سعی کرتا ہے۔ غالبؔ کے ہاں بھی یہ رجحان ملتا ہے لہٰذا اشعار میں اس علامت کا خاص خیال رکھتے ہیں۔

بس کہ ہوں غالبؔ! اسیری میں بھی آتش زیرِ پا — موئے آتش دیدہ ہے، حلقہ مری زنجیر کا

یہ مسائلِ تصوف، یہ ترا بیان، غالبؔ! — تجھے ہم ولی سمجھتے جو نہ بادہ خوار ہوتا

میں نے مجنوں پہ لڑکپن میں، اسد! — سنگ اُٹھایا تھا، کہ سر یاد آیا

تیشہ بغیر مر نہ سکا کوہکن، اسد — سر گشتۂ خمارِ رسوم و قیود تھا

یہ علامت ان الفاظ یا جملوں کے بعد لائی جاتی ہے جو مختلف مفاہیم کے حامل ہوتے ہیں۔ اُن سے الفاظ میں جوش و جذبہ یا غم والم کا اظہار پایا جاتا ہے اور یہ الفاظ بے ساختہ منہ سے ادا ہوتے ہیں۔ فجائیہ کا استعمال غالبؔ کے اشعار میں جابجا ملتا ہے۔ اس کے استعمال سے شاعر اپنے جذبات اور قلبی واردات کی عکاسی میں مدد لیتا ہے

کوئی ویرانی سی ویرانی ہے ! دشت کو دیکھ کے گھر یاد آیا

رشک کہتا ہے کہ "اس کا غیر سے اخلاص حیف!" عقل کہتی ہے کہ "وہ بے مہر کس کا آشنا!"

اب جفا سے بھی ہیں محروم ہم ، اللہ اللہ ! اس قدر دشمنِ اربابِ وفا ہو جانا !

یہی نہیں اُن کی جذبات نگاری نے جہاں اُردو مکتوب نگاری کو نئی جہت عطا کی شاعری میں بھی بے مثال اشعار تخلیق کیے۔ اُن کا اُردو فارسی دیوان ایسے اشعار سے بھرا پڑا ہے۔ وہ اپنے اندازِ بیاں کے خود خالق تھے خود ہی خاتم۔ شعرائے متاخرین میں بے شمار شعرا نے غالب کا انداز بیاں اپنانے کی سعی کی یہی وجہ ہے کہ کسی نے غالب کی شاعری کا دم بھرا اور کسی نے "غالب شکن" کہلانا پسند کیا۔

واوین:(" ")(۸)

اردو میں واوین کا استعمال اقتباس (قول رمصرع) کونقل کرنے پر ہوتا ہے۔ جب کسی مشہور شاعر کا مصرع بعینہٖ نقل کیا جائے تو اس کے لیے واوین استعمال کی جاتی ہیں۔ کلام غالب میں بھی جہاں کہیں ایسے مصرعوں سے کام لیا گیا ہے وہاں اس کا استعمال ملتا ہے۔ امام بخش ناسخ لکھنوی کا مصرع یوں نظم کرتے ہیں۔

غالب ! اپنا یہ عقیدہ ہے بقول ناسخ "آپ بے بہرہ ہے، جو معتقدِ میر نہیں"

بہادر شاہ ظفر کا مصرع یوں لکھتے ہیں

مجھے جنوں نہیں ، غالب ! ولے بقولِ حضور "فراقِ یار میں تسکین ہو، تو کیوں کر ہو؟"

فارسی کے جن شعرا سے غالب متاثر تھے اُن میں صائب کا مصرع یوں نظم کیا ہے۔

ایں جواب آں غزل غالب کہ صائب گفتہ است "در نمود نقش ہائے اختیار افتادہ ام"

جب بھی غالب کوئی چونکا دینے والی حقیقت یا راز فاش کرتے ہیں۔ واوین کی مدد سے ان الفاظ کی اہمیت و افادیت بھی واضح کرتے ہیں۔ ایسے مصرعے جن میں ایسا اسلوب بیاں اپنایا گیا پورے

شعر کی جان قرار دیے جاتے ہیں۔

ع ہم کہیں گے حالِ دل، اور آپ فرمائیں گے ''کیا؟''

ع ہر ایک بات پہ کہنا کہ ''یوں ہوتا تو کیا ہوتا؟''

ع پوچھتے ہیں وہ کہ ''غالبؔ کون ہے؟''

ع کہتے ہو ''کیا لکھا ہے تری سرنوشت میں؟''

ع کاش پوچھو کہ ''مدعا کیا ہے؟''

کلامِ غالبؔ کا انداز بیاں ایسا دل فریب اور دل کش ہے کہ قاری جب تک خود کو ان کی جگہ رکھ کر اشعار کی تہہ تک پہنچے کلام کی گہرائی و گیرائی کو نہیں پا سکتا۔ تفہیمِ شعر کے لئے ضروری ہے کہ شعر میں کارفرما معنوی اور فنی تشکیل کے عمل کو سامنے لایا جائے۔ اس میں موجود معنوی تنوع کا احاطہ کیا جائے اور معانی کی درجہ بندی کر کے ان میں ایک ترجیح قائم کی جائے۔ سب سے پہلے لفظوں کی حیثیت، یعنی ان کا علامت وغیرہ ہونا طے کیا جائے تا کہ شعر کی معنویت کا جمالیاتی جوہر گرفت میں آ جائے۔ اگر شعر کا جمالیاتی مرتبہ متعین نہ ہو تو شعر کا ایک سطحی سا مطلب جان لینا کوئی چیز نہیں ہے۔ کلام کی لفظی معنویت پر گرفت کے لیے ان علامات سے انکار ممکن نہیں ہے۔ شعر کا جمالیاتی جوہر، لفظ و معنی کے دروبست کا نام ہے۔ اگر لفظ پوری فنی مہارت سے بیان نہ کیے جائیں تو مفاہیم تک پہنچنے میں دشواری ہوتی ہے اور قاری کے لیے ذہنی الجھاؤ کا باعث بنتے ہیں۔

میں یہ کہتا ہوں کہ ''ہم لیں گے قیامت میں تمہیں'' کس رعونت سے وہ کہتے ہیں کہ ''ہم حور نہیں''

ع کہتے ہو ''نہ دیں گے ہم، دل اگر پڑا پایا''

ع آپ سے کوئی پوچھے، ''تم نے کیا مزا پایا''

ع ''آج غالبؔ غزل سرا نہ ہوا!''

ع ناداں ہو، جو کہتے ہو کہ ''کیوں جیتے ہو غالبؔ!''

رابطہ (:): (۹)

کلامِ غالبؔ میں کئی ایک مقامات پر رابطہ کا استعمال بھی دیکھنے میں آتا ہے۔ اندازِ بیاں کی ایک صورت یہ ہے کہ شاعر اپنی کہی ہوئی بات کے لیے کوئی حوالہ پیش کرتا ہے۔ اس اظہار کے لیے رابطہ کا استعمال عمل میں آتا ہے۔

تعجب سے وہ بولا: "یوں بھی ہوتا ہے زمانے میں!" — قیامت کا ہے، سن لیلیٰ کا دشتِ قیس کا آنا

دیکھ کے میری بے خودی، چلنے لگی ہوا کہ "یوں" — مجھ سے کہا جو یار نے: "جاتے ہیں ہوش کس طرح"

شاعری سے نہیں مجھے سروکار — ختم کرتا ہوں اب دعا پہ کلام:

تو بولا : "انشراح جشن جمشید" — کہا غالب سے: "تاریخ اس کی کیا ہے؟"

یہ اندازِ بیاں اس قدر پُر اثر ہے کہ الفاظ اپنی معنویت کے ساتھ قاری کے دل میں اُتر جاتے ہیں۔ شعر میں علامت کا استعمال بعض اوقات معنی کو مبہم بھی بنا دیتا ہے۔ پہلو در پہلو معنی پیدا کرنے کا رجحان غالب کے ہاں پایا جاتا ہے۔

کہتے ہیں: "ہم تجھ کو منہ دکھلائیں کیا!" — جور سے باز آئے، پر باز آئیں کیا

ہم کو جینے کی بھی امید نہیں — کہتے ہیں: "جیتے ہیں امید پہ لوگ"

تفصیلیہ: (:۔) (۱۰)

کلامِ غالبؔ میں یہ علامت بہت ہی کم استعمال ہوئی ہے۔ شاعری میں کم الفاظ میں زیادہ مفاہیم ادا کرنا مقصود ہوتا ہے لہٰذا اختصار سے کام لیا جاتا ہے۔ کسی قسم کی تفصیل بیان کرنے کے لیے اُردو نظم و نثر میں تفصیلیہ کی علامت کا استعمال کیا جاتا ہے۔ غالبؔ کے ہاں بھی کہیں کہیں یہ استعمال نظر آتا ہے۔

حاصل کلام:

مولانا حالیؔ مرزا غالبؔ کے کلام کی جن خصوصیات (جدّتِ مضامین، طرفگی خیالات،

ندرت تشبیہات، استعارہ وکنایہ کا استعمال، شوخی وظرافت، کثیر المعانی اشعار) کا ذکر کیا ہے، ان کی کامل تفہیم کے لیے رموز واوقاف سے کامل آگاہی بہت ضروری ہے۔ غالب کو فارسی زبان پر غیر معمولی عبور حاصل تھا۔ فلسفیانہ خیالات اور انسانی نفسیات کو غالب نے جس خوب صورتی سے شعری قالب عطا کیا ہے وہ ان کا طرۂ امتیاز ہے۔ اسی کوشش میں بہت دقیق اور نئی نیز جدید تراکیب بھی ان کے کلام میں استعمال کی گئی ہیں۔ غالب نے اس عیب کو دور کرنے کے لیے بہت سے اشعار اپنے دیوان سے خارج کر دیے تھے اور اس مشکل پسندی کا حل رموز واوقاف کے استعمال سے کیا ہے لہٰذا اشعار کو چھوٹے چھوٹے اجزا میں منقسم کرنے سے ان کی تفہیم ممکن ہوگئی۔ بلاشبہ رموز واوقاف کو نثر میں اہمیت حاصل ہے لیکن شاعری میں بھی اس کی اہمیت مسلم ہے۔ ہم نظم ونثر میں ان علامات کے استعمال کی اہمیت سے انکار نہیں کر سکتے۔ رموز واوقاف کی منظم ومربوط تشکیل کلام غالب میں نظر آتی ہے۔

فہرست اسنادِ محولہ

ا:......خط بہ نام علاؤالدین علائی (۳۱ فروری ۱۸۵۵ء) خطوط غالب جلد اوّل با اہتمام: غلام رسول مہر، مطبوعہ مجلس یادگار غالب، پنجاب یونی ورسٹی، لاہور صفحہ نمبر ۳۰۴

۲......غالب، فکر وفن، از: رشید حسن خان، مضمون بعنوان ''نشاط کا شاعر'' ناشر: غالب اکیڈمی، صفحہ نمبر: ۹

۳......رموز واوقاف کا صحیح استعمال وقت کی اہم ضرورت ہے کیوں کہ اس کی پابندی سے کلام کا صحیح مفہوم، معنویت، اہمیت اور لہجہ سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔ قرآن پاک میں رموز واوقاف کے استعمال اور اہمیت سے ہم سب واقف ہیں۔ کلام اللہ میں ان کے استعمال کا اہتمام پوری احتیاط سے کیا گیا ہے اور اسے چھاپتے وقت ان کو صحیح جگہ پر استعمال کرنے، اور پڑھتے وقت ان کے مطابق ٹھہرنے کی تاکید کی گئی ہے۔ یہ تاکید اور اہتمام ہی رموز واوقاف کی اہمیت کو اُجاگر کرنے کے لیے کافی ہے۔

۔ ختمہ(۔) FULL STOP سکتہ(،) COMMA

...... وقفہ(؛) SEMI COLON رابطہ(:) COLON

...... تفصیلیہ(:۔) COLON & DASH

...... سوالیہ(؟) MARK OF INTERROGATION

...... فجائیہ ربیانیہ MARK OF EXCLAMATION(!)

...... قوسین BRACKETS ( )

...... خط DASH(..........) واوین INVERTED COMMAS (" ")

...... زنجیر HYHEN(..........) نقطے DOTS (.....)

...... ترچھا خط OBLIQUE(/)

۴:...... مضمون بہ عنوان ''اُردو میں انگریزی رموز واوقاف کے استعمال کے امکانات'' از خان غلام مصطفیٰ، بشمولہ ''روداد سیمینار املا اور رموز واوقاف کے مسائل'' مرتبہ: شبلی، ڈاکٹر نجم صدیق خان 'صفحہ نمبر: ۱۵۳' حاشیہ نمبر۱

۵...... سکتہ سب سے کم ٹھہراؤ کی علامت ہے اور کثرت کے ساتھ نظم ونثر میں استعمال ہوتا ہے۔

۶...... سوالیہ کی علامت کسی سوالیہ فقرے کے آخر میں استعمال کی جاتی ہے۔

۷...... بیانیہ۔ پکارنے 'محبت' حقارت اور تعظیم کے اظہار کے لیے استعمال ہوتی ہے۔ اُردو میں ندائیہ کا استعمال عام ملتا ہے لیکن انگریزی زبان میں یہ ندائیہ کے لیے مستعمل نہیں ہے۔ اُردو میں اسے منادی کے آگے لگا دیا جاتا ہے جیسے: اے اللہ! جی حضور! خواتین وحضرات! بزرگو اور دوستو!

یہ علامت منادا کے ساتھ بھی لائی جاتی ہے۔

جیسے: غالبؔ! مومنؔ! شیفتہؔ! داغؔ!

سرور عالم راز سرور، ٹیکساس۔ (امریکہ)

ابوالفاضل راز سرور چاند پوری کی غزلیہ شاعری

دنیا کی زبانوں میں اُردو ہی وہ واحد زبان ہے جس کی ادبی تاریخ کے ہر دور میں ہزاروں شعرا عروس شعروسخن کے حضور اپنا خراج عقیدت ومحبت پیش کرتے رہے ہیں۔ آج بھی جب کہ زبان وادب پر اضمحلال طاری ہے شاعروں کی کوئی کمی نہیں ہے۔ کچھ اور لکھا جائے یا نہ لکھا جائے، غزل پورے زوروشور سے لکھی جارہی ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ اُردو شاعری کی یہ بے پناہ مقبولیت تقریباً تمام وکمال غزل کی ہی مرہون منت ہے۔ اس حقیقت سے بھی انکار ممکن نہیں ہے کہ اُردو شعروادب کی پوری تاریخ میں ایک بھی شاعر ایسا نہیں گزرا ہے جس نے اپنی شعر گوئی کے کسی نہ کسی لمحہ میں غزل میں طبع آزمائی نہ کی ہو۔ غزل اور غزل گو شاعروں پر اتنا لکھا جا چکا ہے کہ بظاہر اب اور کچھ لکھنا دُشوار نظر آتا ہے۔ غزل کو ''نیم وحشی صنف سخن'' بھی کہا گیا ہے اور ''اُردو شاعری کی آبرو'' کے لقب سے بھی نوازا گیا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ ہندوستان میں اُردو پر زوال آگیا ہے اور شاید ایک بڑی حد تک یہ بات صحیح بھی ہے لیکن وہاں بھی غزل پر ''زوال'' کی تہمت مطلق نہیں لگائی جاسکتی۔ وہاں غزل کی مقبولیت کا اس سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ وہ اُردو کے علاوہ ہندی، گجراتی، پنجابی، مراٹھی، تلنگو وغیرہ دوسری علاقائی زبانوں میں نہایت زوروشور سے لکھی جارہی ہے۔ اچھی شاعری کی ایک پہچان یہ بھی ہے کہ وہ دل میں اتر جاتی ہے اور بہ آسانی زبان پر چڑھ جاتی ہے۔ اس معیار پر ایک اچھی غزل ہر لحاظ سے پوری اترتی ہے۔ اس کا ہر شعر اپنے دو مصرعوں میں انسانی جذبات اور احساسات کو انتہائی موثر اور دِل نشیں انداز میں ادا کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے وہی غزل کی ہر دلعزیزی کی ضامن بھی ہے۔

غزل کہنا خواہ کتنا ہی آسان سمجھ لیا جائے، اچھی غزل کہنا بہر کیف ایک نہایت مشکل کام ہے۔ اور عظیم غزل کہنا تو ہر دور میں صرف معدودے چند شعرا کے ہی حصہ میں آیا ہے۔ انہیں شعرا پر

بیشتر کتابیں اور مقالے لکھے گئے ہیں وہی تحقیق وتنقید، مباحثوں اور مناظروں کا موضوع رہے ہیں اور انہیں کے نام سے اُردو دنیا عموماً واقف و متعارف بھی ہے۔ باقی کے لاکھوں شعرا کو دنیائے ادب کی مختلف سطحوں پر اپنی شناخت اور تشخص قائم کرنے کے لیے ہمیشہ جدوجہد کرنی پڑی ہے۔ دورِ حاضر میں جب کہ انٹرنیٹ اور کمپیوٹر نے ادب وشعر اور درس وتدریس کا منظر نامہ ہی الٹ پلٹ کر رکھ دیا ہے یہ جدوجہد اور بھی بڑھ گئی ہے۔ مشاعرے، وسائل ابلاغ (اخبار ورسائل اور موجودہ زمانے میں ریڈیو اور ٹیلی وژن)، مناظرے اور مباحثے، گروہ بندی بشمول ادبی وغیر ادبی چشمک اور نعرہ بازی ہمیشہ اس جدوجہد کے عناصر خمسہ رہے ہیں۔ ان سے اچھے اور بُرے دونوں طرح کے نتائج زبان وادب پر مرتب ہوئے ہیں (اچھے کم اور بُرے زیادہ!) جن پر بحث کا یہ موقع نہیں ہے۔ ان عناصر خمسہ کو موثر طور پر استعمال کرنے اور ان کے نتائج سے مستفید ہونے کے لیے نہ صرف یہ ضروری ہے کہ کسی نہ کسی طرح شاعر کی ماہرانہ دسترس (بالواسطہ یا بلاواسطہ!) ان پر ہو بلکہ یہ ضروری ہے کہ وہ ان کے استعمال کے گُر اور ہتھکنڈے بھی جانتا ہو اور انہیں بے تکلف بر سر محفل بروئے کار لانے کے لیے آمادہ بھی ہو۔ خصوصاً آخری دو عناصر (یعنی گروہ بندی اور نعرے بازی!) کے استعمال میں جو حربے آزمانے پڑتے ہیں اور اس منزل ہفت خواں میں جو کچھ برداشت کرنا پڑتا ہے اس کے لیے کوئی شائستہ طبیعت کسی قیمت پر بھی تیار نہیں ہوتی ہے۔ ان سب باتوں سے قطع نظر اگر کوئی شاعر خاموش طبع اور فطری طور پر گوشہ نشینی سے آسودہ بھی ہو تو اس کی شناخت اور تشخص کا مسئلہ اور بھی مشکل ہو جاتا ہے پچھلی نسل کے رازؔ چاند پوری کا شمار اسی زمرہ میں ہوتا ہے۔ چنانچہ موصوف اپنے منفرد انداز فکر، دل نشیں طرز سخن، سنجیدہ اور معنی آفریں غزلیہ شاعری کے باوجود بچاس پچپن سال اُردو کی شعری وادبی خدمات میں گزارنے کے بعد تقریباً گمنامی کی زندگی گزار کر یہ کہتے ہوئے راہی، ملک عدم ہو گئے کہ:

سراپا سوز ہوں میں، ہم نوائے سازِ فطرت ہوں — تعجب ہے، مری آواز پہچانی نہیں جاتی!

ابوالفاضل محمد صادق رازؔ چاند پوری (تلمیذ مولانا عاشق حسین سیمابؔ اکبر آبادی)

ماضی قریب کے ایک صاحب طرز شاعر اور ادیب تھے۔ وہ اُس دور کے شاعر تھے جب اچھے شاعروں کی بہت بڑی تعداد بساط سخن پر موجود تھی۔ مشاعرے عام تھے اور بیشتر سامعین باذوق، باادب اور شاعری کے مختلف پہلوؤں سے تھوڑا بہت ضرور واقف تھے۔ اچھے شعر کی داد آج کل کی طرح تالیاں بجا کر نہیں بلکہ ''واہ، واہ! سبحان اللہ! کیا خوب کہا ہے آپ نے! مکرر ارشاد! ایک بار پھر عطا ہو'' کی شائستہ اور شستہ تکرار سے دی جاتی تھی۔ شاعر کمزور شعر سناتے ہوئے گھبراتے تھے کیونکہ محفل میں شعر شناس اصحاب کی کمی نہیں تھی۔ استادی اور شاگردی اپنی تمام خوبیوں اور خامیوں کے ساتھ زندہ تھی۔ غزل یا تو تحت اللفظ پڑھی جاتی تھی یا پھر شاعرانہ ترنم کے ساتھ۔ آج کی طرح فلمی دھنوں میں گلے بازی کا دُور دُور پتا نہیں تھا۔ رازؔ صاحب خاص خاص مشاعروں میں ہی شرکت کرتے تھے۔ اور تحت اللفظ پڑھنے میں اپنے منفرد انداز اور موثر ادائیگی کے لیے بہت مشہور تھے۔ اُنہوں نے اپنے پیچھے غزلیات، منظومات اور افسانوں پر مشتمل خاصہ بڑا سرمایہ چھوڑا ہے۔ جس کا بیشتر حصہ ہنوز محتاج اشاعت ہے اور شاید نہیں بلکہ یقیناً ہمیشہ ہی رہے گا۔ ان کی منتخب غزلیات کا ایک مجموعہ ''نوائے راز'' ۱۹۶۱ میں ادارہ انیس اردو، الہ آباد (ہندوستان) سے شائع ہوا تھا۔ راقم الحروف کے سامنے رازؔ کی غزلیات کا وہ مسودہ ''مصحف راز'' ہے۔ جس میں ''نوائے راز'' کی غزلیات کے علاوہ اُن کی ایسی بھی غزلیں شامل ہیں جن کو انہوں نے اپنی نگاہ انتقاد واحتساب کی ترازو میں تول کر اس قابل سمجھا تھا کہ وہ دنیائے اردو کے سامنے پیش کی جائیں۔ انہوں نے وہ غزلیں جو خود اُن کے معیار شعر پر پوری نہیں اُتریں ایک مختصر گلدستے ''سے باقی'' کے نام سے محفوظ کر دی تھیں۔ محتاط اور سنجیدہ شاعر اُس زمانے میں اپنے کلام پر انتقاد واحتساب خود ہی کر لیا کرتے تھے۔ ارباب دانش جانتے ہیں کہ یہ سلسلہ بہت پرانا ہے۔ مرزا غالبؔ نے بھی اپنا شروع کا کلام شائع نہیں ہونے دیا تھا۔ افسوس کہ اب نہ وہ لوگ ہیں اور نہ وہ ادب پروری۔ رہے نام اللہ کا!

رازؔ کے مجموعۂ غزلیات ''نوائے راز'' پر ہندوستان کے مشہور نقاد خلیل الرحمٰن اعظمی نے

جو دیباچہ لکھا ہے اس کا مندرجہ ذیل اقتباس اُن کی شاعری کو پرکھنے اور سمجھنے میں بہت معاون ہے:

''ہم کسی نئے غزل گو کی تعریف کرنا چاہیں گے تو اگر وہ جذبات کا شاعر ہے اور اس کے جذبات میں شدت ہے تو اسے ہم میرؔ کے قبیلہ کا شاعر کہیں گے۔ اس کے یہاں فکر کا عنصر ہے یا اس کے تخئلات میں پیچیدگی اور اشکال ہے تو اسے غالبؔ کی برادری میں شامل کریں گے۔ اگر معاملہ بندی اور چٹخارہ ہے تو جراتؔ اور داغؔ کے مماثل بتائیں گے۔ اگر استادی اور کرتب ہے تو ناسخؔ اور ذوقؔ یا اسی قبیل کے کسی استادِ فن سے اس کا سلسلۂ فکر ملائیں گے۔ بیسویں صدی میں ہم نے چند اور غزل گویوں کے سر پر عظمت کا تاج رکھا ہے مثلاً حسرتؔ، اصغرؔ، فانیؔ، اور جگرؔ۔ اب عام ناقدین نے اردو کے جدید غزل گو شاعر کو نوازنے کا یہ ڈھنگ نکالا ہے کہ اسے اچھا غزل گو اور جدید شاعر کہنے کے لیے انہیں عناصرِ اربعہ کے ساتھ رکھ کر دیکھنا اور کسی نہ کسی سے اس کی قسمت کا ستارہ وابستہ رکھنا ضروری سمجھا ہے۔ اس طرزِ تنقید اور تعارف سے ہمارے بعض قابلِ قدر شعراء اپنے نقادوں کے ہاتھوں اپنی شاعری کی خامیوں کے ساتھ اپنی خوبیوں پر بھی پردہ ڈالنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں اور اس طرح اپنے آپ یا اپنی شاعری کو زندہ رکھنے میں ناکام۔''

وہ آگے چل کے رازؔ کی شاعری کے بارے میں لکھتے ہیں کہ:

''اس طرح کی شاعری پر تنقید یا تعارف کے لیے غزلیہ شاعری کے عام معیاروں کو سامنے رکھنا کچھ زیادہ سودمند نہ ہوگا بلکہ میرا خیال ہے کہ اس نوع کے اصول برتنے والوں کے لیے یہ مجموعہ مایوس کن ثابت ہوگا۔ اگر عام تنقیدی اصولوں سے دامن چھڑا کر براہِ راست شاعر کے ساتھ ذہنی سفر کیا جائے تو ممکن ہے کہ اس مجموعہ میں بعض ایسی باتیں مل جائیں جو چاہے کسی اور شاعر کے یہاں نہ ہوں یا کسی اور کے یہاں محاسن کے طور پر موجود نہ ہوں لیکن وہی باتیں اس مجموعہ کی فضا کو ایک ایسا رنگ دیتی ہیں جو

میرے نزدیک بہت بڑی خوبی ہے۔"

ان اقتباسات سے معلوم ہوتا ہے کہ رازؔ کے کلام میں کچھ ایسی باتیں ہیں جو دوسرے شاعروں کے یہاں نہیں ہیں اور جو موصوف کی غزل کو ایک مخصوص رنگ سے مزین کرتی ہیں۔ رازؔ کی غزل کا سرسری مطالعہ ہی خلیل الرحمٰن اعظمی کی اس رائے کی تصدیق کے لیے کافی ہے لیکن اُن کے دیباچے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اُن کا اشارہ راز کی کون سی خوبی شعر کی جانب ہے اور وہ کیوں اس بات کے قائل ہیں کہ رازؔ کو سمجھنے اور ان کی غزل سے لطف اندوز ہونے کے لیے قاری کے لیے ضروری ہے کہ وہ شاعر کے ساتھ ایک ذہنی سفر کرے؟ خلیل الرحمٰن اعظمی کا یہ اجمال تھوڑی سی تفصیل کا متقاضی ہے۔

جس طرح رازؔ عام لوگوں سے اپنی فطرت الگ رکھتے تھے اسی طرح ان کی شاعری بھی عام شاعروں کے کلام سے الگ رنگ کی حامل ہے۔ موصوف کی زندگی آزمائشوں سے بھری ہوئی گزری تھی۔ زندگی کا شاید ہی کوئی لمحہ ایسا گزرا ہوگا جب وہ کسی نہ کسی مصیبت کا شکار نہ رہے ہوں۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے دکھ درد ان کی قسمت میں دوسروں سے کچھ زیادہ ہی لکھے ہوئے تھے۔ کچھ تو وہ فطری طور پر خاموشی پسند اور گوشہ نشین تھے اور کچھ زندگی کی متواتر ٹھوکروں اور مشکلات نے انہیں قنوطی بنا دیا تھا۔ چنانچہ ان کے دوست بہت کم تھے۔ اور جو تھے بھی ان میں ایک بڑی تعداد ہم خیال اور ہم مزاج شاعروں اور ادیبوں کی تھی۔ دشمن تو شاید ان کا کوئی تھا ہی نہیں۔ دنیا اور دنیا والوں کے بہت قریب جاتے ہوئے جیسے انہیں کچھ خوف سا آتا تھا چنانچہ انہوں نے کتابوں، رسالوں اور شاعری میں اپنی پناہ ڈھونڈ نکالی تھی۔ ممکن ہے کہ اسی وجہ سے بنیادی طور پر ایک غزل گو شاعر ہوتے ہوئے بھی انہوں نے اپنے کلام میں روایتی غزل کی شاہراہ عام سے الگ اپنا ایک مخصوص اور منفرد رنگ رکھنا پسند کیا اور تادم آخر اسی رنگ کو نبھاتے رہے۔ ان کے یہاں جذبات و احساسات کی صداقت بھی ہے اور زبان و بیان کی صلابت بھی جا بجا جلوہ ریز ہے مگر ان کی غزل میں جذبات اور ان کا بیان دونوں ایسی شدت سے پاک ہیں جو طبیعت میں تکدر یا انقباض پیدا

کرے۔ جس طرح وہ خود نرم مزاج، صلح جُو اور میانہ رَو تھے اسی طرح ان کی غزل بھی نرم، سلیس اور کم گو نظر آتی ہے۔ اُن کی غزل میں سادگی اور پرکاری بھی ہے اور کہیں کہیں پر شکوہ زبان و تراکیب بھی نظر آجاتی ہیں۔ زبان و بیان کی صفائی بھی ہے اور بندش و محاورہ، باکمال چستی، جذبات عالیہ اور فلسفہ و تصوف بھی ہے اور ایک عام آدمی کا دکھ درد بھی۔ لیکن ان سب اجزاء کی فراوانی کے باوجود رازؔ کی شاعری پڑھنے اور سمجھنے میں ایک عام قاری ایک تکلف سا محسوس کرتا ہے جیسے ذہنی طور پر شاعر کے نزدیک جائے بغیر اس کی شاعری سے مستفید ہونا مشکل ہو۔ رازؔ اپنے جذبات و احساسات کو ایک ایسے علَم یا پھریرے کی طرح استعمال نہیں کرتے ہیں۔ جو ان کے جذبات و خیالات کو محفل عام میں داد و تحسین کی خاطر پیش کرے، بلکہ ان کی غزل پڑھ کر قاری اکثر یہ محسوس کرتا ہے کہ بات ابھی مکمل نہیں ہوئی ہے ہر چند کہ شعر پورا ہو گیا ہے پوری بات سمجھنے کے لیے شاید بین السطور دیکھنے اور سمجھنے کی ابھی ضرورت ہے۔ پھر جب وہ فکر کرتا ہے تو اس پر رازؔ کی غزل کچھ ایسے رازؔ افشا کرتی ہے جو بیک نظر واضح نہیں ہوئے تھے۔ جو لوگ اُردو غزل میں عام اور مروجہ مضامین کو دیکھنے کے عادی ہیں اُن کو بھی رازؔ کی غزل میں اپنے مطلب کا سامان فکر مل جاتا ہے۔ مثلاً اگر تصوف اور معرفت کی جانب کسی کا رجحان ہو تو اسے بہت سے اشعار اس قبیل کے مل جائیں گے۔

میں کون ہوں، کس جگہ ہوں، کیا ہوں رہ رہ کے یہ دل سے پوچھتا ہوں
مظہر ہوں کسی کے حسن کا میں جلووں کا کسی کے آئینا ہوں
ہے کوئی یہاں نگاہ والا؟ بندہ ہوں مگر خدا نما ہوں

کوئی اگر معاملہ بندی اور راز و نیاز کا شائق ہے تو وہ رازؔ کے سیدھے سادے لیکن نہایت معنی آفریں اشعار کی زبانی حسن و عشق کی داستان سن سکتا ہے۔

نگاہ ناز جو ہنگامہ ساز ہو جائے تو شوق و آز میں کچھ امتیاز ہو جائے
نیاز عشق میں اتنا کمال پیدا کر کہ ناز حسن سراپا نیاز ہو جائے

افسانہ بن نہ جائے کہیں بات راز کی یوں مختصر حکایت ناز و نیاز کی

اسی طرح راز کے وہ اشعار اپنا جواب آپ ہیں جو چند الفاظ میں دل کو خدا جانے کیا کیا سنا جاتے ہیں۔

ہائے وہ میری آخری حسرت دل سے نکلی تھی جو دُعا ہو کر

دے سکتا ہو تو دے مجھے دادِ ستم کشی یا وہ سلوک کر کہ عداوت کہیں جسے

تصویرِ جہاں میں رنگ بھرنا تخلیقِ جہاں سے کم نہیں ہے

یہ ظاہر ہے کہ تقریباً ہر اچھے شاعر کی غزلوں میں تلاش کر کے مختلف موضوعات پر اچھے اور پُر اثر اشعار نکالے جا سکتے ہیں۔ یہ ضروری نہیں ہے کہ یہ منتخب اشعار اُس شاعر کی شاعرانہ صلاحیت اور مہارت پر حرفِ آخر کا حکم رکھتے ہوں یا اس کے کلام کی انفرادیت کے ضامن ٹھہرائے جا سکیں۔ راز بھی اس صورتِ حال پر پورا اترتے ہیں۔ یہ ضرور ہے کہ ان کا اندازِ سخن راہ عام سے نہایت مختلف ہے اور شاید اسی لئے خلیل الرحمٰن اعظمی نے کہا ہے کہ غزل گوئی کے عام معیاروں کو سامنے رکھ کر راز کی شاعری کو پرکھنا زیادہ سود مند ثابت نہیں ہو سکتا ہے۔ درحقیقت راز کی غزل کی انفرادیت کا مدار ان کے کلام کی ایک ایسی خصوصیت پر ہے جو عام طور پر نظر نہیں آتی ہے۔ ہم اسے ایسے التزامات سے تعبیر کر سکتے ہیں جو راز نے حیرت انگیز نظم و ضبط اور شاعرانہ کمال کے ساتھ اپنی غزلوں میں برتے ہیں اور اس خوبصورتی سے کھپائے ہیں کہ وہ بہ یک نظر ہمیں دکھائی نہیں دیتے ہیں۔ یہی التزامات اُن کے غزل کی دیگر خصوصیات کے ساتھ مل کر ان کے کلام کو ایک نہایت دلکش فضا عطا کرتے ہیں اور اُسے شعری طور پر بھی بہت بلند بنا دیتے ہیں۔ مختصراً راز کی شاعری کے ان التزامات کو یہاں بیان کرنا دلچسپی سے خالی نہیں ہے۔

(ا) راز نے اپنے پیچھے کئی ہزار غزلیہ اشعار کا اثاثہ چھوڑا ہے۔ قاری کو اس کے مطالعہ پر یہ انکشاف حیرت میں ڈال دیتا ہے کہ انہوں نے اپنے پورے غزلیہ کلام میں صیغہء جمع متکلم (ہم، ہمارے، ہمیں، ہم سے وغیرہ) سے مکمل اجتناب برتا ہے اور انتہائی پابندی سے صرف صیغہء واحد

متکلم (میں، مجھے، مجھ کو، میرے لئے وغیرہ) کو اپنے جذبات وخیالات واحساسات کی ترجمانی کے لئے استعمال کیا ہے۔ راقم الحروف کے علم کی حد تک کسی اور شاعر نے اردو شاعری کی پوری تاریخ میں اس شدت، پابندی اور اہتمام سے ایسا کوئی التزام نہیں برتا ہے۔ رازؔ نہایت غیور اور خود دار شخصیت کے مالک تھے۔ زندگی بھر انہوں نے حالات وحوادث کی قیامت خیز ٹھوکریں کھائیں لیکن حرف شکایت لبوں تک نہیں آنے دیا اور سخت سے سخت حالات میں بھی کسی کے سامنے دست طلب دراز نہیں کیا۔ وہ مرزا غالبؔ کے اس شعر کی جیتی جاگتی تصویر تھے:

اپنی ہستی ہی سے ہو جو کچھ ہو   آگہی گر نہیں، غفلت ہی سہی

پچاس پچپن سال شاعری کرنا اور مذکورہ بالا التزام کے ساتھ کرنا جس درجہ کی ثابت قدمی، استقلال اور خود اعتمادی کا متقاضی ہے وہ اہل نظر پر بخوبی ظاہر ہے۔ اس منزل کو پہنچ کر رازؔ کی شاعری ان کی شخصیت اور کردار کی عکاس ہو جاتی ہے۔ جس رازؔ نے زندگی بھر کسی دوسرے کا احسان برداشت نہیں کیا وہ اپنی شاعری میں بھی خود کو کسی اور کا مرہون منت کرنے پر تیار نہیں ہے کیونکہ ایسا کرنا خود اپنی شخصیت کی نفی کے مترادف ہے۔ چنانچہ رازؔ کے مذکورہ التزام کی وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ ''ہم، ہمارے، ہمیں'' اور ایسے ہی دوسرے الفاظ سے اظہار خیال میں جو ایک طرح کی عمومیت پیدا ہو جاتی ہے اس کے لئے رازؔ قطعاً تیار نہیں ہیں اور اپنے خیالات اور جذبات کو ایک شخص واحد (یعنی رازؔ) سے بلا شرکت غیرے وابستہ کرنا ہی مستحسن سمجھتے ہیں۔ وہ اپنی زندگی کی طرح اپنی شاعری میں بھی آزاد اور خود مختار رہتے ہیں اور اس کے حسن وقبح کے خود ہی ذمہ دار اور ضامن ہیں۔ بقول غالب:

بندگی میں بھی وہ آزادہ وخود بیں ہیں کہ ہم   اُلٹے پھر آئے، درِ کعبہ اگر وا نہ ہوا

(۲) غزل کے چند روایتی مضامین ایسے ہیں جن سے تقریباً ہر غزل گو نہ صرف واقف ہے بلکہ وہ اپنی شعر گوئی میں ان سے دامن نہیں چھڑا سکا ہے۔ یہ بہت اعتماد اور وثوق سے کہا جا سکتا ہے کہ یہ مضامین اب غزل کی شناخت بن چکے ہیں۔ عاشقی کی داستانیں، ہجر ووصال کے قصے، گل وبلبل کی فرضی کہانی، عاشق کی افسانوی نامرادی اور معشوقہ کی بیشتر خود ساختہ بے نیازی اور ستم

کیشی، بہار و خزاں، آشیاں اور صیاد کی روداد، خمریات پر اتنا زورِ قلم کہ ہر شاعر اپنے زمانے کا ''استاد شرابی'' نظر آئے وغیرہ وہ مضامین ہیں جو ہر شاعر (الا ماشاء اللہ!) کے یہاں رنگ بدل بدل کر وارد ہوتے ہیں اور بعض اوقات طبیعت کو منغض کر دیتے ہیں۔ استادِ سخن قلندر بخش جرأت کی وہ شاعری جس کو خدائے سخن میر تقی میرؔ نے ''چوما چاٹی'' سے تعبیر کیا ہے اسی قسم کی شاعری کی بگڑی ہوئی شکل ہے۔ رازؔ نے اپنی شاعری کے اوئل ہی میں سمجھ لیا تھا کہ ایسی شاعری سے کچھ حاصل نہیں ہوگا جو ان کی غزل گوئی کو انفرادی رنگ و بو سے ناآشنا کر دے اور پھر ہمیشہ ناآشنا ہی رکھے۔ ویسے بھی وہ فطری طور پر معاملاتِ عشق سے متنفر تھے۔ اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ وہ عشق و محبت کے قائل ہی نہیں تھے بلکہ یہ کہنا مقصود ہے کہ وہ عشق کے اظہار کو بھی اپنی زبان کی شائستگی اور شرافت نیز اپنے بیان کے صدق و خلوص کے پردے میں رکھنا بہتر سمجھتے تھے۔ یہ ایک طرف ان کی شخصیت اور سنجیدہ خیالی کا اظہار یہ تھا اور دوسری طرف اس تہذیب و تمدن کا اعتراف بھی تھا جس کے خمیر سے اُن کی ذات و صفات اٹھی تھیں۔ چنانچہ رازؔ نے اپنی غزل میں عاشقانہ مضامین کے بے محابہ اظہار سے بھی تقریباً مکمل احتراز برتا ہے، اور اگر کہیں بھولے بھٹکے ایسے مضامین نظم بھی کیے ہیں تو وہ ان کی شاعری کے مخصوص فکر و بیان کی آنچ میں تپ کر ایک نئے اور بالکل ہی نئے روپ میں ڈھل گئے ہیں۔ چند مثالیں یہاں پیش کی جاتی ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ رازؔ کی غزل گوئی روایتی رنگ سے اتنی دور ہے کہ اس میں نازِ حسن اور نیازِ عشق بھی چولا بدل کر ظاہر ہوتے ہیں۔ جہاں روایتی غزل میں عشق مجبور و ناچار ہوتا ہے اور عاشق ہر قدم پر محبوب کے سامنے سرِ تسلیم خم کرنے کو اپنے جذبہ عشق کی معراج سمجھتا ہے وہاں رازؔ یہ کہتے ہوئے نظر آتے ہیں:

نیاز و ناز میں کچھ امتیاز رہنے دے ۔۔۔ رخِ جمیل پہ رنگِ مجاز رہنے دے

نیازِ عشق میں اتنا کمال پیدا کر ۔۔۔ کہ نازِ حسن سراپا نیاز ہو جائے

کیا حسیں اور نہیں کوئی زمانہ بھر میں؟ ۔۔۔ لیکن اے دوست! مرا حسنِ نظر عام نہیں

ایک غزل گو کی حیثیت سے رازؔ حسن و عشق کے معاملات کو یکسر نظر انداز نہیں کر سکتے

تھے لیکن ان کے یہاں محبت بھی ایک ذاتی اور شخصی سطح سے بلند ہو کر ایک کائناتی رنگ دھار لیتی ہے اور اس منزل پر پہنچ کر ان کو محبت اور عبادت میں کوئی فرق نظر نہیں آتا ہے۔ ایسی محبت کے لئے جو عبادت بن جائے ان کی شاعرانہ فکر میں عشق حقیقی اور عشق مجازی میں کوئی فرق نہیں رہ جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ رازؔ کی غزل عشق و محبت سے تو یقیناً آشنا ہے لیکن غزل میں محبت کی جو مصنوعی صورت گری کی گئی ہے اور جس طرح محبوبہ کو اپنے ہر خیال اور جذبے کا مرکز قرار دے دیا گیا ہے اس طرز فکر و بیاں کو رازؔ قابل اعتنا نہیں سمجھتے ہیں۔ اگر کہیں انہوں نے حسن و عشق سے متعلق کوئی مضمون باندھا بھی ہے تو وہ ان کے مخصوص انداز فکر و بیاں کی آنچ میں پک کر اپنی مروجہ شکل اور کردار کھو بیٹھا ہے اور ایک نئی اور دل سوز اثر پذیری کے ساتھ ان کی غزل میں ظاہر ہوا ہے۔ ان کے یہاں ہجر و وصال، عشق میں گریہ وزاری، محبوبہ کی بے نیازی اور ستم پیشہ طبیعت کا گلہ اور اسی قبیل کے دوسرے معاملات کا ذکر "بقدر بادام" بھی نہیں ہے۔ رازؔ کے نزدیک محبت میں گریہ وزاری اور سینہ کوبی کی کوئی اہمیت نہیں ہے اور اگر وہ بھولے بھٹکے وہ اس منزل سے گزرتے بھی ہیں تو اس انداز سے گویا ہجر و فراق ایسی مصیبتیں نہیں ہیں جن پر زمین و آسمان سر پر اٹھا لئے جائیں۔ دیکھئے کہ وہ کس انداز میں ایسے مضامین سے عہدہ برآ ہوتے ہیں اور درج ذیل اشعار کس طرح ان کی ترجمانی کرتے ہیں:

وہ درد دل میں ہے کہ محبت کہیں جسے اک خانماں خراب کی دولت کہیں جسے
یا وہ سلوک کر کہ عداوت کہیں جسے دے سکتا ہو تو دے مجھے داد ستم کشی
اتنا تو ہو نہ شور قیامت کہیں جسے درد فراق یار کی مجبوریاں بجا

حریفِ درد جدائی، خیال یار ہوا یہ رازِ حسن و محبت ہے، کیا کہوں اے رازؔ

یہ بات بھی ہر ایک کو حاصل نہیں ہوتی ناکام محبت ہوں میں اے رازؔ تو کیا غم
کبھی کافر، کبھی حق آشنا معلوم ہوتی ہے محبت کیا ہے؟ نیرنگی ہے اک حسن طبیعت کی
کہ ذرہ ذرہ مسافر نواز ہوتا ہے رہ طلب میں تلاش رفیق کیا اے رازؔ

طے کر چکا ہوں راہ محبت کے مرحلے اس سے زیادہ حاجت شرح و بیاں نہیں

مراذوق پرستش ہے جدا سارے زمانہ سے محبت کرتا جاتا ہوں، عبادت ہوتی جاتی ہے

(۳) رازؔ کی انفرادیت کی بنیاد ان کی اس فکر پر ہے کہ وہ زندگی ہو یا شاعری، راہ عام سے ہٹ کر اپنی ایک الگ راہ نکالنا مستحسن بھی ہے اور ضروری بھی۔ اگر ایسا نہ کیا جائے تو عام زندگی اور شاعری دونوں میں انسان اپنی شناخت اور تشخص سے محروم رہ جاتا ہے۔ جہاں تک شاعری کا تعلق ہے، اردو تو وہ زبان ہے جس کی تاریخ کے ہر دور میں بلا مبالغہ لاکھوں شاعر غزل سرا رہے ہیں۔ دنیا کی کسی زبان میں بھی اتنی کثیر تعداد میں کبھی شاعر نہیں گزرے ہیں جتنے صرف غزل گو شاعر اردو میں موجود رہے ہیں اور آج بھی ہیں۔ بے شمار شاعروں کی اس عام بھیڑ میں ایک اور شاعرانہ اضافہ اسی وقت معنی رکھتا ہے جب شاعر اپنے فکر و فن میں کسی قسم کی اپج، تنوع یا انفرادیت کا مظاہرہ کر سکے۔ چنانچہ رازؔ "تقلید مزاج عام" کے بالکل قائل نہیں ہیں اور اپنا مقام الگ بنانا ان کا مسلک و مذہب ہے۔ چنانچہ ایک جگہ کہتے ہیں کہ

رازؔ! تقلید مزاج عام مستحسن نہیں فطرت شاعر کو تو آزاد ہونا چاہیے

اسی طرز کا یہ نتیجہ ہے کہ وہ جس موضوع پر بھی طبع آزمائی کرتے ہیں اس کو اپنے منفرد رنگ و آہنگ سے ایک نئی یا کم از کم مختلف اور منفرد شکل سے آراستہ کر دیتے ہیں۔ اس سے ایک مشکل یہ پیدا ہو گئی ہے کہ "تقلید مزاج عام" سے اجتناب کی وجہ سے ان کی شاعری عوام کی انجمن سے نکل کر بزم خواص میں پہنچ جاتی ہے، یعنی اس سے پوری طرح سے لطف اندوز ہونے کے لئے ہمیں ان ظروف اور پیمانوں کو ترک کرنا پڑتا ہے جو روایتی شاعری کے مطالعہ میں عموماً استعمال ہوتے ہیں اور ایک ایسا نیا طرز افہام و تفہیم اختیار کرنا پڑتا ہے جس سے رازؔ کی غزل گوئی کے راز ہائے سربستہ ہمارے ذہن و دل پر فاش ہو سکیں۔ خود رازؔ اس نتیجہ سے یکسر بے نیاز نظر آتے ہیں۔ انہیں کبھی اس کا گلہ نہیں رہا کہ انہیں عام شاعروں کی سی داد کیوں نہیں ملی۔ وہ ایسے شاعروں کی داد سے ہی مطمئن رہے جو ان کی فکر سے ہم آہنگ تھے، انہیں سمجھتے تھے اور لطف اندوز و مستفید ہوتے

تھے۔انہیں اسباب کی بنا پر خلیل الرحمٰن اعظمی ''نوائے راز'' پر تبصرہ کرتے ہوئے ایک جگہ رقم طراز ہیں کہ:

''سب سے پہلی بات جو مجھے رازؔ کی شاعری میں نظر آتی ہے وہ یہ ہے کہ اس میں شدت یا تلخی نہیں ہے۔ شاعر کے یہاں محسوسات بھی ہیں اور تجربات بھی، غم اور افسردگی بھی، ناکامی اور نامرادی کے لمحے بھی ہیں، لیکن ان کو شاعر نے ہضم کرنے کے بعد اس طرح پیش کیا ہے کہ یہ شدت ایک خوشگوار اعتدال میں تبدیل ہوگئی ہے اور زہر کی تلخی امرت رس معلوم ہونے لگتی ہے۔ دوسری اہم بات جو اس مجموعے سے معلوم ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ کسی شعر کو پڑھنے کے بعد ہم پر یہ تاثر نہیں ہوتا کہ شاعر عام آدمیوں سے علیحدہ کوئی مخلوق ہے یا اس کی شخصیت کچھ مافوق الفطرت، عجیب وغریب یا اُس کے تجربات کچھ اس طرح کے ہیں جن سے ہم غیر معمولی طور پر مرعوب یا بھوچکے ہو جائیں اور اس کی بنا پر 'واہ' کہہ دیں۔ رازؔ کی شاعری ایک نارمل اور عام انسان کے دکھ درد، مسرت و انبساط اور اس کی آرزوؤں اور خوابوں کا نارمل اور سادہ سا اظہار ہے۔ اسی لئے اس میں رنگینی، سرشاری، ربودگی، اُڑان، فلسفیانہ فکر، پیچیدگی اور بہت سے ایسے عناصر نہیں ملیں گے جو عام اُردو غزل گویوں کا طرۂ امتیاز ہیں۔ لیکن یہ بات بھی قابل غور ہے کہ کبھی کبھی ہم اِنہیں محاسن سے اس لئے چونک اُٹھتے ہیں کہ ہم اپنی عام زندگی کو ان سے ہم آہنگ نہیں پاتے اور اس وقت یہ احساس ہوتا ہے کہ شاید شاعری چند بندگان خدا کے لئے مخصوص ہے اور اِنہیں کی زندگی کی ترجمان ہے اور اس سے لطف اندوز ہونے کے لئے بھی خاص خاص لمحات درکار ہیں''۔

رازؔ کے کلام کے مطالعہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس کے اکثر و بیشتر محرکات داخلی ہیں۔ وہ جو محسوس کرتے ہیں اسے سادہ الفاظ میں بیان کر دیتے ہیں۔ اس حال میں ذاتی غم اور دوسروں کے غم کی درمیانی دیوار منہدم ہو جاتی ہے اور وہ دنیا کے غم کو بھی اپنا غم بنا کر سب کے سامنے پیش کر

دیتے ہیں۔ جذبہ اور بیان کا یہ خلوص رازؔ کی غزلیہ شاعری کے نہایت نمایاں عناصر ہیں۔ ان کی غزلوں میں ایسے اشعار خصوصی توجہ کے طالب و مستحق ہیں جن میں انہوں نے خمریات پر اظہار خیال کیا ہے۔ مرزا غالبؔ نے جب کہا تھا کہ:

ہر چند ہو مشاہدۂ حق کی گفتگو
بنتی نہیں ہے بادہ و ساغر کہے بغیر

تو انہوں نے ایک ایسی لطیف حقیقت کی جانب اشارہ کیا تھا جس نے اردو غزل میں ہمیشہ جادو جگائے ہیں۔ اردو غزل کا ایک دلکش حصہ جام و مینا، ساقی و میخانہ اور کیف و سرور سے وابستہ ہے اور ہر قاری اپنی بساط اور فکر کی حد تک اس سے محفوظ و مستفید ہوتا ہے۔ کوئی اس بابِ غزل کو حقیقت کے رنگ میں دیکھتا ہے اور کوئی مجاز کی صورت میں اسے سمجھتا ہے۔ رازؔ بھی غزل گوئی کے اس کوچہ سے نا آشنا نہیں ہیں اور ہو بھی نہیں سکتے تھے۔ لیکن وہ اس شراب سے قطعی ناواقف معلوم ہوتے ہیں جو غزل کے ساتھ ساتھ شاعر اور اس کے قاری کو بہکنے اور بہکانے کے ہزار بہانے فراہم کرتی ہے۔ ایک آدھ جگہ وہ یہ ضرور کہتے ہوئے نظر آتے ہیں کہ:

فکرِ دنیا جاں گسل تھی، فکرِ عقبیٰ دل خراش
میں نے اِن دونوں کو نذرِ جام و مینا کر دیا

انتہائے میکشی میں ہوشیاری بڑھ گئی
ابتدا میں تو یہ کیفیت مجھے حاصل نہ تھی

کرنا تھا کچھ نہ کچھ جو علاج خودی مجھے
سیدھی سی بات، بادہ کشی اختیار کی

اور پھر یہ کہہ کر اپنی راہ پر آجاتے ہیں:

رندی ہے اساس پارسائی
پینے سے پھر احتراز کیا ہے؟

رازؔ کے ان چند اشعار کا رنگ بھی خمریات کی اس شاعری سے بہت مختلف ہے جو عام طور سے اُردو غزل میں ہمیں نظر آتی ہے۔ علاوہ ازیں یہ سب کچھ کہنے کے بعد وہ فوراً ہی اس ''شرابِ نابِ الفت'' کے گُن گانے لگتے ہیں جو ان کو بہت عزیز ہے اور جو اپنی مستی اور سرخوشی میں محبت اور عرفانِ حقیقت کا رنگ لئے ہوئے ہے، ان کا ساقی بھی مختلف ہے اور ان کے ساغر، سبو اور

مینا بھی سب سے الگ ہیں۔ وہ خمریات میں بھی اپنی بات اپنے رنگ میں کہنا پسند کرتے ہیں:

ازل سے راز مخمور شراب ناب الفت ہوں — مری بادہ پرستی بھی دلیل حق پرستی ہے

ساقی کی ایک بات ہے تفسیر کائنات — تُو کم نظر نہیں تو کوئی کم نظر نہیں

مست مے عرفاں ہوں، ساقی کا یہ احساں ہے — اب میں بھی مسلماں ہوں، دنیا بھی مسلماں ہے

ہر جام پر ہے راز یہاں خوف احتساب — کیوں آ گیا تُو میکدۂ اختیار میں؟

ان اشعار میں راز کا اپنا مخصوص رنگ تغزل کارفرما نظر آتا ہے۔ راز کے اشعار کے مطالعہ سے ان کے اس دلی کرب اور ذہنی اضطراب کی خبر بھی ملتی ہے جو زندگی بھر ان کا مقدر بنے رہے۔ ان کی ساری زندگی پریشانیوں اور مصیبتوں میں ہی گزری تھی اور آلام روزگار سے لے کر آلام زندگی تک ہر آزمائش نے ان کو کبھی چین سے نہیں بیٹھنے دیا اور آخری عمر میں ان کی کمر ہمت بالکل ہی توڑ کر رکھ دی تھی۔ ہر چند کہ وہ کبھی شکایت نہیں کرتے تھے لیکن بہر حال ایک انسان تھے لہٰذا ان کے دل کا درد کسی نہ کسی صورت سے ظاہر ہو ہی جاتا تھا۔ ایک حسّاس اور صاحب دل شاعر کی حیثیت سے بھی یہ ناممکن تھا کہ ان کی شاعری ان کے حالات سے بیگانہ رہتی چنانچہ جابجا ان کا غم ان کے شعروں میں بھی نمایاں ہو گیا ہے۔ یہ ہر انسان کا مقدر ہے۔ دنیا میں کون سا ایسا شخص ہے جو غم و رنج سے آزاد رہ سکا ہے؟ جبھی تو غالب نے کہا تھا کہ:

قید حیات و بند غم اصل میں دونوں ایک ہیں — موت سے پہلے آدمی غم سے نجات پائے کیوں

پھر راز اس اصول فطرت سے کیوں کر مستثنیٰ رہ سکتے تھے؟ "غم حبیب، غم آرزو، غم دنیا" کی یورشوں سے تنگ دل و عاجز آ کر وہ گوشہ نشین ضرور ہو گئے تھے لیکن دنیا سے یکسر دامن چھڑانا ان کے لئے بھی ممکن نہیں تھا۔ دنیا بہر حال دنیا اور اپنا خراج ہر شخص سے وصول کرتی رہتی ہے۔ چنانچہ ان کے کلام میں آلام روزگار، زندگی کے غم اور رنج اور اپنوں بیگانوں کی شکایت کا ذکر بھی ملتا ہے۔ ایسے اشعار میں یاس و بیکسی اور حزن و ملال کا رنگ بہت نمایاں ہے مگر یہاں بھی ان کا منفرد انداز فکر

انہیں دنیا سے الگ شکل اور خصوصیات سے متصف کرتا ہے۔ ان کے یہاں وہ شدت کرب نظر نہیں آتی ہے جو فانی بدایونی کے اشعار میں ملتی ہے لیکن اس کے ساتھ ہی یہ بھی ہے کہ راز کے شعر پڑھ کر کبھی ذہن و دل میں انقباض و تکدر پیدا نہیں ہوتا ہے۔ ان کا غم بھی ان کی نرم گفتاری میں رنگ کر قابل برداشت ہو جاتا ہے:

مرے حصہ میں فطرت نے بہار جاوداں رکھ دی
جفائے باغباں رکھ دی، بلائے آسماں رکھ دی

عالم اب اور ہے مری بزم خیال کا
غم ہائے روزگار نے انساں بنا دیا

نگاہ مہر کا اب مجھ کو اعتبار نہیں
فریب خوردۂ حسن خلوص ہوں اے راز

کہ اپنوں کا ستم بہتر ہے غیروں کی عنایت سے
کوئی سمجھے نہ سمجھے خیر، لیکن واقعہ یہ ہے

بڑی مشکل سے کوئی آشنائے راز ہوتا ہے
ہزاروں جام ہائے تلخ و شیریں پینے پڑتے ہیں

لیکن جس دنیا میں ہر شخص ہی رنج آشنا ہو وہاں کسی کے غم میں کوئی کب تک شریک رہ سکتا ہے؟ انسان یوں بھی بنیادی طور پر خود غرض واقع ہوا ہے۔ لہٰذا راز آخر کار یہ کہہ کر خاموش ہو جاتے ہیں:

کھل گئی دہر کی حقیقت کیا؟
راز سب سے ہوا ہے بیگانہ

دیکھا گیا ہے کہ اہل دل اکثر دنیا سے گھبرا کر تصوف اور معرفت کی جانب رُخ کرتے ہیں۔ کچھ اس میں ڈوب جاتے ہیں اور پھر وہیں کے ہو کر رہ جاتے ہیں اور کچھ واپس دنیا میں آجاتے ہیں۔ تصوف یقیناً دلچسپی کا سامان اپنے دامن میں رکھتا ہے لیکن ایک تو یہ سب کے بس کی بات نہیں ہے اور دوسرے یہ کہ دنیا کی اور باتوں کی طرح تصوف بھی اب محض تجارت اور کاروبار بن گیا ہے جس سے دور ہی رہنا بہتر ہے۔ ناسازگار زندگی اور حساس طبیعت نے راز کو بھی ایک زمانہ میں تصوف کی جانب مائل کر دیا تھا اور انہوں نے ایک مدت تک اس دلچسپ کوچہ کی عملی و نظری خاک چھانی تھی۔ پڑھنے کا تو انہیں یوں بھی بہت شوق تھا لیکن عملی طور پر کسی کے دست مبارک پر بیعت کر کے تعلیم لینا آسان نہیں ہے۔ راز نے اس کی بھی کوشش کی۔ انہیں شاید کوچۂ

تصوف میں وہ گوہر نایاب ہاتھ نہیں آیا جس کی ان کو تلاش تھی، چنانچہ وہ ہار کر ایک عام آدمی کی دنیا میں دوبارہ واپس آ گئے تھے، البتہ ان کی زندگی اور شاعری دونوں پر اس دور کا اثر تاعمر باقی رہا۔ ان کی غزلوں میں جس کثرت سے فطرت و کائنات، خودی و بیخودی، تدبیر و تقدیر اور ایسے ہی دوسرے مضامین پر اشعار ملتے ہیں اس سے ان کی فکر و نظر اور مشاہدہ کی گہرائی کا اندازہ آسانی سے ہو سکتا ہے۔ چند مثالیں پیش خدمت ہیں:

اپنی تلاش گویا اُس کی ہی جستجو ہے — جو خود کو ڈھونڈتا ہے، وہ اُس کو ڈھونڈتا ہے

اب یہ عالم ہے میری حیرت کا — آئینہ ہوں جمال فطرت کا

پابندیوں کی حد میں ہی آزاد ہم ہیں رازؔ — آگے قدم بڑھے کہ گرفتار ہو گئے

خودی اور بیخودی میں صرف اتنا سا تفاوت ہے — یہاں پر باخبر رہنا، یہاں سے بے خبر جانا

جب بگڑتی ہوئی دیکھی کوئی تدبیر خرد — کر دیا دفتر تقدیر میں شامل میں نے

رازؔ خالق کائنات کو مظاہر فطرت میں ہی دیکھتے ہیں اور تمام عالم کو اسی کا نگار خانہ جان کر عرفان الٰہی کی منزلوں کو پہنچتے ہیں۔ ان کے نزدیک جب آدمی اپنی ذات سے بیگانہ ہو جاتا ہے تو اس کے لئے خدا کو پہچاننا نسبتاً آسان ہو جاتا ہے۔ ان کے یہاں خود پرستی اور حق پرستی میں کوئی زیادہ فرق نہیں ہے۔ یہ خود پرستی کسی انسانی خود غرضی کی زائیدہ نہیں ہے بلکہ یہ وہی خود پرستی ہے جو ہر منصورؔ کو دار و رسن کی جان لیوا راہ سے عرفان حق تک لے جاتی ہے:

میں کیا کہوں کہ حقیقت تھی یا فسانہ تھا — مری نگاہ میں عالم نگار خانہ تھا

ہر ایک کے پردے سے آواز تری آئی — جس ساز کو بھی چھیڑا جلوہ گہ فطرت میں

مری فطرت حقیقت آشنا معلوم ہوتی ہے — نظر پڑتی ہے جس شے پر، خدا معلوم ہوتی ہے

پردہ جو خودی کا اٹھ گیا ہے — ذرہ ذرہ اک آئینہ ہے

تدبیر نہ بن سکی جو تقدیر
معلوم ہوا کوئی خدا ہے

خود پرستی حق پرستی ہے بہ شکل اجتہاد
سرحد تقلید سے آگے ہے بت خانہ مرا

انا الحق کہنے والے تو بہت ہوتے ہیں دنیا میں
مگر ان میں کوئی اک آدھ ہی منصور ہوتا ہے

مظہر ہوں کسی کے حسن کا میں
جلووں کا کسی کے آئینہ ہوں

ہے کوئی نگاہ والا؟
بندہ ہوں مگر خدانما ہوں

یہی انفرادیتِ فکر و نظر ہے جو رازؔ کو دوسرے شاعروں سے ممتاز کرتی ہے۔ ان کی یہ خصوصیت چھوٹی بحر کی غزلیات میں بہت نمایاں ہے۔ چھوٹی بحروں میں اچھی غزل کہنا ایک نہایت ہی مشکل فن ہے۔ مناسب الفاظ وتراکیب کا استعمال، بندش کی چستی، اور زبان و بیان کی نزاکتوں پر اگر ماہرانہ عبور نہ ہو تو چھوٹی بحروں میں کہی ہوئی غزل اثر پذیری، تغزل اور گرمی جذبات سے بے بہرہ ہو کر رہ جاتی ہے۔ چند الفاظ میں غزل کی جملہ پابندیوں اور تقاضوں کے احترام کو ملحوظ رکھتے ہوئے خیال و جذبہ کا موثر اظہار آسان نہیں ہے۔ سہل ممتنع چھوٹی بحروں سے ہی وابستہ ہے۔ کتنے ہی شاعروں کے اشعار بلکہ پورے دیوان مومنؔ کے اس شعر کے سامنے نہیں ٹھہر سکیں گے جس پر غالب ایسا باکمال و بے مثال شاعر اپنا پورا دیوان قربان کرنے کو تیار تھا:

تم مرے پاس ہوتے ہو گویا
جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا

رازؔ کو چھوٹی بحروں میں غزل گوئی کا نہ صرف شوق ہی ہے بلکہ انہیں اس فن میں ملکہ بھی حاصل ہے۔ ممکن ہے کہ ان کی خاموش طبعی، گوشہ نشینی اور کم گفتاری کو اس صورتحال میں دخل ہو۔ یہ امر قرین قیاس ہے کہ جو شخص اپنی فطرت میں کم گو ہو، اور طویل گفتگو اور دنیاوی محفلوں سے گریز کرتا ہو وہ شاعری میں بھی اپنی بات مختصر الفاظ میں ہی بیان کرنا پسند کرے گا۔ رازؔ کی چھوٹی بحروں کی غزلیات جذبہ کی صداقت اور اثر پذیری، سادگی اور پرکاری اور زبان و بیان کی شائستگی کے بہت ہی خوبصورت نمونے پیش کرتی ہیں۔ ان میں ناکامی اور نامرادی، یاس وحرماں اور غم دنیا و غم زندگی کی

عکاسی نہایت نمایاں ہے۔ ان کے یہ اشعار پڑھ کر بے اختیار قاری کے دل سے آواز نکلتی ہے کہ

دیکھنا تقریر کی لذت کو جو اس نے کہا
میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے

(غالب)

یہی وجہ ہے کہ راز کی چھوٹی بحر کی غزلیں قاری کے دل کے تاروں کو چھیڑ جاتی ہیں۔ ایسی غزلوں کے چند اشعار دیکھئے:

ہائے وہ میری آخری حسرت
دل سے نکلی تھی جو دعا ہو کر

یک بیک ہو گیا یہ کیا مجھ کو؟
کیا بتاؤں کہ آ گیا کیا یاد

جانتا ہوں بتا نہیں سکتا
کیسے دنیائے دل ہوئی برباد

سرگرم سخن ہوں میں کسی سے
دنیا ہے اسیر بدگمانی

خودی کیا، اور خودی کا اِدّعا کیا
جو بندہ ہے بنے گا وہ خدا کیا!

کسی خود بیں سے ہوتا آشنا کیا
تجھے دیکھا تھا، دنیا دیکھتا کیا!

کرم گسترا! فقیر بے نوا ہوں
فقیر بے نوا کا مدعا کیا!

تکلف برطرف! میں صاف کہہ دوں
وفا کیا اور پیمان وفا کیا!

تصویر جہاں میں رنگ بھرنا
تخلیق جہاں سے کم نہیں ہے!

اردو اتنی توانا اور باصلاحیت زبان ہے کہ راز نے گلشن اردو کو بے شمار خوبصورت پھولوں سے سجایا ہے اور ان کی طرح کے ہزاروں ادبا و شعرا بیش بہا ادبی خدمات ادا کر کے راہی ملک عدم ہو چکے ہیں۔ نئی نسل ان سے واقف نہیں ہے اور آنے والی نسل سے ایسی امید خیال و خواب معلوم ہوتی ہے۔ اگر دنیائے اردو میں کسی سطح پر کوئی ایسا پروگرام یا ادارہ ہوتا جو ماضی قریب و بعید کے صاحب طرز شعراء و ادبا کو پھر سے دریافت کر کے دلدادگان اردو کے سامنے پیش کرتا تو نہ معلوم راز کی طرح کے کتنے دوسرے شعراء اور ادیب اپنے فن سے ادب و شعر اور ہماری زندگی کو مالا مال

کرتے نظر آتے۔ رازؔ کی غزلیہ شاعری کا یہ مختصر مطالعہ اردو دنیا کو ان سے نئے سرے سے متعارف کرنے کی ایک ادنیٰ سی کوشش ہے۔ ان کی غزلیات کا مطالعہ انتہائی دلچسپ ہے اور وہ ہماری فکرو نظر کو غزل کے متعدد نئے گوشوں سے آشنا کرتا ہے۔

رازؔ دنیا اور اہل دنیا سے ایک حد تک محتاط ضرور تھے لیکن وہ اہل دل تھے اور اسی وجہ سے دوسرے اہل دل سے مایوس نہیں تھے۔ ان کی غزل گوئی اس عقیدت اور محبت کا ایک پر خلوص اظہار ہے جو انہیں اہل دل سے تھی اور جس کا اعتراف و اظہار انہوں نے اپنے کلام میں ایسے خلوص دل سے کیا ہے جس کا احترام اردو پر فرض ہے۔

رازؔ! اہل دل سے اب تک یہ عقیدت ہے مجھے
شعر کے پردہ میں حال دل کہے جاتا ہوں میں!

سید انتخاب علی کمال۔ کراچی

ماہر علومِ نجوم ورمل وجمل اور صانع شعروغزل۔۔۔عبدالغفور نساخ خالدی

بازوے او شاخِ سمن، مژگانِ اُو تیغ قضا   گیسوئے مشکِ ختن، مژگانِ اُو تیرِ جفا

مندرجہ بالا مطلع عبدالغفور نساخ کی تخلیق ہے۔ جس کے بارے میں صاحب "تذکرہ شمع انجمن" نواب صدیق حسن نے لکھا ہے کہ یہ مطلع بیس مختلف طریقوں (۱) سے پڑھا جا سکتا ہے۔ علمِ بیان میں ایسے شعر یا مصرع کو "صنعتِ متلون" (۲) (مُ تَ لَوْ وِن) مُتلوّن یعنی غیر مستقل مزاج بحر کہتے ہیں۔ مندرجہ بالا شعر کے بارے میں خود نساخ لکھتے ہیں:

"۔۔۔مطلع در صنعت ترصیع (ت ر ص ی ع) ولف ونشرِ مرتب یا غیر مرتب و چہار قافیہ دارد کہ ۳۲ بہ سی و دو طور خواندہ می شود۔ اگر مصرع ہائے اوّل مطلع ہائے مرقومہ بالائے را مصرع ہائے دوم را مصرع ہائے دہند و دو مطلع ہائے دیگر نیز صنعت مکرر ذو قافیتین لف ونشر مرتب، ترصیع وتصاد۔ ردّ العجز، علی صدر تضاد۔ ارصاد، رجوع۔ لاحق۔ تضاد۔ لزوم۔ تجنیس۔ ایہام تصاد۔ ترکِ اضافت، توشیح وغیرہ"۔ (۳۔۴)

مولوی عبدالغفور خان۔ ("ابو محمد" کنیت۔ ابن منشی قاضی فقیر محمد، صاحب جامع التواریخ)۔ ولادت ۱۲۴۹ھ بمقام کلکتہ۔ نساخ، حضرت خالد بن ولید رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی اولاد میں سے تھے)۔ اس لئے اپنے نام کے ساتھ "خالدی" لکھتے تھے۔ میدنی پور (ضلع راجشاہی) میں ڈپٹی کلکٹر رہے (۵)۔ فارغ البالی سے گذاران ہوا کرتا تھا۔ عربی کی استعداد بہت اچھی تھی فارسی میں کامل دستگاہ رکھتے تھے۔ اُردو زبان میں بھی بڑی قدرت رکھتے تھے۔ سخن فہمی میں طاق تھے۔ شعرو سخن میں کمال تھا علم نجوم اور فنِ رمل میں ماہر تھے۔ "خم خانہ جاوید" میں لکھا ہے: حافظ رشیدُ النبی وحشت رامپوری سے تلمذ رکھتے تھے۔ جبکہ "تذکرہ دُرفشاں" میں حافظ رشیدُ النبی کی ولدیت مولوی حبیبُ النبی اور موصوف کے تخلص کے ساتھ وحشت کلکتوی (۶) لکھا ہے "رامپوری" نہیں لکھا۔ نیز نساخ کے تین قطعاتِ تاریخِ وفاتِ حافظ رشیدُ النبی وحشت کلکتوی بھی موجود ہیں یہ تینوں قطعات

تاریخ آئندہ سطور میں اپنے مقام پر آئیں گے۔ اس وجہ سے ہم حافظ رشیدُالنبی ولد مولوی حبیبُ النبی کو وحشت کلکتوی ہی قرار دیتے ہیں "رامپوری" نہیں سمجھتے۔

نساخ نیک باطن آدمی تھے۔ نساخ کی تحقیق پر بے اختیار دل سے داد و آفریں نکلتی ہے۔ وسعتِ نظر، نکتہ فہمی، علمی استعداد کس کس کی داد دی جائے۔ اُن کی اُستادی میں کوئی کلام نہیں۔ صنائع اور بدائع کی طرف ان کی طبیعت زیادہ مائل رہتی تھی راقم الحروف نے نساخ کا جو شعر آغازِ مقالہ میں نذرِ قارئین کیا ہے اس کی مثال ملنا ناممکن تو نہیں مگر دشوار ضرور ہے۔ "صنعت متلوّن" میں دیگر شعرائے کرام کی کاوشیں بلاشبہ ضرور ہوں گی مگر راقم الحروف کو جو دستیاب ہوسکیں ہیں ہو راقم نے در حاشیۂ مقالۂ ہٰذا پیش کر دی ہیں۔ مکروہ شعری عیوب سے اُن کا کلام اکثر پاک ہوتا تھا۔ پاکیزہ، پُرلطف اور پُرمضمون اشعار کی ان کے کلام میں کمی نہیں ہے۔ بلندیٔ فکر و نظر اُن کے کلام میں خوب ملتا ہے انداز لکھنوی ہے گویا مزے سے خالی۔ نساخ نے مرزا دبیر لکھنوی (نام: مرزا سلامت علی ولادت: ۱۲۱۸ ہجری وفات ۱۲۹۲ ہجری) کے بارے میں نساخ نے ''سخنِ شعرا'' میں لکھا ہے وہ مرثیہ اچھا کہتے ہیں۔ مگر ایسا نہیں کہ عیوبِ شاعری سے پاک ہو (۷)۔ اسی طرح مرزا انیس کے مرثیوں میں بہت سی غلطیاں نکالیں۔ لیکن نساخ نے جو اعتراضات اہلِ لکھنو کے کلام پر کیے حصولِ شہرت یا بد نفسی سے نہیں کیے۔ بلکہ اہلِ لکھنو کی چھیڑ چھاڑ سے تنگ آکر اور کچھ اپنی تحقیق پسند طبیعت کی ولولہ انگیزیوں سے مجبور ہو کر کیے۔ لیکن اس کا انجام اچھا نہ ہوا۔ چاروں طرف سے شکائتیں ہونے لگیں (۸)۔ ان کے کلام پر مخالفین نے اعتراضات کیے۔ بقول ذوق:

بد نہ بولے زیرِ گردوں گر کوئی میری سنے   ہے یہ گنبد کی صدا جیسی کہے ویسی سنے

نساخ کے اعتراضات کے مواجب ہم دیکھتے ہیں تو اُن کی تحقیق پر بے اختیار دل سے آفریں نکلتی ہے۔ اُن کی وسعتِ نظر، نکتہ فہمی اور استعدادِ علمی کس کس کی داد دیجئے۔ قریب قریب جملہ اعتراضات بجا اور برمحل ہیں۔ اب آیئے خود نساخ کے کلام کی طرف:

موم دل جو ہے ستاتا ہے اُسے ہر سنگ دل   شمع کا سر کاٹنا اک کھیل ہے گُل گیر کا

کثرتِ عشاق نے پردے میں بٹھلایا تمہیں   یہ نگاہوں کا ہجوم اے جان چلمن ہو گیا

یہ کہوں کیونکر کہ غافل ہیں وہ میرے حال سے   رات دن تو ہے خیال اُن کو مرے آزار کا

جو ہیں عالی منزلت ہے خود بخود ان کو فروغ   مہر و مہ کا چرخ پر جلتا ہے بے روغن چراغ

تم سے ہوا نہ دردِ دلِ زار کا علاج   پھر کون سے مرض کی بتا دو دوا ہو تم

اُمیدِ وصل و بیمِ ہجر میں بس دن گزرتے ہیں   عجب کچھ زیست ہے اپنی نہ جیتے ہیں نہ مرتے ہیں

بزم میں رات کو غیروں سے اشارے دیکھے   دیدۂ یار کرشمے ترے سارے دیکھے

مسجد میں گر گزر نہ ہوا دیر ہی سہی   بیکار بیٹھے کیوں رہیں اک سیر ہی سہی

رات ہجراں کی ہے اور کوئی بھی غم خوار نہیں   کاش ناصح ہی چلا آئے اگر یار نہیں
واہ کس دھوم سے اٹھی ترے کشتہ کی نعش   نوحہ گر کوئی نہیں کوئی عزادار نہیں
ایک ویرانے کی تصویر ہے اللہ ! اللہ   گھر وہ میرا ہے کہ جس میں در و دیوار نہیں

میں عدم میں تھا زندۂ جاوید   مجھ کو میرے ظہور نے مارا

آج آہوں کی صدا آتی نہیں   مر گیا شب کو ترا بیمار کیا

اُن کے ہاتھوں سبھی پیتے ہیں مے   مُحتسب کیا، رند کیا، میخوار کیا
دشمنِ جانی ہے جس کو دیکھئے   آسماں کیا، بخت کیا، دلدار کیا

نازاں نہ ہوں کیوں خضر بھلا عمر پہ اپنی   حضرت نے تری زُلفِ رسا کو نہیں دیکھا
پردے سے نکلتے نہیں اور کہتے ہیں مجھ سے   پہچانو گے کیا ہم کو، خدا کو نہیں دیکھا

خیال آنے لگا ہے پھر کسی زلفِ پریشاں کا ‏ ‏ خدا حافظ ہے اے نسّاخ دامان و گریباں کا

لیا ایمان سب کا اس بتِ غارت گرِ دیں نے ‏ ‏ مجوسی کا، یہودی کا، نصاریٰ کا، مسلماں کا

سوزِ دروں کو آخر ہجراں میں کیا ہوا تھا ‏ ‏ آہوں نے کیوں کمی کی گر نالہ نارسا تھا

ہر کام حسبِ خواہش ہوتا تھا وہ بھی دن تھے ‏ ‏ طوفانِ نوح میری کشتی کا ناخدا تھا

لاشے پہ میرے آکر اللہ رے تجاہل ‏ ‏ لوگوں سے پوچھتے ہیں وہ اس کو کیا ہوا تھا

نسّاخ نے حافظ رشید النبی وحشت کے علاوہ حافظ اکرام حسین، ضیغم رامپوری سے بھی فیض حاصل کیا۔ غالب دہلوی، آزردہ، شیفتہ اور اربابِ کمال سے مراسم رہے۔ مجموعہ "اردوئے معلیٰ" میں غالب کا نسّاخ کے نام بھی خط موجود ہے۔ نادر و نایاب کتابیں جمع کرنے کا بڑا شوق تھا۔ مولوی عصمت اللہ نسخ اور حافظ مولوع عبدالمجید نسّاخ کے تلامذہ میں یگانہ ہیں۔ (خُم خانہ جاوید)

مندرجہ ذیل کتب نسّاخ کی یادگار ہیں

چشمۂ فیض: حضرت فریدالدین عطار (رحمۃ اللہ علیہ) کے "پند نامہ" کا منظوم ترجمہ ہے۔ اس کا نام "چشمۂ فیض" تاریخی ہے۔ جس سے ۱۲۳۸ ہجری حاصل ہوتا ہے۔ گارساں دتاسی نے بھی "چشمۂ فیض" کا تذکرہ اپنے خطبے میں کیا ہے (۹)۔ اس کتاب کا ایک نسخہ برٹش میوزیم میں محفوظ ہے۔ راوی ڈاکٹر محمد صدرالحق۔ (ت۔د)۔ (ن۔ح۔ت)

زبان ریختہ: ۱۶ (سولہ) صفحات کا مختصر رسالہ ہے۔ "زبانِ ریختہ" تاریخی نام ہے۔ جس سے ۱۲۷۵ ہجری برآمد ہوتا ہے۔

قطعہ منتخب: اس کا نام بھی تاریخی ہے۔ اس کا ذکر "نسّاخ حیات و تصانیف" تالیف ڈاکٹر محمد صدرالحق میں نہیں ہے بلکہ "تذکرہ درفشاں" کے مؤلف نے اس کتاب کا ذکر کیا ہے (۱۰)۔ (ت۔د)

دفترِ بے مثال: اس کا نام تاریخی ہے۔ ۱۲۶۷ ہجری حاصل ہوتا ہے۔ یہ نسّاخ کا پہلا دیوان ہے۔ اس کا سالِ طباعت ۱۲۸۰ ہجری مطابق ۱۸۶۳ء ہے۔ مطبوعہ مظہر العجائب پریس۔ کلکتہ۔ اس

کی تقطیع ۹x۱۲ ہے اور ٹائپ میں چھپا ہے مجموعی صفحات ۱۸۴ ہیں۔ "دفترِ بے مثال" آغاز ترتیب کی تاریخ ہوگی۔

شاھد عشرت: اکتوبر ۱۸۷۴ عیسوی رشعبان ۱۲۹۱ ہجری۔ مطبع منشی نول کشور۔ لکھنؤ۔

سخن شعرا: تاریخی نام ہے۔ ۱۲۸۱ ہجری برآمد ہوتا ہے یہ تذکرہ منشی نول کشور پریس لکھنؤ سے ۱۲۹۱ ہجری میں طبع ہوا۔ اس کا حجم ۵۸۲ صفحات پر مشتمل ہے۔ مؤلف ''خم خانہ جاوید'' کے مطابق اس میں ۲۴۸۳ شاعروں کا ذکر ہے۔ کلام کا انتخاب نہایت عمدہ ہے۔ ''نساخ حیات و کتب'' کے مؤلف نے لکھا ہے کہ یہ تذکرہ گارسان دتاسی کے تذکرے "تاریخ ادب ہندوستان" کے بعد سب سے زیادہ کثیر التعداد شعراء کا تذکرہ ہے۔ حاجی سعید بخت، سعید سلہٹی (سابق مشرقی پاکستان) نے (جو حافظ اکرام حسین ضیغم کے شاگرد تھے۔) ''سخن شعرا'' کیلئے مندجہ ذیل قطعہ تاریخ کہا ہے۔ جو ''سخن شعرا'' کے ص ۲۱۷ پر اور ''تذکرہ درفشاں'' کے صفحہ ۱۰۶۴ پر درج ہے:

جنابِ حضرتِ نسّاخ ہیں جو جانِ سخن جہاں میں کہتے ہیں سب جن کو راز دانِ سخن
کیا ہے جمع انھوں نے یہ تذکرہ کیا خوب عجیب ڈھب سے مُدوّن ہے داستانِ سخن
سعیدؔ! مجھکو تھی تاریخ کی جو اسکی فکر کہا سروش نے۔ ''آرایشِ جہانِ سخن''

نوٹ: صرف "آرایشِ جہانِ سخن" سے ۱۲۸۱ ہجری برآمد ہتے ہیں پورے مصرع سے نہیں۔ (کمال)

مرغوبِ دل: نساخ کی فارسی رباعیات کا مجموعہ ہے۔ اس کا نام تاریخی ہے۔ جس سے ۱۲۸۲ ہجری۔ اس کو ۱۲۹۱ ہجری ر۱۸۷۴ عیسوی میں منشی نول کشور پریس سے طبع کرایا گیا ہے۔

اشعار نساخ: نام تاریخی ہے۔ جس سے بحسابِ ابجد ۱۲۸۳ ہجری برآمد ہوتا۔ مقالے کے آغاز میں یازدۓ اوشاخ سمن ۔۔۔ جو شعر رقم ہے۔ وہ نساخ کی اسی کتاب سے ماخوذ ہے۔

گنج تواریخ: تاریخی قطعات کا مجموعہ ہے۔ آپ کی اس کتاب "گنج تواریخ" کے حوالے سے پروفیسر سعید نفیسی، اُستاد دانش کدہ ادبیات ایران نے اپنے مضمون "تاریخ درگزشت سعدی" میں لکھا ہے۔ آپ نے بھی سرور لاہوری صاحب (۱۱) "خزینۃ الاصفیا" کی طرح بہت سے گزشتہ

واقعات کی تاریخیں خود کہہ کر" گنجِ تواریخ" میں جمع کی ہیں۔جن میں ایک تاریخ وفات سعدی شیرازی بھی ہے وہ یہ ہے:۔

سالِ ترحیلِ رحلتِ سعدیؒ جوئے از "کوچ سعدیٔ شیراز"

(مجلہ دانشکدہ ادبیات طہران۔شمارہ اوّل)

ارمغان: اس کا "ارمغان" "تاریخی نام ہے جبکہ یہ ۱۲۹۴ ہجری میں مطبع نظامی کان پور سے طبع ہوئی

کنزِ تواریخ: ۵۰ صفحوں کا رسالہ ہے۔اس رسالے کا نام تاریخی ہے۔جس کو" گنجِ تواریخ" کا ضمیمہ کہا جاسکتا ہے اس کتاب کا ذکر" تذکرہ درفشاں" میں نہیں ہے اس کا ذکر ڈاکٹر محمد صدرالحق نے اپنی کتاب "نساخ۔حیات وتصانیف" میں کیا ہے۔

مظہر معما: تاریخی نام ہے جس سے بحساب ابجد ۱۲۹۶ ہجری حاصل ہوتا ہے۔یہ رسالہ ۱۵ صفحات پر مشتمل ہے۔اس کتابچے کی طباعت ۱۳۰۲ ہجری میں ہوئی ۱۲۹۶ ہجری اس کا سالِ آغازِ ترتیب ہے۔خود عبدالغفور نساخ خالدی نے اس کا قطعہ سالِ طباعت کہا جو درج ذیل ہے:

کتابے از معما شُد مُرتب زفکرِ ثاقبِ نساخِ یکتا
برائے یادگارِ طبع اے کلک رقم کُن سالِ اُو "رخشاں مُعمّا"

اشاریہ: صرف "رخشاں معما" سے ۱۳۰۲ ہجری برآمد ہوتا ہے۔

ارمغانی: تاریخی نام ہے۔طباعت ۳ صفر ۱۳۰۴ ہجری مطابق ماہ نومبر ۱۸۸۶ عیسوی میں کلکتہ سے ہوئی۔دیگر تفصیل معلوم نہ ہوسکی۔

ترانۂ خامہ: یہ تاریخی نام ہے جس سے ۱۳۰۲ ہجری برآمد ہوتا ہے۔یہ نساخ کی اردو رباعیات کا مجموعہ ہے جس کا حجم ۳۲ صفحات ہے۔نساخ نے خود اس کے لئے قطعہ تاریخ بھی اس طرح لکھا۔

بعونِ لطفِ سخن آفرین بندہ نواز ہزار شکر کہ ترتیب یافت ایں نامہ
زجوشِ ولولہ نساخ نام و تاریخش سرود مطربِ کلکم "ترانۂ خامہ"

"ترانۂ خامہ" مطبع بحر العلوم لکھنؤ سے شائع ہوئی۔ (از "نساخ حیات وتصانیف" ڈاکٹر محمد صدر الدین)

باغِ فکر: معروف بہ مقطعاتِ نساخ (۱۲)۔ اس میں "بحرِ رَجز" کے اشعار ہیں۔ جو علم عروض کی ایک بحر ہے۔ کتاب کا سالِ ترتیب ۱۳۰۳ ہجری ہے۔ جس کے مطابق نساخ نے اس کا تاریخی نام "باغِ فکر" نکالا ہے۔ سال طباعت ۱۳۰۴ ہجری ہے۔ اشاعت مطبع نامی لکھنؤ۔

تالیفاتِ نصابِ اردو زبان: دراصل اس کا نام "نصاب اردو زبان" ہے۔ کتاب کا نام تاریخی نہیں ہے۔ اس کتاب کا ایک مطبوعہ نسخہ "ایشیاٹک سوسائٹی لائبریری" کلکتہ میں موجود ہے۔

منتخباتِ دواوینِ شعرائے ہند: دراصل اسے نساخ نے ترتیب دیا ہے۔ لیکن کیپٹن ولیم ناسولیس نے اپنی تصیحات سے کالج پریس کلکتہ سے ۱۸۶۴ عیسوی مطابق ۱۲۸۱ ہجری طبع کرایا۔

نساخ کی تاریخ گوئی پر سرسری نظر

عبدالغفور نساخ کی مرتبہ کتب کی اکثریت کے نام نساخ نے تاریخی رکھے ہیں یہ بھی اور " گنج تواریخ "یا" کنزِ تواریخ "وغیرہ اس امر کا واضح ثبوت ہے کہ نساخ کو فنِ تاریخ گوئی میں مہارت تھی۔ لہٰذا ہم موصوف کہ کہے ہوئے قطعاتِ تاریخ بھی نذرِ قائین کرتے ہیں۔ واضح رہے کہ مؤلف "خم خانۂ جاوید" اور مؤلف "نساخ۔ حیات وتصانیف" میں قطعاتِ تاریخ نہیں ملتے۔ مؤلف "تذکرہ درفشاں" (۱۹۶۰ء) سید خورشید علی، مہر تقوی جے پوری نے مختلف کتب کے مطالعہ کے بعد نساخ کے قطعاتِ تاریخ پیش کیے ہیں جو درج ذیل ہیں:۔

(۱) ۱۲۷۴ ہجری مطابق ۱۸۵۷ عیسوی میں طالب علی خاں متخلص بہ سلطان عرف سلطان جان خلف خواجہ حسین علی خاں رئیس عظیم آباد مقیم گیا (اولاد خواجہ عبید اللہ احرار رضی اللہ تعالیٰ عنہ) کی وفات ہوئی۔ نساخ نے قطعہ تاریخ لکھا:۔

خواجہ سلطاں جاں کہ رحلت کرد وائے   داستاں را کرد با اندوہ جفت
سالِ مرگِ او چو جُستم از سروش   "خواجہ سلطاں خاں بُمرد افسوس" گفت (نمبر۱۳)

اشاریہ:" گفت" شمار میں نہیں ہے۔

(۲) ۱۲۷۴ ہجری/ ۱۸۵۹ عیسوی میں مولوی حافظ رشید النبی (خلف مولوی حبیب النبی) متخلص بہ وحشت کلکتوی کی دفات پر تین قطعات لکھے۔ جن کے آخری مصرعے جن سے تاریخ نکلتی ہے وہ یہ ہیں:۔ (مندرجہ بالا سطور میں وحشت کلکتوی کا ذکر گزرا ہے۔ موصوف نساخ کے استاد تھے)۔ ان وحشت کلکتوی کے علاوہ ایک اور وحشت کلکتوی کا ذکر بھی حاشیہ میں ہے۔

(الف) "مرگئے آہ ایسے فاضل آہ"

(ب) "وحشتِ جادو بیاں مرگئے افسوس آہ"

(ج) "خسرو اقلیم معانی موئے" (۱۴)

(۳) ۱۲۷۶ ہجری/ ۱۸۶۰ عیسوی میں میر فرزند علی مسلم (خلف میر حسین علی) محرر عدالت دیوانی۔ صدر کلکتہ کا انتقال ہوا۔ نساخ نے یہ قطعہ لکھا:

مر گیا مسلم حیف یہ غم ہے ہو اس پر اللہ کی رحمت
میں نے یہ تاریخ کہی ہے مسلم ہے اب داخلِ جنت (۱۵)

(۴) ۱۲۷۶ ہجری/ ۱۸۶۰ عیسوی میں نواب علی اصغر خاں، خان بہادر ناصر جنگ (وزیر بہادر شاہ) بادشاہ دہلی کا انتقال ہوا۔ اس موقعہ پر آپ نے لکھا:

چوں علی اصغر شد از دنیا سوئے ملکِ عدم شد دل نساخ محزوں راز بس رنج و الم
شد بہ یک مصرع دو تاریخ ایں چنیں اے جلِ زار شنبہ ذی قعدہ ہے ہے "آہ درد وہائے غم" (۱۶)

ایک قطعہ تاریخ بر وفاتِ نواب صاحب اور بھی کہا:

قضا کی جو علی اصغر نے اے نساخ غمیں ہے یہ دل مانوس صد حیف آج
کہا ہے آہ میں نے عیسوی تاریخ "علی اصغر موئے افسوس صد حیف آج" (۱۷)

(۵) ۱۲۷۷ ہجری ر۱۸۶۱ عیسوی میں خواجہ نبی بخش کشمیری متخلص بہ محرور کا عین جوانی میں بمقام کلکتہ انتقال ہوا۔ آپ نے ان کی وفات پر یہ قطعہ تاریخ کہا:

نبی بخش کے مرنے کا سخت غم ہے نہایت ہے اس قلبِ محزوں کو صدما
جو سالِ مسیحی کو ہاتف سے پوچھا تو۔"مرگِ جواں ماتمِ سخت" بولا

(سخنِ شعرا، صفحہ ۴۱۷)

اشاریہ: صرف ان الفاظ سے "مرگ، جواں ماتمِ سخت" عیسوی سنہ ۱۸۶۱ء حاصل ہوا ہے۔

(۶) ۱۲۷۹ ہجری ر۱۸۶۳ عیسوی میں مولوی واجد علی مخمور (خلف مولوی عبدالعلی، رئیسِ شہر ڈھاکہ) کا انتقال ہونے پر نساخ نے کہا:

آج نساخ! مولوی مخمور گلشنِ عدن کے مقیم ہوئے
مصرع سالِ نقل یہ تھا "داخلِ جنتِ نعیم ہوئے"

(سخنِ شعرا، صفحہ ۴۶۵)

(۷) نساخ نے ایک شعر میں شہادتِ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی تاریخ بھی لکھی ہے۔ وہ شعر یہ ہے:

برید ابن ملجم چو فرقِ "ولی" عیاں گشت تاریخ فوت علی ۴۰ھ

(۱۸)

تشریح: یعنی "ولی" کا سر یعنی (واؤ) کاٹ دینے کے بعد "لی" رہ جاتا ہے۔ جس کے اعداد بحساب ابجد (ل=۳۰+ی=۱۰)=۴۰ ہوتے ہیں یہی شہادتِ علیؓ کا سال ہے ۴۰ھ۔

مندرجہ بالا سرسری جائزے سے یہ بات صاف عیاں ہوتی ہے کہ عبدالغفور نساخ خالدی شعر گوئی میں نہایت مشاق تھے۔ علمِ عروض، علمِ بیاں اور صنائع بدائع میں مہارت رکھتے تھے۔ نیز فنِ تاریخ گوئی میں بھی اعلیٰ دسترس رکھتے تھے۔

حواشی

۱۔ خمخانۂ جاوید جلد ششم مرتبہ خورشید احمد خان یوسفی۔ مقتدرہ قومی زبان۔ اسلام آباد۔ ۱۹۹۰عیسوی۔

۲۔ صَنعت مُتلّون میں ایک مصرع میر غلام علی شیر قانع تتوی صاحبِ "مقالات الشعراء" (۱۱۷۴ ہجری) نے ۱۱۷۰ ہجری مطابق ۱۷۵۶ عیسوی میں کہا تھا۔ اس مصرع سے ۱۱۷۰ ہجری بھی برآمد ہوتا ہے۔ قانع تتوی کا زیرِ نظر مصرع یہ ہے۔ "دَر یدِ تو دولتِ نو آمدہ" ہجری ۱۱۷۰

اس مصرعے کو دس (۱۰) مختلف بحروں میں پڑھا جا سکتا ہے۔ مزید یہ کہ اس مصرع سے ۱۱۷۰ ہجری بھی بحسابِ ابجد برآمد ہوتا ہے۔ صَنعتِ مُتلّون میں ایک مصرعۂ تاریخ دو سو سال بعد ۱۳۸۰ ہجری میں مہرؔ تقوی جے پوری کا بھی ملتا ہے جو پانچ مختلف بحروں یں پڑھا جا سکتا ہے۔ مہرؔ تقوی جے پوری کا مصرعۂ تاریخ یہ ہے: "دُرِ دِرتو شاد یارب آمدہ" ۱۳۸۰ ہجری دیکھیے "تذکرۂ دُرفشاں"۔ صفحہ نمبر ۷۷

۳۔ ماخوذ "اشعارِ نساخ" ۱۲۸۳ ہجری از عبدالغفور نسّاخ صفحہ نمبر ۱۷

۴۔ ماخوذ "نساخ (حیات وتصانیف)" از ڈاکٹر محمد صدر الحق۔ ناشر: انجمنِ ترقی اردو پاکستان۔ بابائے اردو روڈ کراچی۔ طبع اوّل ۹/۷/۱۹۷۷ء

۵۔ "تذکرۂ دُرفشاں" (۱۹۶۰ء) مرتبہ سیّد خورشید علی مہرؔ تقوی جے پوری۔

۶۔ ایک دوسرے وحشتؔ کلکتوی نام سید رضا علی ولد حکیم مولوی شمشاد علی بھی اردو ادب میں بلند مقام رکھتے ہیں۔ اِن وحشت کلکتوی کا دیوان "ترانۂ وحشت (۱۳۷۰) کے نام سے مکتبۂ جدید لاہور سے طبع ہوا۔ وفات ۱۹۵۶ء ۱۳۷۵ ہجری میں ہوئی۔ بسملؔ سنسہادی نے "طوطیِ خوش نوا ہوا خاموش" ۱۹۵۶ء سے عیسوی سنہ تاریخ کہی۔ جبکہ حفیظؔ ہوشیار پوری نے سنہ ہجری کی تاریخ کہی "تاریخ مرگِ وحشتؔ شیریں کلام وحشت" ۱۳۷۵ ہجری ۱۷ اکتوبر ۱۹۶۲ء کو ڈاکٹر وفا راشدی نے بزمِ وحشت قائم کی اس موقع پر مہرؔ تقوی جے پوری نے فی البدیہ قطعۂ تاریخ کہا۔ اس قطعۂ تاریخ کا آخری مصرع جو حاصلِ تاریخ بھی ہے وہ یہ ہے

ہے مبارک اہلِ مجلس بزمِ وحشت کا قیام'' ۱۳۸۲ہجری (از تذکرہء دُرفشاں)

۷۔ ''تذکرہء دُرفشاں'' (۱۹۶۰ء) میں صفحہ ۴۲۶ پر احوال دبیر لکھنوی کے حاشیہ میں لکھا ہے۔

۸۔ خُمخانہء جاوید جلد ششم صفحہ نمبر ۲۱۶

۹۔ خطباتِ گارساں دتاسی۔ مطبوعہ انجمن ترقی اردو۔ حیدرآباد۔ دکن بحوالہ ''نساخ (حیات وتصانیف)'' از ڈاکٹر محمد صدر الحق ناشر انجمنِ ترقی اردو، کراچی ا، طبع اوّل ۱۹۷۷۔۷۹ء

۱۰۔ ''تذکرہء دُرفشاں'' (۱۹۶۰ء)۔

۱۱۔ سرورلاہوری۔ نام مولوی حاجی حکیم مفتی غلام سرور۔ صاحب (''خزینۃ الاصفیاء'') ۱۲۸۰ہجری ولادت ۱۲۴۴ہجری وفات ۱۳۰۷ہجری

۱۲۔ ''مُقطعات''۔ مُقطعہ کی جمع ہے۔ وہ حروف جو قرآن حکیم کی بعض سورتوں کے شروع میں آتے ہیں۔ مثلاً الم. المرا حم عسقم طس م ق ن وغیرہ۔ حُروفِ مُقطعات کے سلسلے میں رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلم سے کچھ منقول نہیں۔ لیکن آپ کے جلیل القدر صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ جو درحقیقت مزاج شناسِ نبوّت ہیں اور جن کے ارشادات ہمارے لئے حجّت کا درجہ رکھتے ہیں۔

ارشاد ہے:۔ " الحُرُوفُ المقطّعَۃُ مِنْ المُکتسُومِ الّذِیْ لَا یُفسَّ.

ترجمہ: حُروفِ مُقطعات۔ ایسی پوشیدہ چیزیں ہیں۔ جن کی تفسیر نہیں کی جاسکتی۔"

حضرت ابنِ عبّاس فرمایا کرتے تھے۔ کہ ''متشابہات کی مراد مجھے معلوم ہے۔'' تفسیر مظہری میں ہے کہ حضرت مجدد الف ثانی کا بھی ارشاد ہے کہ۔ ''میں متشابہات کی حقیقت سے واقف ہوں لیکن عوام کے سامنے بیان کرنا مناسب نہیں۔ کیونکہ یہ اللہ اور اس کے رَسُول صلی اللہ علیہ وسلم کے راز ہیں۔'' (تفسیر مظہری۔ از رموزِ مقطعات۔ مولانا شاہ محمد حفظ الرحمٰن) ۱۳ ۱۴ ۱۵ ۱۶ ۱۷ ''سخنِ شعرا'' ۱۲۸۱ہجری از نسّاخ بحوالہ ''تذکرہ دُرفشاں'' (۱۹۶۰ء) مرتبہ مہر تقوی بجے پوری۔

۱۸ ''غرایبُ الجمل'' (۱۳۱۷فصلی سنہ) مرتبہ ولا حیدرآبادی

مسلم شمیم

صادقین۔ایک خلّاق مصوّر و مفکّر

(۳۰؍جون ۱۹۳۰ء۔۱۰؍جولائی ۱۹۸۷)

صادقین کے حوالے سے میں نے جب بھی سوچا، میرے ذہن کے اُفق پر تین عالمی نابغۂ اعظم شخصیات کی تصویریں اُبھریں۔عہد نشاۃِ ثانیہ کے (RENAISSANCE) لیونارڈو ڈاونسی (LEONARDO DA VINCI) (۱۴۵۲ء۔۱۵۱۹ء) اور مائیکل اینجلو (MICHEL ANGELO) (۱۴۷۵ء۔۱۵۶۴ء) اور بیسوی صدی کے پابلو پکاسو (PABLO PICASSO) (۱۸۸۱ء۔۱۹۷۳ء) اِن تینوں داستانی شخصیات (LEGENDRY PERSONALITIES) کی خلّاقانہ اور مفکرانہ مہارت اور جامعیت کے دائروں کے گرد حصار قائم کرنا 'کارے دارد' ہے۔لیونارڈو ڈاونسی کو "THE RENAISSANCE MAN" کہا گیا اور اُن کی شہرۂ آفاق مصوری کی شاہکار ''مونالیزا'' آج بھی اُسی قدر و قیمت کی حامل ہے۔موصوف نے مجسمہ سازی کے علاوہ جنگ کے آلات کی نقش گری کی جو تین صدیوں کے بعد تکنیکی عہد میں حقیقی اشکال میں نمایاں ہوئے۔مائیکل اینجلو کو ایک عظیم مصور ہونے کے ساتھ سب سے بڑے مجسمہ ساز ہونے کا منصب بھی حاصل ہے۔اس باب میں حضرت موسیٰ اور حضرت داؤدؑ کے مجسمے خصوصی حوالے ہیں۔اگرچہ اُنھیں اپنے بزرگ ہم عصر لیونارڈو ڈاونسی کے مقابلے میں کم تر درجے کے آفاقی نابغۂ روزگار قرار دیا گیا ہے، مگر اُن کی خلّاقیت کا ایک اور شعبہ ایسا ہے جو لیونارڈو ڈاونسی کے ہاں مفقود ہے، یعنی شاعری کا عظیم ورثہ۔ اُنھوں نے مختلف اصافِ سخن میں تین سو سے زیادہ شاہکار نظمیں تخلیق کیں۔فکر و فن کے اِن دونوں مہر و ماہ کا تعلق اٹلی سے تھا جہاں سے نشاۃِ ثانیہ کا آفتاب پہلے طلوع ہوا اور پورے یورپ کو منور کر گیا۔یورپ کی تیسری عظیم نابغۂ روزگار شخصیت پابلو پکاسو کی ہے جنھوں نے عہدِ جدید میں مصوری

کی دنیا کو سب سے زیادہ متاثر کیا۔ وہ اسپین کے شہر مالاگا (MALAGA) میں ۱۸۸۱ء میں پیدا ہوئے اور ۱۹۰۴ء میں پیرس میں قیام پذیر ہوئے اور یہیں کے ہو رہے۔ مذکورہ تین مغربی دنیا کی شخصیات کے علاوہ ایک ایشیائی شخصیت عمر خیام کا بھی تصور صادقین کے تصور کے ساتھ اُبھرتا ہے۔ عمر خیام جو اپنی شاعری، رباعیات کے حوالے سے شہرت خاص رکھتا ہے، اُس کے دوسرے شعبوں کے کارناموں کو تقریباً فراموش کر دیا گیا ہے۔ وہ ماہرِ علمِ ریاضی اور جلالی کیلنڈر کا موجد تھا اس کے ساتھ وہ ایک باکمال سائنس داں، عظیم ماہرِ فلکیات اور مستند فلسفی تھا۔ اصفہان میں اپنی قائم کردہ رسدگاہ (Observatory) میں عمر خیام نے گردشِ زمین اور ستاروں کے خلا میں ساکت اور معلق ہونے کے حوالے سے جو انکشافات کیے، وہ کئی صدیوں بعد یورپ کے سائنس دانوں کے ذریعے آج انسانی علم و شعور کے خزانے کا حصہ ہیں صادقین اُس کہکشاں کا ایک سیارہ ہیں اور میں اُنھیں مذکورہ قبیلۂ فکر و فن کا رُکن رکین گردانتا ہوں۔ میرے نزدیک صادقین ایک ایسے نابغۂ عالم تخلیق کار تھے جو بالآخر ہمارے تہذیبی وجود کا منہاج اور علامت قرار پائے۔ اُنھوں نے اپنی فن کارانہ دانش اور خلاّقیت کے معنی خیز خطوط، نقوش اور رنگوں سے جو طلسمات تشکیل دی ہے، وہ لازوال اثر پذیری کی آپ اپنی دلیل ہے اور رہے گی۔ فیض صاحب نے اپنے ایک مضمون کا اختتام اس جملہ پر کیا ہے: ''صادقین اپنے فن میں صرف صناع ہی نہیں، مفکر بھی ہیں''۔ اِس جملہ کی وضاحت درجِ ذیل اقتباس سے بڑی حد تک ہوتی ہے، ملاحظہ کیجیے:

''صادقین نے اپنی ایک تصویر نقشِ فریادی سے موسوم کی ہے۔ اُن کے کلیاتِ فن کے بیش تر اوراق کے لیے غالباً یہی عنوان سب سے زیادہ موزوں ہے۔ اِن نقش ہائے رنگ رنگ کا ہر پیکر فریادی ہے۔ صرف کاغذی پیرہن کا رنگ اور فریاد مختلف ہے۔ یہ پیکر اگر ابنِ آدم ہے تو کبھی مجنوں، کبھی مسیحا جس کی رگوں کا کرب خار و خس میں پیوست ہے اور قلب و نظر کا علومہ کہکشاں میں گم۔ یہ نقش کسی شہر یا معمورے کی نیم تاریک دیواروں اور نیم روشن دریچوں کا عکاس ہے تو اُس کے منزل و در، سنگ و خشت سے آزادی کے متمنی نظر آتے ہیں اور اُس

کے کنگرے فضا میں مائلِ پرواز۔ اگر بنتِ حوا کا کوئی بہروپ ہے تو آبِ رواں کی طرح موج در موج غلطاں و پیچاں، اگر شجر و حجر ہے تو موجودات کی اعلیٰ تر صورتوں کے شوقِ وصال میں کوشاں و سرگرداں۔ صادقین لذتِ محض اور مجد و صناعت سے بھی خوب آشنا ہیں، لیکن اُن کے صوری تخیل میں پیدائش، نمو اور ارتقا کے کرب و اضطراب کا اظہار اُن کے خطوط کو پیچ و تاب میں رکھتا ہے۔ ایسے خطوط جو گویائی اور وضاحت کے لیے شوخیِ رنگ سے قریب قریب بے نیاز ہیں صادقین کے رنگ عام طور سے اُسی درجہ خاموش ہیں جس درجہ اُن کے خطوطِ تکلم۔ اُن کے عمل میں قدیم مشرقی طغرا نگاروں کی خطوط کشی، جدید مغربی مصوروں کی تجریدی تخیل، قدیم اہلِ تصوّف کے وحدتِ کائنات کے تصوّر، جدید اہلِ فکر کے فلسفۂ ارتقا کی رجائیت، سبھی کے عناصر موجود ہیں۔ لیکن اِن عناصر کا ظہور ترتیب اُن کے اپنے ذہن اور مُوقلم کی تخلیق ہے، کاوشِ حیات کی طرح ''ان تھک اور مسلسل''۔

صادقین کثیر الجہت شخصیت کے حامل فن کار، خلاّق اور مفکّر تھے۔ اُن کی خلاّقی نے اپنے اظہار کیلئے مصوّری، نقاشی، خطاطی اور شاعری کے وسیع تر ذرائع ابلاغ کو اختیار کیا تھا اُنھوں نے جس پیرایہء اظہار کو بھی ہاتھ لگایا، اُسے تنوع، وسعت اور گہرائی سے ہم کنار کر دیا۔ تجربے، ایجاد، اختراع اور تازہ کاری نے اُن کے فن کو وہ عظیم تابناکی اور اثر پذیری عطا کی ہے جو اُن سے مخصوص ہو کر رہ گئی ہے۔ اُن کے مُوقلم سے کھینچے ہوئے خطوط و نقوش ہوں یا کینوس پر بکھرے ہوئے رنگوں کی دھنک یا ان کے قلم سے نکلے ہوئے شعری و نثری پیکر، ان سب پر صرف اور صرف صادقین کی چھاپ ہے، اور یہ تمام فنی ذرائع مل جل کر اُس عظیم شخصیت کی تکمیل کرتے نظر آتے ہیں جسے ہم صادقین کہتے ہیں۔ وہ ایک حسّاس سماجی شعور اور گہری بصیرت کے حامل تخلیق کار تھے اور اسی لیے اُنھوں نے اپنے فن کو صرف صوری اجتہاد تک محدود نہیں رکھا تھا بلکہ اُسے معنویت کی وہ گہرائی بھی عطا کر رکھی تھی جو روحِ عصر اور سماجی شعور کی علامت بن کر اُبھرتی ہے۔ اُن کی مصوّری کے مختلف ادوار اور PATTERNS ہیں جن میں انسانی خطوط اور اشکال نامانوس ہیولے نظر

آنے لگتے ہیں۔ وہ دراصل اُس روحانی کرب اور اذیّت کی نشان دہی کرتے ہیں جن سے اُن کا عہد اور معاشرہ گزر رہا ہے۔ انسانی جسموں پر تنی ہوئی نوک دار کانٹوں کی پوشاک اور سروں پر منڈلاتے ہوئے کوؤں اور گِدھوں کی علامتیں اُس صورت آشوب کی ترجمان ہیں جن کی بازگشت اُن کے ہم عصر ادب اور فکر وفن میں بھی سنائی دے رہی ہے صادقین نے بلاشبہ اپنے مُوقلم کو اُس عصری جہاد میں شریک رکھا تھا جو شرفِ انسانیت کے احترام اور روشن خیالی کے فروغ وتوسیع کے سلسلے میں جاری رہا ہے۔ اُن کی شخصیت ایک ایسے عوام دوست اور زندگی آموز جمالیاتی مزاج اور رویے سے مل کر بنی تھی جو ہمارے عظیم صوفیوں اور درویشوں کا طُرّہ امتیاز رہا ہے، گویا اُن کے فن کی جڑیں دھرتی میں پیوست رہی ہیں۔ بقول ڈاکٹر محمد علی صدیقی:

''صادقین نے مصوری کی اہمیت کو جس طرح پھیلایا ہے، وہ ہماری مصوری کی تاریخ کا درخشاں باب ہے۔ وہ مصوری کو کھیتوں، کھلیانوں، ترقیاتی سرگرمیوں کے مراکز، اخباروں، کیلنڈروں اور ڈائریوں میں جس واضح مقصدیت کے تحت لائے، اُس کا نتیجہ یہ نکلا کہ مصوری خواص سے نکل کر عوام کے ایک بڑے حلقے تک آگئی''۔

فیض احمد فیض کے شعری مجموعے 'زنداں نامہ' کے دیباچے بعنوان 'روداد ِقفس' میں ایک مقام پر مرحوم میجر اسحاق نے لکھا ہے: ''ایک اندھا کائنات کی رنگا رنگی میں عمر گزار کر بھی رنگوں کا اندازہ نہیں کر سکتا۔ کئی لوگ اچھی بھلی نظر رکھتے ہوئے بھی رنگوں کو نہیں پہچان سکتے۔ ریڈیو پروگرام سننے کے لیے طاقت ور ریڈیو اسٹیشن ہی نہیں، رسیونگ سیٹ بھی نقائص سے پاک ہونا چاہیے''۔ یہ مرحلہ مجھے بھی صادقین جیسی عظیم المرتبت اور نابغہ روزگار کی خلّاقیت کی گہرائیوں اور بلندیوں کے ادراک اور شعور کے حصول میں درپیش ہے جس کا اظہار اُن کی خطاطی اور مصوری کی قلم رَو میں ہوا ہے۔ فنونِ لطیفہ کے یہ دونوں شعبے دو قلزم وبحرِ بے کراں کا درجہ رکھتے ہیں اور مجھے اِس باب میں اپنی کم مائیگی کا بھرپور ادراک اور احساس ہے، سو اپنی نارسائی کا اعتراف کرتے ہوئے اِس ضمن میں میرے ذہن وفکر کے اُفق پر جو پرچھائیاں اِن تخلیقات کے حوالے سے اُبھری ہیں، اُن کی

حیثیت تاثرات سے زیادہ کچھ بھی نہیں۔ میرے تاثرات اِس باب میں اِس حد تک ہیں کہ وہ ایک یکتائے روزگار مصوّر تھے اور اپنی اختراعی خصوصیت کے حوالے سے اُن کی تصویریں بڑی انفرادیت کی حامل ہیں اور اُن میں تنوع بھی ہے اور INNOVATION بھی اور بلند INVENTIVE CREATIVITY بھی۔ بقول جناب سبطِ حسن: ''صادقین کی تصویروں کو سطحی نظر سے دیکھو تو بڑی بھیانک اور اذیت پسند دکھائی دیں گی، لیکن وہ لوگ جو اِن تصویروں کے معنی و منشا پر غور کرتے ہیں تو مغموم اور مایوس نہیں ہوتے بلکہ بڑی فتح مندی اور شادمانی محسوس کرتے ہیں''۔ صادقین نے خطاطی کا جو آہنگ اور آرٹ اختیار کیا ہے اور حروف کو مربوط اور مسلسل لکھنے کا ہنر ایجاد کیا، وہ دراصل اُس اختلاط اور اشتراک کی نشان دہی کرتا ہے۔ جو وہ ہماری جمالیاتی اقدار و روایات میں اُبھرتا ہوا دیکھنا چاہتے تھے۔ تحریر کو تصویر کر دینے اور خطاطی کو مصوّری سے ملا دینے کا فن صادقین سے منسوب ہے اور صادقین ہی سے منسوب رہے گا۔ اُنھوں نے شاعری میں رباعی جیسی مشکل صنفِ سخن کو غالباً اسی لیے منتخب کیا تھا کہ وہ چار مصرعوں کے محدود چوکھٹے میں لفظ و معنی سے متحرک تصویر بنا کر دکھا دیں۔

ان رباعیات میں موضوعات و مضامین کا جو تنوع اور پھیلاؤ موجود ہے، وہ اُن کے وسیع تر تخلیقی افق کی نشان دہی کرتا ہے۔ مثلاً اُن کی یہ رباعی:

اک بار میں ساحری بھی کر کے دیکھوں   کیا فرق ہے، شاعری بھی کر کے دیکھوں
تصویروں میں اشعار کہے ہیں میں نے   شعروں میں مصوری کر کے دیکھوں

شاعری کو تصویری پیکر بنا دینے کا اُنھیں جو ملکہ حاصل تھا، وہ دراصل اُن کے خداداد مصورانہ اور خلاقانہ کمال کی دین تھا۔ غرض یہ کہ صادقین ایک ایسے خود آگاہ تخلیق کار اور فن کار ٹھہرتے ہیں جنھیں اِس بات کا مکمل شعور حاصل تھا کہ اُن کا فن عصری شعور سے ہم رشتہ رہ کر ہی اپنے لیے معنوی توسیع اور تنوع حاصل کر سکتا ہے جو مقامی حد بندیوں سے نکل کر عالمی تناظر کا حامل ہو سکے وہ جانتے تھے کہ ماضی کی روایت تجربے کی پیوند کاری ہی سے برگ و بار پاتی ہے۔ جس کے

لیے فن کار اور تخلیق کار کو جہاں ایک طرف اپنی مٹی کی خوشبو اور اپنے عہد کی مہک کے احساس سے سرشار ہونا ہوتا ہے، وہیں اُس کے لیے اقصائے عالم میں برپا اُس کارنامے کا ادراک بھی ضروری ہے جس سے دنیا بھر کے نسبتاً کمزور اور پس ماندہ معاشرے دوچار ہو رہے ہیں، چناچہ اُن کے فن اور تخلیق میں تیسری دنیا کے مفلوک الحال عوام کے لیے ہمدردانہ رَو جاری و ساری نظر آتی ہے، وہ اُن کے اِسی احساس کی نشان دہی کرتی ہے۔ اُنھوں نے غالبؔ، اقبالؔ اور فیضؔ کی شاعری کو صورت گری کے لیے اسی لیے تو منتخب کیا تھا کہ وہ اِن برگزیدہ فن کاروں میں جہاں اِن کے عصر کی سچائیوں کو سانس لیتے ہوئے دیکھ سکتے تھے، وہیں اِن کی آنکھوں میں آنے والے عہد کے خواب کی پرچھائیاں بھی دیکھ پانے کی صلاحت رکھتے تھے، اسی لیے صادقین نے اپنے پیش رووں کی شاعری کو محض روایتی انداز میں مصور کرنے کے بجائے اپنے مُوقلم سے اُن مختلف معنوں، تہوں اور پہلوں کو اجاگر کر دیا ہے جو غالبؔ اور فیضؔ کی شاعری میں اُنھیں محسوس ہوتے تھے۔

صادقین حقیقی معنوں میں BORN GENIUS تھے اور اُن کے GENIUS کا اظہار امروہہ کی گلیوں کے در و دیوار پر لڑکپن کے زمانے سے شروع ہو گیا تھا، اور وقت کے ساتھ اُن کے فن کے تمام شعبے پروان چڑھتے رہے اور بامِ ثریا کو چھونے لگے۔ صادقین کا کہنا ہے کہ میں خود اپنا شاگرد ہوں۔ ہاں! ترتیب نقاش ازلی نے کی ہے۔ وہ اپنے فن کی انفرادیت پر نازاں بھی تھے اور اُس کی عظمت و رفعت کا ادراک بھی رکھتے تھے۔ اُن کا خیال ہے کہ استاد کی تربیت پرانے اصولوں کے مطابق ہوتی ہے اور اس طرح فن محدود ہو جاتا ہے اور اُس میں جدت کا فقدان ہوتا ہے وہ یہ بات اپنی رباعی میں کہہ گئے ہیں۔

نقل و تقلید سے میں ہوں یوں آزاد	فن ہے تخلیق و اختراع و ایجاد
آپ اپنا ہوں شاگرد، خود اپنا استاد	خطاطی میں، شاعری میں نقاشی میں

جیسا کہ بیان ہو چکا ہے صادقین BORN GENIUS تھے اور اِس کا اظہار عہدِ طفولیت سے ہونا شروع ہو گیا تھا۔ اُن کے کلیات 'رباعیاتِ صادقین' میں جس کے مرتب و مدون سید

سلطان احمد نقوی ہیں، 'اوائلِ حیات کی کچھ یادیں' کے آخری حصے میں 'جزوِ بوسیدہ' کے زیرِ عنوان کچھ نظمیں بھی شاملِ کلیات ہیں۔ یہ کلام بقول خود اُن کے ''فقیر صادقین کی انیس سال کی عمر تک کی وہ باقیاتِ شاعری ہیں جو ضائع ہونے سے رہ گئیں''۔ اُس دور کی شاعری میں جہاں صادقین کی خلاّقیت کی جہات ظاہر ہوئی ہیں، وہاں اُن کے جہانِ فکر و دانش کی جلوہ سامانیاں بھی سامنے آئی ہیں۔ اُن کی خلاّقیت اور افکار و نظریات کا سرچشمہ ایک ہی پہاڑ کی چوٹی سے پھوٹا ہے اور اُن کے دھارے اور لہریں ایک دوسرے میں مدغم نظر آتے ہیں۔ فکر و تخلیقیت کا یکساں بہاؤ اُن کی خطاطی اُن کی نقاشی، اُن کی مصوّری اور ان کی شاعری میں جلوہ گر ہے اور آنکھوں کو خیرہ کیے رکھتا ہے۔ مذکورہ ابتدائی دور کی شعری تخلیقات کے بارے میں اُن کے چار مصرعے ملاحظہ ہوں:

آگے کوئی اشعار کی پھلواریاں ہیں نقاشیاں کرنے ہی کی تیاریاں ہیں
اِس جلد کے گوشۂ ادب میں میری اے دوست! لڑکپن کی غلط کاریاں ہیں

مذکورہ غلط کاریوں کی فہرست میں دیگر منظومات کے علاوہ درجِ ذیل فکر انگیز نظمیں خصوصی توجہ کی طلب گار ہیں جن میں اُن کے جہانِ دانش کی وسیع تر سرحدیں دکھائی دیتی ہیں۔ 'میرا سیارہ'، 'کائنات اور ابن آدم'، 'غالب اور مارکس'، ان کے علاوہ چند مختصر نظمیں ہیں جن میں مندرجہ ذیل فلسفیوں، سائنس دانوں، مفکروں اور تخلیق کاروں کے حوالے سے ان کے نظریات کا منظوم بیان ہے:

افلاطوں، رومی، عمر خیام، گوئٹے، شیلے، رسکن، نیٹشے، اقبال اور آئن اسٹائن۔ یہ نظمیں صادقین کی وسعتِ فکر و نظر اور دائرۂ مطالعہ کا پتا دیتی ہیں جو سفرِ حیات کے ابتدائی دور سے ظہور پذیر ہونا شروع ہوئیں۔ اسی گوشۂ ادب میں اُن کی قدرے بڑی نظم دورِ حاضر کے 'انسان' کا رجز ہے اس کے حوالے سے ایک ابتدائیہ نظم سے پہلے لکھا گیا ہے جو صادقین کی بصیرت، تعقل پسندی تاریخی شعور اور عظمتِ بشر پر ایقان کا اظہار ہے۔ وہ فرماتے ہیں:

''عصرِ جدید کا انسان ایک ایسے مقام پر کھڑا ہے جہاں سے اُسے اُس کی تمام کارفرمائیاں دکھائی دے رہی ہیں۔ کہیں شعلے بھڑکتے دکھائی دے رہے ہیں کہیں سے گولوں کی آواز اور

توپوں کی گرج کانوں میں آرہی ہے؛ کہیں متضاد سیاسی نظریات کی بنا پر زبانی جنگوں کی صدائیں کانوں میں آرہی ہیں؛ کہیں لہو کی ندیاں بہتی دکھائی دے رہی ہیں؛ کہیں کارخانے دکھائی دے رہے ہیں، اُن میں بنتے ہوئے آلاتِ تباہی پر نظر پڑ رہی ہے؛ کہیں عمودی عمارات بادلوں سے سرگوشیاں کرتی ہوئی نظر پڑ رہی ہے؛ کہیں مشعلِ علم اور شمعِ فن کی ضو دکھائی دے رہی ہے؛ کہیں خونی سیاست، نسل و خون کے درختوں کی پُراسرار گھنی چھاؤں میں رقص کرتی نظر آرہی ہے؛ کہیں سرمایہ داروں کا جور دیوارِ اخلاق میں نقب لگاتا ہوا دکھائی دے رہا ہے؛ کہیں قندیلِ تہذیب اور چراغِ تمدن کی روشنی نظر آرہی ہے؛ فضا میں طیارے، سمندر میں جہاز اور خشکی پر ریلیں، موٹریں اور ٹینک دکھائی دے رہے ہیں؛ کہیں مشین مہینوں میں ہونے والا کام لمحوں میں انجام دیتی ہوئی نظر آرہی ہے"

اس تصور خانہ کی یہ رنگارنگ تصاویر جو اُس کے قابلِ ناز مرقعات ہیں، اُس کو فخر و نازش کا موقع دیتے ہیں جس کی بنا پر وہ کہنا شروع کر دیتا ہے:

حقیقت میں مرا دل جرأت و ہمت کا ہے مخزن   میرے تیشے کی بُرِش سے دلِ کہسار میں دھڑکن

علم اپنا کروں گا نصب اب میں ماہِ تاباں پر   مرا قبضہ ہے آب و خاک و بادو باراں پر

ترقی کی حدِ آخر پہ خود کو دیکھتا ہوں میں   میں کیا ہوں، کون ہوں، انسانِ عہدِ حاضر ہوں

اِس حصہء کلیات میں ایک سادہ سی نظم 'رجعت پسندی'، کے زیرِ عنوان ہے جو نظریاتی حوالے سے بڑی اہمیت کی حامل ہے۔ اُس نظم کا آخری شعر ہے:

ہمیشہ جنگ بن کر عرصہء عالم پہ چھاتی ہے   یہی انساں کی ہستی خاک میں اکثر ملاتی ہے

صادقین جیسا کہ پہلے کہا گیا ہے BORN GENIUS تھے بلکہ اُنھیں VERSATILE GENIUS کہنا بھی نادرست نہیں ہوگا، کیونکہ اُن کی کثیر الجہت شخصیت کا ہر شعبہ مصوری، نقاشی خطاطی اور شاعری یکساں فن کارانہ اور مفکرانہ عظمت کا حامل ہے۔ شاعری

کے شعبے میں اُنھوں نے مشکل ترین صنف رباعی کا انتخاب کیا اور شعوری طور پر کیا۔ اس ضمن میں اُن کی ایک رباعی نذرِ قارئین ہے۔

خیّام کو اک کتاب میں نے دی ہے　　سرمد کی مئے عذاب میں نے پی ہے
اصنافِ ادب میں سب سے کٹر ہے جو صنف　　اپنے لیے انتخاب میں نے کی ہے۔

اِس شعبے یعنی رباعیاتِ صادقین کے حوالے سے ڈاکٹر فرمان فتح پوری کے مضمون کا درجِ ذیل اقتباس بڑی معنویت کا حامل ہے؛

"صادقین کی فنی و تخلیقی شخصیت عمر خیّام سے بہت مشابہ ہے۔ صادقین نے پہلے بُرش اور رنگ کی مدد سے مصوری کی دنیا میں ایک انقلاب برپا کیا اور عالمی سطح پر اپنی تخلیقی صلاحیتوں کا اعتراف کروایا، پھر رنگ اور برش سے آگے بڑھ کر حرف وصوت سے رجوع کیا اور رباعی نگار شاعر کی حیثیت سے ایسی بحر کی تہ سے آب دار موتی نکالے جس میں خود خیّام نے غواصی کی تھی، گویا خیّام اور صادقین فکری و تخلیقی اعتبار سے ایک بحر کے ہم دست و ہم رنگ شناور ہیں۔ فرق یہ ہے کہ انگریزی میں ترجمے کی بدولت خیّام کی شہرت اپنے دائرے سے نکل کر عالمی سطح تک پہنچ گئی اور صادقین کی شہرت ابھی اردو کے حلقۂ اثر تک محدود ہے"۔

صادقین کا قبیلہ سُقراط سے تعلق ہے۔ وہ ایک عظیم خلّاق ہونے کے ساتھ ایک عظیم آفاقیت پسند مفکر تھے اور اُن کا خلّاقانہ اور مفکرانہ منصب میرے نزدیک یکساں عظمت کا حامل ہے۔ وہ یقیناً معروف معنوں میں عملی سیاست میں سرگرمِ عمل نہیں رہے، مگر فکری محاذ پر اُن کا کمٹمنٹ بہت ارفع تھا۔ نقاشی میں اِس کا اظہار علامات اور استعارات کی زبان میں کیا گیا ہے، جبکہ شاعری میں اور خصوصیت کے ساتھ اُن کی رباعیات میں یہ اظہار کہیں بلند آہنگی کے ساتھ ہوا ہے اور کہیں فلسفیانہ الفاظ بھرپور طور پر پائے جاتے ہیں۔ اُن دُکھوں اور زخموں کی چارہ جوئی وہ ایک ایسے معاشرے کی تشکیل میں دیکھنے کے تمنائی ہیں جو ظلم واستحصال اور عدمِ مساوات سے پاک ہو۔ وہ موجودہ طبقاتی معاشرے میں انسان کے ہاتھوں انسان کا استحصال کے خاتمے کی قطعی توقع نہیں

رکھتے، وہ اِس استحصالی نظام میں ظلم، جبر اور جہل و افلاس کو معاشرے کا مقدر گردانتے ہیں اور اس باب میں اپنے کرب و احساس کو شعری پیکر اور اپنی نقاشی میں پوری شدت کے ساتھ اظہار کرتے ہیں۔ صادقین صوفی منش عظیم تخلیق کار تھے، اور اُن کے خوابوں کی دنیا اور نظریات کی سرحدیں فیض احمد فیضؔ کے خوابوں کی دنیا اور نظریات کی سرحدوں کے دائرے پھیل کر ایک دوسرے میں گھل مل گئے ہیں۔ اس تحریر کے ابتدائی حصے میں پیش کردہ فیضؔ صاحب کا ایک اقتباس صادقین کے فکروفن کے حوالے سے اسی زاویہ کا حامل ہے۔

طارق بن عمر

فیض احمد فیضؔ بحیثیت ایک عظیم مفکر

اگر ہم زندگی کی پیچیدگیوں پر غور کرنا شروع کریں تو یہ زندگی اُس پیاز کی مانند نظر آئے گی کہ جس کی پرتیں، آپ جیسے جیسے اُتارتے چلے جائیں گے ویسے ویسے ایک نیا رنگ اور ایک نیا روپ سامنے آئے گا۔ فیضؔ کے خیالات نے بھی کچھ ایسا ہی رنگ اپنایا۔ اپنے جذبات کو ذہن کی اُس سطح تک لانا کہ جہاں مظہرِ حیات کا مقصد معلوم ہو جائے اور انفرادی و اجتماعی پہلوؤں کو ساتھ ساتھ مدِ نظر بھی رکھا جائے۔ زندگی وقت کے ساتھ ہم آہنگ ہو جاتی ہے اور انہی عناصر کو فیضؔ نے قربت کا نام دیا۔

دشتِ تنہائی میں اے جانِ جہاں لرزاں ہیں　　تیری آواز کے سائے، تیرے ہونٹوں کے سراب
دشتِ تنہائی میں یادوں کے خس و خاک تلے　　کھل رہے ہیں تیرے پہلو کے سمن اور گلاب

اُٹھ رہی ہے کہیں قربت سے تری سانس کی لَو　　اپنی خوشبو میں سُلگتی ہوئی مدہم، مدہم
دور اُفق پار چمکتی ہوئی قطرہ قطرہ　　گر رہی ہے تری دلدار نظر کی شبنم

اس قدر پیار سے اے جانِ جہاں رکھا ہے　　دل کے رخسار پہ اس وقت تیری یاد نے ہات
یوں گماں ہوتا ہے گرچہ ہے ابھی صبحِ فراق　　ڈھل گیا ہجر کا دن آ بھی گئی وصل کی رات

فیض احمد فیضؔ نے حال، ماضی اور مستقبل کو اس طرح سے پھیلایا کہ وہ منتشر خیالات کا مجموعہ ہوتے ہوئے بھی ایک نقطۂ نظر پر آ کر ٹھہر گئے۔ شاید اس لئے کہ ماضی و حال کے واقعات نے یا مستقبل کے تصورات نے خارجیت سے زیادہ داخلیت پسندی پر زور دیا۔

فیضؔ کے اندر کے انسان نے زندگی میں عدمِ توازن کے خلاف جو آواز اُٹھائی، اُس میں صبر کا مادہ کوٹ کوٹ کر بھر دیا۔ ایک فرد اپنے متعلق تو بہت کچھ سوچتا ہے، دوسروں کے متعلق سوچنا اور وہ بھی مثبت اندازِ فکر کے ساتھ ذرا مشکل ہے۔

فیضؔ کی فکر کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ اس نے ہمارے عقیدوں سے زیادہ

ہمارے اُن زخموں پر مرہم رکھا کہ جن کو ہم معاشرے کے سامنے لانے سے گریزاں رہے ہیں۔ ایک ایسے خوف کے تحت ہم یہ عمل کرتے ہیں کہ جس کا جواب شاید خود ہمارے پاس بھی نہیں۔

فیض احمد فیضؔ نے تبدیل ہوتے ہوئے زمانے کو پہچانا اور اس بدلتی دنیا میں ایک ایسے انسان کو اپنی جگہ بنانے کی فکر عطا کی کہ جس انسان سے معاشرے نے انسان ہونے کا احساس بھی چھین لیا تھا۔ چنانچہ اِن تبدیلیوں کو محسوس کرنا، انہیں ایک نظریہ دینا اور پھر اُسے مقصد کی چھتری بھی فراہم کرنا، یہ سب اُسی وقت ممکن ہے جب آدمی خود کو کسی بڑے مثبت مقصد کے لئے وقف کر دے۔ فیضؔ نے اسی روایت کو قائم رکھا۔

کب ٹھہرے گا درد اے دل، کب رات بسر ہوگی — سنتے تھے وہ آئیں گے، سنتے تھے سحر ہو گی
کب جان لہو ہوگی، کب اشک گہر ہوں گے — کس دن تری شنوائی اے دیدۂ تر ہو گی
کب مہکے گی فصلِ گل، کب بہکے گا میخانہ — کب صبحِ سخن ہو گی، کب شامِ نظر ہو گی
واعظ ہے نہ زاہد ہے، ناصح ہے نہ قاتل ہے — اب شہر میں یاروں کی کس طرح بسر ہو گئی
کب تک تری رہ دیکھیں اے قامتِ جانانہ — کب حشر معیّن ہے تجھ کو تو خبر ہو گی

فیضؔ نے اپنی فکر کو ایک دیوتا کا روپ دینے کے بجائے، اسے زندگی کے رنگ میں ڈھالنے کی کوشش کی۔ فیضؔ نے اپنی شاعری میں جہاں ایک طرف مشرقی روایت کے تسلسل کو برقرار رکھا، وہیں مغربی عنصر کو بھی شامل حال رکھنا ضروری سمجھا۔ وہ زندگی میں حرکت اور جمود کے قانون سے اچھی طرح واقف تھے، اِسی لئے انہوں نے معاشرے کے تمام خدّ و خال پر نظر رکھی۔ وہ زندگی کا احترام بھی چاہتے تھے اور زندگی کی فطرت سے بھی واقف تھے چنانچہ اس فطرت کو محبت اور عمل کا قانون بھی عطا کیا۔

تجھ سے کھیلی ہیں وہ محبوب ہوائیں جن میں — اس کے ملبوس کی افسردہ مہک باقی ہے
تجھ پہ بھی برسا ہے اس بام سے مہتاب کا نور — جس میں بیتی ہوئی راتوں کی کسک باقی ہے
تو نے دیکھی ہے وہ پیشانی، وہ رخسار، وہ ہونٹ — زندگی جن کے تصور میں لُٹا دی ہم نے
تجھ پہ اُٹھی ہیں وہ کھوئی ہوئی ساحر آنکھیں — تجھ کو معلوم ہے کیوں عمر گنوا دی ہم نے

فیض نے اپنی شاعری میں محبت و اخلاص کے چمن میں جہاں زرد پتوں کو بچھایا وہیں سُرخ گلاب اور موتیا کے پھول بھی بکھیرے، یوں نا اُمیدی میں اُمید کی کرن پیدا کی۔ احساسِ جمال کو زندگی سے باہم پیوست کر دینا، فیض ہی کا کارنامہ ہے۔ جب انسان کے خیالات نشیب و فراز سے گزرنے لگ جائیں تو سمجھ لینا چاہیئے کہ یا تو وہ فرد پختگی کی جانب گامزن ہے یا پھر الفاظ سے زیادہ وہ فرد خیالات کو اہمیت دے رہا ہے۔ اس عمل کو ہم اُس تخلیقی عمل کا نام دے سکتے ہیں، جہاں پر تخیل کی فضا حقیقت پر حاوی ہو جاتی ہے، لیکن فرد کا مشاہدہ اور جذبہ منفرد ہونے کے ساتھ ساتھ اگر اپنی طاقت بھی رکھتا ہو تو فرد اس کیفیت سے خود بخود نکل آتا ہے، فیض نے بھی نہ صرف اِن اجزاء کو سمجھا، بلکہ اس میکانیکی عمل سے گزرے بھی۔ اس لئے سماجی اکائی کے اُس عمل کو بہتر طور سے سمجھ سکے جہاں جسم اور روح کی تشنگی نے خوف کے لباس کو اُتار پھینکا۔

عہد شناسی جہاں ایک طرف اپنے اندر سُکھ لئے ہوئے ہوتی ہے، وہیں دُکھ کا عنصر بھی اس میں کارفرما رہتا ہے۔ ایک تجزیہ نگار اور زندگی کو ہر پہلو سے پرکھنے والا انسان جب زندگی کی باریکیوں میں جاتا ہے تو اُس پر احساسات و جذبات کے کئی پہلو آشکار ہوتے ہیں۔ فیض نے بھی اس عہد شناسی کے رُخ کو باقاعدگی سے پرکھا۔ اس عمل میں فرد شعوری اور غیر شعوری طور پر حالات و واقعات، ماحول اور مادی لہروں سے مسلسل متاثر ہوتا رہتا ہے، اور فرد کا ہر لمحہ اِن عناصر سے اپنا حصہ وصول کرتا رہتا ہے۔ فیض نے بھی اس حسا سیت کو پوری طرح محسوس کیا:

هم کہ ٹھہرے اجنبی اتنی ملاقاتوں کے بعد — پھر بنیں گے آشنا کتنی مداراتوں کے بعد
کب نظر میں آئے گی بے داغ سبزے کی بہار — خون کے دھبے دُھلیں گے کتنی برساتوں کے بعد
تھے بہت بے درد لمحے ختمِ دردِ عشق کے — تھیں بہت بے مہر صبحیں مہرباں راتوں کے بعد
دل تو چاہا پر شکستِ دل نے مہلت ہی نہ دی — کچھ گلے شکوے بھی کر لیتے مناجاتوں کے بعد
اُن سے جو کہنے گئے تھے فیض جاں صدقہ کئے — اَن کہی ہی رہ گئی وہ بات سب باتوں کے بعد

کم ہی لوگ قوم اور تہذیب کا جھومر ہوتے ہیں اور فیض احمد فیض بھی اِن کم ہی لوگوں میں

شامل ہیں۔ اُن میں درد کو سہنے اور محسوس کرنے کا جذبہ موجود تھا، اسی لئے اُن کی شاعری جہاں ایک طرف روایتی خیالات کو لئے ہوئے ہے تو دوسری جانب ترقی پسندی کا عنصر بھی رکھتی ہے، کہ درد کو اپنی روح کی گہرائیوں تک محسوس کرنا ازل سے انسان کا تجربہ رہا ہے۔ چھوٹی چھوٹی اچھائیاں انسان کو بڑا بنا دیتی ہیں اور فیض صاحب بھی ان چھوٹی چھوٹی اچھائیوں کا مجموعہ تھے۔ اُن کی فکر میں ہمیں حقیقت کا ایک ایسا امتزاج نظر آتا ہے کہ جس نے ہمارے احساسات کے لطیف پردوں تک کو چھو لیا ہے اور تسلسل اور ربط کی نزاکت کو سامنے رکھتے ہوئے، مانوسیت کی لہر کو پیدا کیا ہے۔ غرض فیض کی فکر کا جو حدود اربعہ ہے وہ اپنے اندر ایک وسیع اور متنوع نظریات کو منظر و پس منظر کے ساتھ سموئے ہوئے ہے۔

سبھی کچھ ہے تیرا دیا ہوا، سبھی راحتیں، سبھی کلفتیں — کبھی صحبتیں، کبھی فرقتیں، کبھی دوریاں، کبھی قربتیں

یہ سخن جو ہم نے رقم کیے یہ ورق ہیں تیری ہی یاد کے — کوئی لمحہ صبحِ وصال کا کئی شامِ ہجر کی مدتیں

جو تمہاری مان لیں ناصحا تو رہے گا دامنِ دل میں کیا — نہ کسی عدو کی عداوتیں، نہ کسی صنم کی مروتیں

چلو آؤ تم کو دکھائیں ہم جو بچا ہے مقتلِ شہر میں — یہ مزار اہلِ صفا کے ہیں، یہ ہیں اہلِ صدق کی تربتیں

مری جان آج کا غم نہ کر نہ جانے کاتبِ وقت نے — کسی اپنے کل میں بھی بھول کر، کہیں لکھ رکھی ہوں مسرتیں

سپاس جنابِ امیرؑ از ڈاکٹر محمد اقبالؒ

ماخوذ از رسالہ مخزن ۱۹۰۵ء ناشر و مدیر بیرسٹر عبدالقادر شیخ (مرحوم)

فارسی کلام	اردو ترجمہ وتشریح
۱- اے محوِ ثنائے تو زبانہا	اے وہ ذات جس کی تعریف میں مخلوق کی زبانیں مصروف ہیں
اے یوسفِ کاروانِ جانہا	اے وہ ذات جو روحوں کے قافلے کا یوسف یعنی سردار و راہنما ہے
۲- اے بابِ مدینۂ محبت	اے شہرِ محبت کے دروازے
اے نوحِ سفینۂ محبت	اے راہِ خدا میں محبت کی کشتی نوح
۳- اے کاہِ نقشِ باطلِ من	اے 'میں' کے باطل نقش کے مٹانے والے
اے فاتحِ خیبرِ دلِ من	اے میرے دل کے خیبر کے فتح کرنے والے
۴- اے سرِّ خطِ وجوب و امکان	اے خالق و مخلوق (واجب و ممکن) کی درمیانی حد کے راز
تفسیرِ تو سورہ ہائے قرآں	قرآن مجید کے سورے آپ ہی کی تفسیر ہیں
۵- اے مذہبِ عشق را نمازے	مذہب عشقِ الٰہی کی نماز
اے سینۂ تو امینِ رازے	اے وہ ذات جس کا سینہ راز ہائے خداوندی کا امانت دار ہے
۶- اے سرِّ نبوتِ محمدؐ	اے نبوتِ حضرت محمدؐ کے چھپے ہوئے حقیقی راز
اے وصفِ تو مدحتِ محمدؐ	اے وہ ذات جس کی تعریف خود رسول کی مدح ہے
۷- گردوں کہ بہ رفعت ایستادہ ست	یہ آسمان جو بلندی پر قائم ہے
اے بامِ بلندِ تو فتادہ ست	آپ کی بلندی و عظمت کے سامنے جھکا ہوا ہے
۸- ہر ذرہ در گہت چو منصور	آپ کی بارگاہ کا ہر ذرہ انتہائی منور ہونے کی بنا پر سرخوشی اور سرمستی
در جوش ترانہ انا الطور	میں منصور حلاج کی طرح انا الطور کا نعرہ لگاتا ہے
۹- بے تو نتواں با و رسیدن	بغیر آپؑ کے کوئی اللہ (یا رسول اللہ) تک نہیں پہنچ سکتا
بے اُو نتواں بہ خود رسیدن	بغیر خدا (کی توفیق) کے آپ تک رسائی نہیں ہو سکتی

۱۰-فردوس زتو چمن در آغوش	جنت آپ کے وجود کی وجہ سے ایک چمن لئے ہوئے ہے
از شانِ تو حیرت آئینہ پوش	اور آپ کی شان کے سامنے حیرت و تعجب آئینہ کی طرح کا لباس پہنے ہوئے ہے
۱۱-جانم بغلامئی تو خوشتر	میری جان آپ کی غلامی پر خوش ہے
سر بر زدہ ام زحیبِ قنبر	اور میں آپ کے غلام قنبر کے گریبان سے سر نکالے ہوئے ہوں
۱۲-ہشیارم و مستِ بادۂ تو	میں آپ کی شرابِ محبت میں مدہوش ہوں
چوں سایہ زپا فتادۂ تو	آپ کے قدموں کے نیچے مثل سائے کے پڑا ہوں
۱۳-از ہوش شدم مگر بہوشم	گویا مدہوش ہوتے ہوئے بھی میں ہوش میں ہوں
گوئی کہ نصیریؔ خموشم	اگر تم کہو کہ میں نصیری ہو گیا ہوں تو میں یہ سن کر خاموش ہوں
۱۴-دانم کہ ادب بہ ضبطِ راز است	میں جانتا ہوں ادب کا تقاضا یہی ہے کہ راز چھپا رہے
در پردہ خامشی نیاز است	اور خاموشی کے پردے میں اظہار محبت ہو
۱۵-اما چہ کنم مئے تولا	لیکن کیا کروں کہ تولا کی شراب
تیز است بروں فتد ز مینا	تیز ہے اور جام (یعنی میرے دل کے جام) سے ابل پڑتی ہے
۱۶-ز اندیشۂ عاقبت رہیدم	اب میں قیامت کے حساب کے خوف سے آزاد ہو گیا ہوں
جنسِ غمِ آلِ تو خریدم	کیونکہ میں نے آل رسولؐ کے غم کی جنس (یعنی غم حسین) کو خرید لیا ہے
۱۷-فکرم چو بجستجو قدم زد	میری فکر نے تلاش محبوب کے لئے جستجو کے میدان میں جب قدم رکھا
در دیر شد و در حرم زد	تو کبھی حصول مقصد کے لئے دیر میں پہنچی کبھی درِ کعبہ کھٹکھٹایا
۱۸-در دشتِ طلب بسے دویدم	میں نے جستجو (طلب) کے دشت میں بڑی تگ و دو کی
دامن چو گردباد چیدم	اور بگولے کی طرح بیابان کو چھان مارا
۱۹-در آبلہ و خار باخلیدہ	میرے پاؤں کے چھالوں میں کانٹے چبھ گئے
صد لالہ تہہ قدم دمیدہ	اور خون نے ان زخموں سے جاری ہو کر زمین پر جابجا گلِ لالہ کھلا دیئے

۲۰-افتادہ گرہ بروئے کارم — میری حاجتوں میں گرہ لگی ہوئی ہے

شرمندۂ دامنے غبارم — میں غبار عصیاں سے بھرے اپنے دامن سے شرمندہ ہوں

۲۱-جویاں بے خضر سوئے منزل — میں منزل تک نہ پہنچنے کے غم سے شکستہ حال تھا یہ تلاش بغیر خضر کے تھی

بردوش خیال بستہ محمل — میں اپنے خیال کے کاندھوں پر محمل رکھے چلا جا رہا تھا۔

۲۲-جویائے (کے) وشکستہ جامے — تلاش آپ کی ولا اور محبت کی شراب کی تھی

چوں صبح بباد چیدہ دامے — میری حالت ایسی تھی جیسے نسیم صبح کے چلنے کے ساتھ طائر خود کو دام میں پھنسا ہوا پائے

۲۳-پیچیدہ (بخود) چو موجِ دریا — میں موجِ دریا کی طرح خود اپنے آپ میں لپٹا ہوا تھا

آوارہ چو گرد بادِ صحرا — اور مثل گرد باد (ہوا کے بگولے) کے صحرا میں اِدھر اُدھر بھٹک رہا تھا

۲۴-وامانده زدردِ نارسیدن — میں منزل تک نہ پہونچنے کے درد کی شدت سے بے حال تھا

در آبلہ شکستِ دامن — پاؤں کے پھولے ہوئے چھالوں سے زمین کے دامن کو (لالہ زار) بنا رہا تھا

۲۵-عشقِ تو دلم ربود ناگاہ — کہ اچانک میرے دل میں آپ کے عشق کی کونپل پھوٹی

از کار گرہ کشود ناگاہ — اور میری عقدہ کشائی کر دی جو گرہ لگی ہوئی تھی کھول دی

۲۶-آگاہ ز ہستی و عدم ساخت — آپ کے عشق نے مجھے فنا اور بقا کے راز سے واقف کر دیا

میخانۂ عقل را حرم ساخت — میری عقل و فکر کو حقیقت سے آشنا اور یوں عقل کے میخانہ کو حرمِ خدائے واحد و یکتا بنا دیا

۲۷-چوں برق بجز منم گزر کرد — آپ کے عشق کی آگ مثل برق میرے جسم میں اِدھر سے اُدھر تک گزر گئی

از لذتِ سوختم خبر کرد — یوں میں عشق کی آنچ میں جلنے کی لذت سے آشنا ہو گیا

۲۸-برباد متاع ہستیم داد — ایک تباہ حال کو زندگی کی دولت سے مالا مال کر دیا

جامے ز مے حقیقتم داد — میرے دل کے جام کو حقیقت (حق) کی مے سے بھر دیا

۲۹- سرمست شدم ز پا فتادم	میں آپ کی ولائے میں مے کے جام پی کر اتنا مست ہوا کہ قدموں پر گر پڑا
چوں عکس ز خود خدا فتادم	بالکل اسی طرح جیسے میرا سایہ مجھ سے جدا ہو کر زمین پر (گر) پڑتا ہے
۳۰- پیراہن ما و من دریدم	میں نے ''ہم اور میں'' کے لباس کو تار تار کر دیا
چوں اشک ز چشم خود چکیدم	اور آنسو کی طرح اپنی آنکھ سے دامن زمین پر گر گیا
۳۱- خاکم بفرازِ عرش بُردی	آپ کی محبت نے خاک کے اس پیکر کو عرش کی بلندی تک پہنچا دیا
زاں راز کہ با دلم سپردی	آپ نے ایسا رازِ حقیقت میرے دل کو سپرد کیا ہے
۳۲- واصل بکنار کشتیم شد	اب میرے دل کی کشتی ساحل سے واصل ہوگئی اور کنارے لگ گئی
طوفانِ جمال ز شتیم شد	اب میری برائی اور بدصورتی حسن و جمال کا ایک طوفان بن گئی ہے
۳۳- جز عشق حکایتے ندارم	اس عشق کے افسانے کے علاوہ میرے پاس کچھ نہیں ہے
پروائے ملامتے ندارم	مگر اس پر مجھے ملامت کی کچھ پروا نہیں ہے
۳۴- از جلوۂ علم بے نیازم	اب میں اصل معرفت کی وجہ سے
سوزم، گریم، تپم گدازم	محبت کی حقیقی آگ میں جل رہا ہوں، آنسو بہا رہا ہوں، تڑپ رہا ہوں اور پگھل رہا ہوں

پروفیسر ڈاکٹر غلام شبیر رانا

جمیل الدین عالی: 'ایک روشن دماغ تھا نہ رہا'

ایک بے خوف صدا خاموش ہو گئی حریت فکر کے ایک مجاہد نے ترکِ رفاقت کی۔ ہماری بزمِ وفا اور محفل ادب میں موجود عالمی شہرت کے حامل مایۂ ناز پاکستانی ادیب، نابغۂ روزگار دانش ور صحافی، ڈرامہ نگار، ماہر لسانیات، نقاد، مورخ، محقق، لغت نویس، معمار علم و ادب، مضمون نگار، نغمہ نگار، کالم نگار، ماہر علم بشریات اور انسانی حقوق کے نڈر محافظ جمیل الدین عالی نے عدم کی بے کراں وادیوں کی جانب کوچ کے لیے رخت سفر باندھ لیا۔ وہ کچھ عرصہ سے عارضہ قلب میں مبتلا تھے اور کراچی کے ایک نجی شفا خانے میں زیرِ علاج تھے لیکن معالجین کی سب تدبیریں اُلٹی ہو گئیں اور دوا نے کچھ کام نہ کیا اور بالآخر بیماریٔ دِل نے ان کی زندگی کی شمع گل کر دی۔ ۲۰ جنوری ۱۹۲۵ء کو دہلی میں امیر الدین احمد خان اور سیدہ جمیلہ بیگم کے گھر جو آفتاب علم و ادب طلوع ہوا وہ ۲۳ نومبر ۲۰۱۵ء کو کراچی میں ہمیشہ کے لیے غروب ہو گیا۔ انا للّٰہ وانا الیہ راجعون۔ آرمی قبرستان کراچی کی زمین نے ادبیات عالم کے اس آسمان کو قیامت تک کے لیے اپنے دامن میں چھپا لیا۔ اجل کے بے رحم ہاتھوں نے وہ آواز دائمی خاموشیوں کی بھینٹ چڑھا دی جو جابر سلطان کے سامنے کلمۂ حق کہنے کی تاب و تواں رکھتی تھی۔ وہ دبنگ لہجہ اور نوائے دلِ کشا جس نے مسلسل آٹھ عشروں تک سعی پیہم کو شعار بناتے ہوئے حریت فکر و عمل کا علم بلند رکھا، حریت ضمیر سے جینے کی راہ دکھائی، وطن، اہل وطن اور ملت اسلامیہ کی حیات دوام کی دُعا اور سدا ''جیوے پاکستان'' کی ابد آشنا تمناؤں سے دِلوں کو مرکز مہر و وفا کیا اس کو سننے کے لیے کان ترس جائیں گے لیکن اب یہ آواز کبھی سنائی نہ دے گی۔ جمیل الدین عالی نے حب الوطنی علم دوستی اور انسانیت نوازی کی ایسی درخشاں مثال پیش کی جو تا ابد لائق تقلید سمجھی جائے گی۔

جمیل الدین عالی کی رحلت سے عالمی ادبیات کا ایک درخشاں عہد اپنے اختتام کو پہنچا۔ انسانیت کے وقار اور سر بلندی کی ایک عظیم روایت ختم ہو گئی۔ فنونِ لطیفہ سے دلچسپی رکھنے

والے نوجوان ادیب اور تخلیق کار اپنے مونس وغم خوار خضر راہ سے محروم ہو گئے ۔ آلام روزگار کے پاؤں میں پسنے والے مفلس، نادار اور بے بس تخلیق کاروں کا مسیحا زینۂ ہستی سے اُتر گیا۔ آہ! پاکستانی زبانوں کے ادب کی ترویج و اشاعت کا عہد زریں اپنے اختتام کو پہنچا۔ پاکستان کے قومی تشخص کی علامت اور انسانیت کے وقار اور سر بلندی کا مظہر نادر و نایاب کوہ پیکر ادیب رخصت ہو گیا۔ یگانۂ روزگار فاضل سے ہم محروم ہو گئے جس نے آٹھ عشروں تک بصیرت افروز خیالات اور فکر پرور رہنمائی سے ذہن و ذکاوت کو مہیز کر کے تعمیر وطن کی راہ ہموار کر دی۔ پاکستانی ادبیات اور انسانیت کے وقار کے ہمالہ کی ایک سر بہ فلک چوٹی طوفانی اجل کے مہیب اور لرزہ خیز بگولوں کی زد میں آ کر زمیں بوس ہو گئی۔ آزادی کے بعد سے لمحہ موجود تک پاکستان کی تاریخ کے جملہ نشیب و فراز کا چشم دید گواہ داغ مفارقت دے گیا۔ دنیا بھر کے سفر کرنے کے بعد چار دلچسپ سفر ناموں سے اُردو کی ثروت میں اضافہ کرنے والا مسافر راہ جہاں سے گزر گیا۔ سلطانیٔ جمہور کے استحکام کی خاطر آمریت کے تراشے ہوئے بتوں کو تیشۂ حرف سے پاش پاش کرنے والا حریت فکر و عمل کا مجاہد اب کہاں ملے گا؟ روز نامہ ''جنگ'' میں شائع ہونے والے اپنے اخباری کالم ''نقار خانے میں'' کے عنوان سے مضامین لکھ کر سماجی اور معاشرتی زندگی کے مسائل کے نباض کی حیثیت سے اُنھوں نے جس خلوص اور دردمندی کے ساتھ اصلاح احوال کی سعی کی وہ اپنی مثال آپ ہے مُلکوں ڈھونڈنے سے بھی ایسے نایاب لوگ نہ ملیں گے۔

ایسی ہوائے ستم چلی جس کے تند و تیز بگولے پیمان وفا کے ہنگامے، ایثار، دردمندی، خلوص، مروت،، بے باک صداقت اور بے لوث محبت کی داستانیں اڑا لے گئے۔ قلم و قرطاس کو تزکیۂ نفس کا وسیلہ بنا کر خون دل میں اُنگلیاں ڈبو کر حرف صداقت پر مبنی لکھی گئی سب داستانیں تاریخ کے طوماروں میں دب گئیں جب تک دُنیا باقی رہے گی جمیل الدین عالی کے لفظ زندہ رہیں گے اور دیس کی فضاؤں میں بکھری اُن کی عطر بیز یادوں کی مہک سے قریہء جاں معطر رہے گا۔ الفاظ میرا ساتھ نہیں دے رہے کہ کیا کہوں اور کیسے لکھوں سچ تو یہ ہے کہ آج روشن خیال، با کردار، باوقار

اور حریتِ ضمیر سے جینے کے لیے اسوۂ شبیر کو اپنانے والے جری تخلیق کاروں کا میر کارواں راہیِ ملک عدم ہو گیا ہے۔ پاکستانی زبانوں کے ادب کا ہنستا بولتا چمن جان لیوا سکوت اور مہیب سناٹوں کی بھینٹ چڑھ گیا ہے۔ معاشرتی زندگی میں خوف، دہشت اور جبر کی بھیانک تاریک اور مسموم فضا میں بھی حوصلے اور اُمید کا دامن تھام کر طلوع صبح بہاراں کی نوید سنانے والا جمیل الدین عالی جیسا رجائیت پسند دانش ور اب ہمیں کبھی نصیب نہ ہوگا۔ الفاظ کے دھنک رنگوں کی باتیں، پُر لطف جملوں کے نظم کے سلسلے، شگفتہ مزاجی کی مظہر گل افشانیِ گفتار کی بہار، زندگی کی حقیقی معنویت کی تفہیم کے مقاصد سے مزین دل کش اور منفرد اسلوب، تعمیرِ وطن کے بلند آہنگ عزائم، عملی زندگی میں قناعت و استغنا کے ڈھنگ، ہر لحہ اور ہر گام اہلِ وطن کے سنگ رہتے ہوئے پاکستانی کو یتا سنانے والا صابر و شاکر ادیب کیا گیا کہ بہار کے دن ہی روٹھ گئے اور سب حقائق خیال و خواب اور سراب بن گئے۔

بارہ سال کی عمر میں جمیل الدین عالی کے سر سے باپ کا سایہ اُٹھ گیا اُن کی والدہ نے مشیت ایزدی کے سامنے سرِ تسلیم خم کرتے ہوئے بیوگی کی چادر اوڑھ لی اور اپنے بھائی سید ناصر مجید سے مل کر اپنے یتیم اور ہونہار بچے کی تعلیم و تربیت پر اپنی توجہ مرکوز کر دی۔ جمیل الدین عالی کی نصابی تعلیم کے لیے گھر پر معلم کا انتظام کیا گیا۔ اس کے بعد جمیل الدین عالی کو براہ راست پانچویں جماعت میں اینگلو عربک ثانوی مدرسہ دریا گنج دہلی میں داخلہ مل گیا۔ جمیل الدین عالی کو اپنی والدہ اور اپنے ماموں سے بہت محبت تھی۔ شوہر کی وفات کے بعد آمدنی بہت ہی کم رہ گئی جب کہ بیٹے کی تعلیم اور دیگر ضروریات کے اخراجات بڑھنے لگے۔ آزمائش کی اس گھڑی میں ان کی صابر و شاکر والدہ نے اپنے کم سن بچے کے روشن مستقبل اور گھر کے اخراجات پورے کرنے کی خاطر اپنے زیورات فروخت کر دیئے۔ کالج میں انھیں اچھا تعلیمی ماحول ملا جہاں علی سردار جعفری، اختر الایمان اور حبیب جالب سے ان کا رابطہ رہا۔ ۱۹۴۴ء میں جمیل الدین عالی نے اینگلو عربک کالج سے بی۔ اے کا امتحان پاس کیا۔ اس کے بعد انھوں نے ایم۔ اے معاشیات میں داخلہ لیا

لیکن ۳۰ ستمبر ۱۹۴۴ء کو ان کی شادی ہوگئی اس کے بعد تعلیم کا سلسلہ منقطع ہوگیا اور روزگار کے حصول کے لیے دوڑ دھوپ شروع ہوگئی۔ جلد ہی انھیں دہلی کے محکمہ ٹرانسپورٹ میں اسسٹنٹ کی حیثیت سے ملازمت مل گئی۔ شادی کے لیے جمیل الدین عالی کی نگاہ انتخاب طیبہ بیگم پر پڑی جو عمر میں ان سے سات برس بڑی تھیں۔ جمیل الدین عالی کی پسند پر سب گھر والے بے حد خوش تھے یہ شادی بہت کامیاب رہی اور میاں بیوی نے باہمی اعتماد سے اپنے گھر کو جنت کا نمونہ بنا دیا۔ ان کے تین بیٹے اور دو بیٹیاں ہیں جو عملی زندگی میں فعال کردار ادا کر رہے ہیں۔

ایک زیرک، فعال، جری اور مستعد تخلیق کار کی حیثیت سے جمیل الدین عالی نے ہر صنفِ ادب میں اپنی تخلیقی فعالیت کا لوہا منوایا۔ ان کی مضبوط اور مستحکم شخصیت کا سیارہ تخلیقی اُفق پر جس مدار میں ضوفشاں رہا اس کا محور سدا پاکستان ہی رہا۔ ان کی ہر صدا دلوں کی دھڑکنوں سے ہم آہنگ ہو جاتی اور ان کی تخلیقات پڑھ کر قارئین کے دلوں کے تار بجنے لگتے اور اس نتیجے پر پہنچتے کہ زندہ ہے پاکستان تو ہم سب زندہ ہیں۔ پاکستان ہی ہمیشہ ان کا پیغام رہا وہ یہی چاہتے تھے کہ ہر پاکستانی کی زبان پر وطن وطن ہو وہ اللہ کریم کا شکر ادا کرتے جس نے اتنے بڑی جیون ساگر میں برصغیر کی ملت اسلامیہ کو پاکستان عطا کیا۔ ان کے اسلوب سے صاف ظاہر ہے کہ پاکستان ہی ان کی پہچان ہے اور وہ اس کا برملا اظہار کرتے ہیں۔

یہ پاک سر زمیں ہے یہ پاک سر زمیں ہے
میں جتنی بار سوچوں یہ میرے راہبر ہیں میں جتنی بار گاؤں یہ بول تازہ تر ہیں
ہاں مجھ کو یہ یقیں ہے یہ پاک سر زمیں ہے

جمیل الدین عالی نے فروغ علم و ادب کے لیے انتھک جدوجہد کی۔ انجمن ترقی اُردو، اُردو یونیورسٹی اور پاکستان رائٹرز گلڈ کے لیے ان کی خدمات کا ایک عالم معترف تھا۔ وہ باسٹھ برس تک انجمن ترقی اُردو سے وابستہ رہے مگر اپنی خدمات کا کوئی معاوضہ کبھی قبول نہ کیا۔ مختلف ادبی تنظیموں کی تشکیل، ادیبوں کی فلاح و بہبود کے منصوبوں، علمی و ادبی کتب کی اشاعت، عصری آگہی

کو پروان چڑھانا، لفظ کی حرمت کو ملحوظ رکھنا، جبر کا انداز مسترد کرتے ہوئے حق و صداقت کا علم بلند رکھنا، افکارِ تازہ کی مشعل تھام کر جہانِ تازہ کی جانب سرگرم سفر رہنا، خلوص و دردمندی، ایثار و وفا کو زادِ راہ بنانا ہمیشہ ان کا مطمحِ نظر رہا۔ اجل کے بے رحم ہاتھوں نے وہ ساز توڑ دیا جس کے تار سامعین کے دلوں کی دھڑکن سے ہم آہنگ ہو کر سدا یہی لے سناتے:

جیوے پاکستان	جیوے پاکستان
من پنچھی جب پنکھ ہلائے کیا کیا سُر بکھرائے	سننے والے سنیں تو اُن میں ایک ہی دُھن لہرائے
پاکستان پاکستان جیوے پاکستان	جیوے جیوے جیوے پاکستان
جھیل گئے دُکھ جھیلنے والے اب ہے کام ہمارا	ایک رکھیں گے ایک رہے گا ایک ہے نام ہمارا
پاکستان پاکستان جیوے پاکستان	جیوے جیوے جیوے پاکستان
بکھرے ہوؤں کو بچھڑے ہوؤں کو اک مرکز پہ لایا	کتنے ستاروں کے جھرمٹ میں سورج بن کر آیا
پاکستان پاکستان جیوے پاکستان	جیوے جیوے جیوے پاکستان

لیکن موت کو کیا معلوم کہ ساز ٹوٹ جانے کے بعد اسی کی مدھر دھنیں ہر طرف فضاؤں میں بکھر جاتی ہیں۔ اس مردِ خود آگاہ نے عزتِ نفس، خودی اور خود آگہی کو اس قدر موثر، منضبط اور بیدار رکھا کہ لوحِ جہاں پر ان کا دوام ثبت عام اور بقائے دوام کے دربار میں بلند مقام ان کا مقدر بن گیا۔

جمیل الدین عالی نے وطن کی محبت سے سرشار ہو کر جو ملی نغمے لکھے ان کا اعزازیہ کبھی قبول نہ کیا۔ ان کے لکھے ہوئے جو ملی نغمے بہت مقبول ہوئے وہ درج ذیل ہیں:

۱۔ ہم مصطفوی ﷺ، مصطفوی ﷺ، مصطفوی ہیں۔ (اسلامی کانفرنس ۱۹۷۴ء کا سرکاری نغمہ)

۲۔ اے وطن کے سجیلے جوانو میرے نغمے تمہارے لیے ہیں (گلوکارہ: نور جہاں)

۳۔ جیوے جیوے پاکستان (۱۹۷۱ء) (گلوکارہ: شہناز بیگم، موسیقی: سہیل رانا)

۴۔ میرا انعام پاکستان، میرا پیغام پاکستان (گلوکار: احمد رشدی، موسیقی: لال محمد اقبال)

۵۔ اب یہ اندازِ انجمن ہوگا ہر زباں پر وطن وطن ہوگا

۶۔ جو نام وہی پیغام پاکستان، پاکستان

۷۔ اتنے بڑے جیون ساگر میں تو نے پاکستان دیا ہُو اللہ ہُو اللہ (گلوکار: الّن فقیر)

۸۔ یہ کویتا پاکستانی ہے

۹۔ اے دیس کی ہواؤ، خوشبو میں بس کے جاؤ

۱۰۔ میں چھوٹا سا اک لڑکا ہوں پر کام کروں گا بڑے بڑے (یہ جمیل الدین عالی کا پہلا ملی نغمہ ہے جو انھوں نے ۱۹۵۹ء میں لکھا۔)

۱۱۔ جب ہم نے خدا کا نام لیا — اس نے ہمیں اک انعام دیا

میرا انعام پاکستان — میرا پیغام پاکستان

محبت امن ہے اور اس کا ہے پیغام پاکستان — پاکستان۔۔۔۔پاکستان

۱۲۔ خدا کی خاص رحمت ہے — بزرگوں کی بشارت ہے

کئی نسلوں کی قربانی — کئی نسلوں کی محنت ہے

اثاثہ ہے جیالوں کا — شہیدوں کی امانت ہے

تعاون ہی تعاون ہے — محبت ہی محبت ہے

جبھی تاریخ نے رکھا ہے اس کا نام پاکستان — پاکستان۔۔۔۔۔۔پاکستان

(۱۴۔ اگست ۱۹۹۷ء۔ گلوکار: نصرت فتح علی خان، موسیقی: نیاز احمد)

یہاں یہ امر قابلِ ذکر ہے کہ جمیل الدین عالی کو موسیقی سے گہری دلچسپی تھی۔ اپنے لکھے ہوئے ملی نغموں کے لیے گلوکار اور موسیقار کے انتخاب میں ان کی مشاورت کو پیش کار بالعموم قدر کی نگاہ سے دیکھا کرتے تھے۔ ان کے ملی نغموں کی مقبولیت ان کی حب الوطنی کی دلیل ہے۔ وہ دل کی گہرائیوں میں اتر کر ملی نغمے لکھتے اور یہ نغمے سامعین کے دل میں اتر جاتے تھے۔

برِعظیم پاک و ہند کے ادب میں دوہے کی صنف کے ارتقا پر نظر ڈالنے سے یہ حقیقت روزِ روشن کی طرح واضح ہو جاتی ہے کہ دوہے کے سوتے اس خطے کی تہذیبی اور ثقافتی اقدار و

روایات سے پھوٹے ہیں۔ برعظیم میں دوہے کے ابتدائی نقوش کا تعلق پانچویں اور چھٹی صدی عیسوی سے ہے۔ یہی وہ زمانہ ہے جب مقامی بولیوں اور پراکرت میں مقامی شعرا نے دوہے کو اظہار و ابلاغ کا وسیلہ بنایا۔ فطرت خود بہ خود لالے کی حنابندی میں مصروف رہی اور مقامی شعرا نے تزکیۂ نفس کے لئے دوہے کو ایک موثر اور مقبول ترین لوک صنف شعر کے طور پر اپنا لیا۔ یہاں تک کہ نویں صدی عیسوی میں متعدد اہم تخلیق کاروں نے دوہے کو ایک باضابطہ صنف شاعری کی حیثیت سے متعارف کرایا اور اس میں تخلیقِ فن کے اصول و قواعد پر توجہ دی۔ تاریخی اعتبار سے یہ بات مسلمہ ہے کہ بہ حیثیت ایک مقبول صنف شاعری دوہے کو برعظیم کی کئی زبانوں کے تخلیق کاروں نے اپنایا اور ان کے اسلوب کی عوامی سطح پر وسیع پیمانے پر پذیرائی بھی ہوئی۔ جن مقامی زبانوں میں قدیم دوہے لکھے گئے ان میں پنجابی، سندھی، برج بھاشا، مگدھی اور اودھی قابل ذکر ہیں۔ ہندوستانی لسانیات اور اصناف ادب کے ارتقا میں دلچسپی رکھنے والے قارئین کو یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ جس قدر قدیم یہاں کی تہذیب ہے اسی قدر قدیم یہاں کے ادب کی روایات ہیں۔ مورخین اور ماہرین علم بشریات کی متفقہ رائے ہے کہ اقوام عالم کے تخت و کلاہ و تاج کے سب سلسلے سیل زماں کے مہیب تھپیڑوں کی زد میں آ کر خس و خاشاک کی مانند بہہ جاتے ہیں لیکن تہذیب اس ہونی سے محفوظ رہتی ہے۔ ادیب جب قلم تھام کر پرورشِ لوح و قلم میں مصروف ہوتا ہے تو وہ یدِ بیضا کا معجزہ دکھاتا ہے اور اپنی تخلیقی فعالیت کے اعجاز سے یہ بیش بہا تہذیبی میراث نئی نسل کو منتقل کر کے تاریخ کے مسلسل عمل کے وسیلے سے تاریخی تسلسل کو برقرار رکھتا ہے۔ تہذیبی اور ثقافتی ورثے کی بقا سخت محنت اور انتھک جدوجہد کی متقاضی ہے۔ جو قوم اپنی تہذیبی میراث کو عزیز رکھتی ہے وہ خود اپنی نظروں میں معزز و مفتخر ہو جاتی ہے۔ اپنی مٹی سے محبت اور اپنی تہذیب کی حفاظت کسی بھی زندہ قوم کا امتیازی وصف قرار دیا جاتا ہے۔ تہذیبی میراث کی نسلِ نو کو منتقلی وقت کا اہم ترین تقاضا سمجھا جاتا ہے۔ وہ قومیں بدقسمت خیال کی جاتی ہیں جو اپنی تہذیب و ثقافت اور تمدن و معاشرت کے بارے میں مجرمانہ تغافل کا شکار ہو کر دوسری اقوام کی تہذیب کی بھونڈی نقالی میں مصروف ہو جاتی ہیں۔ یہ

ایک تلخ حقیقت ہے کہ اگر بد قسمتی سے کسی قوم کی تہذیب کے تحفظ اور اسے نئی نسل تک منتقل کرنے کی مہلک غلطی ہو جائے، بے حسی کے باعث قوم کے دل سے احساس زیاں عنقا ہو جائے اور مسلسل سو برس تک بھی اس المیے کی جانب توجہ نہ دی جائے تو تہذیبی انہدام کے باعث وہ قوم پتھر کے زمانے کے ماحول میں پہنچ جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہر دور میں زیرک تخلیق کاران اقدار و روایات کے تحفظ پر اپنی توجہ مرکوز رکھتے چلے آئے ہیں جن کا تعلق تہذیبی بقا اور اس کے تسلسل سے ہے۔ تاریخ ادب کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ ''دوہا'' ایک ایسی صنف شاعری ہے جس نے برعظیم کی تہذیب میں نمو پائی اور اس کے دامن میں گزشتہ صدیوں کی تاریخ اور تہذیبی ارتقا کے جملہ حقائق سمٹ آئے ہیں۔ جمیل الدین عالی نے صنف دوہا نگاری کو تاریخی اور تہذیبی تسلسل کی ایک علامت قرار دیا۔ اسے وہ ایک ایسے نفسیاتی کُل سے تعبیر کیا کرتے تھے جس سے لاشعور کی تاب و تواں کے سوتے پھوٹتے ہیں۔ ان کے دوہے بہت مقبول ہوئے اس پر مستزاد ان کا ترنم جو سونے پر سہاگے کی حیثیت رکھتا تھا۔

اردو زبان میں دوہا نگاری کے ابتدائی آثار تیرہ سو برس قبل بھی پائے جاتے تھے۔ جب پوری دنیا آفتاب اسلام کی ضیا پاشیوں سے بقعۂ نور ہو گئی تو اس خطے میں بھی فکر و نظر کا ایک انقلاب برپا ہو گیا۔ ہر قسم کے نسلی، علاقائی اور لسانی امتیازات کو بیخ و بُن سے اکھاڑ پھینکنے کے قابل قدر سلسلے کا آغاز ہو گیا۔ اس عہد آفرین انقلاب کے بعد افکار تازہ کی مشعل تھامے یہاں کے تخلیق کاروں نے جہانِ تازہ کی جستجو کو اپنا مطمحِ نظر بنا لیا۔ اردو میں دوہے کے ارتقا میں اس خطے میں اسلام کے ابد آشنا پیغام کو سنگ میل کی حیثیت حاصل ہے۔ جہاں تک شاعری میں تزکیہ نفس کی شعوری یا غیر شعوری کوشش کا تعلق ہے اس کی اولین صورت دوہے میں دکھائی دیتی ہے۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ دوہا نگاروں نے اس صنف میں وہ گل ہائے رنگ رنگ پیش کیے جن کے اعجاز سے دوہا واقعیت، حقیقت، مقصدیت اور سبق آموز نصیحت کے روپ میں قلب و نظر کی تسخیر میں اہم کردار ادا کرنے کے قابل ہو گیا۔ دوہے کی صنف کو خونِ دل سے سینچ کر پروان چڑھانے والے تخلیق

کاروں میں بہت سے نام شامل ہیں۔ ان میں سے کچھ مقبول مسلمان دوہا نگاروں کے نام درج ذیل ہیں:

امیر خسرو (۱۲۵۳ تا ۱۳۲۵)، بابا فرید الدین مسعود گنج شکر (۱۱۷۳ تا ۱۲۶۶)، سید عبد اللہ بلھے شاہ (۱۶۸۰ تا ۱۷۵۷)، ملک محمد جائسی (۱۴۷۷ تا ۱۵۴۲)، بہادر شاہ ظفر (۱۷۷۵ تا ۱۸۶۲)

دوہا نگاری کے فروغ میں متعدد ہندو شعرا نے بھی اہم کردار ادا کیا۔ جس طرح زندگی اپنے لئے لائحہ عمل کا انتخاب خود ہی کر لیتی ہے بالکل اسی طرح اصناف ادب بھی اپنے لئے موضوع اور اظہار کے مواقع تلاش کر لیتے ہیں اس میں مسلک یا عقیدے کی طرف سے کوئی قدغن نہیں۔ تاہم ہندو شعرا نے بالعموم اپنے دھرم اور ہندی معاشرت کو اپنی شاعری کا موضوع بنایا ہے۔ جن قدیم ہندو شعرا نے دوہے کو اظہار و ابلاغ کا وسیلہ بنایا ان میں سے چند نام درج ذیل ہیں:

کبیر داس (۱۴۴۱ تا ۱۵۱۸)، سنت کوی سورداس (۱۴۷۸ تا ۱۵۸۴)، تُلسی داس (۱۴۹۷ تا ۱۶۳۲)، بہاری لال (۱۵۹۵ تا ۱۶۶۳)

۱۸۵۷ء کی ناکام جنگ آزادی کے بعد جب تاجر کے روپ میں آنے والے انگریز اپنے مکر کی چالوں سے تاج ور بن بیٹھے تو اس خطے کی تہذیب و ثقافت بھی اس سانحے سے متاثر ہوئی۔ زندگی کے ہر شعبے پر اس سانحے کے مسموم اثرات مرتب ہوئے۔ یورپی تہذیب کے غلبے کے باعث مقامی تہذیب کے ارتقا کی رفتار قدرے سست پڑ گئی۔ نوے سالہ غلامی کے دور میں اس خطے کے باشندوں پر جو کوہ ستم ٹوٹا اس نے تو محکوم قوم کی امیدوں کی فصل غارت کر دی اور ان کی محنت اکارت چلی گئی۔ جب لوگ پراگندہ روزی اور پراگندہ دل ہوں تو کہاں کے دوہے، کہاں کی رباعی اور کہاں کی غزل، سب کچھ پس منظر میں چلا جاتا ہے۔ دوسری اصناف سخن نے تو اس جاں کنی کے عالم میں بھی اپنا ارتقائی سفر جاری رکھا لیکن دوہا ادیبوں کی تخلیقی توجہ سے محروم رہا۔ جب آزادی کی صبحِ درخشاں طلوع ہوئی تو یورپی پیر تسمہ پا اور بیرونی طفیلی اپنی دکان بڑھا گئے۔ اس کے بعد اس

خطے میں دوہے کو بھی نئے سرے سے پنپنے کا موقع ملا۔ دوہا نگاروں نے اپنے موثر اسلوب کے ذریعے زندگی کے تمام موسموں کو اپنی شاعری کا موضوع بنایا۔ صرف دو مصرعوں میں قاری کو قطرے میں دجلہ اور جز و میں کل کا منظر دکھا کر ان شاعروں نے قلب ونظر کو مسخر کر لیا۔ ان کے اسلوب میں جذبات، احساسات اور تخیل کی ندرت اور پاکیزگی کا جادو سر چڑھ کر بولتا ہے۔ دوہا نگاروں نے بالعموم حُسن کی تجریدی کیفیت کی لفظی مرقع نگاری پر توجہ مرکوز رکھی ہے۔ ان کے اسلوب میں دو پہلو قابل توجہ ہیں ایک تو روحانیت کا عکاس ہے اور دوسرا مادیت کا پرتو لیے ہوئے ہے۔ مادہ پرستی ایک تخلیق کار کو رومانیت کی وادی میں مستانہ وار گھومنے پر مائل کرتی ہے جب کہ روحانیت کے زیر اثر تخلیق کار مابعد الطبیعیات اور مافوق الفطرت عناصر میں گہری دلچسپی لینے لگتا ہے۔ دوہا نگاروں کے اسلوب میں ان دونوں کیفیات کا امتزاج دھنک رنگ منظر نامہ پیش کرتا ہے۔ پاکستان اور بھارت میں دوہا نگاری کے اسلوب میں ایک واضح فرق دکھائی دیتا ہے۔ پاکستانی دوہا نگاروں نے سرسی چھند کو اپنایا ہے جب کہ بھارت میں دوہا چھند کی مقبولیت میں اضافہ مسلسل ہو رہا ہے۔ بھارت میں دوہا لکھنے والے شعراء نے پاکستانی شعراء سے الگ ایک نئی طرز ادا کو اپنایا ہے۔ آزادی کے بعد پاکستان میں جن شعرا نے دوہا نگاری پر توجہ دیتے ہوئے اس صنف شعر کے فروغ میں اہم کردار ادا کیا ان میں سے کچھ ممتاز شعراء کے نام درج ذیل ہیں:

احمد حسن مجاہد، الیاس عشقی، الطاف پرواز، امین خیال، بشیر منظر، تاج سعید، تاج قائم خانی، جلال میرزا خانی، جمال پانی پتی، جمیل الدین عالی، جمیل عظیم آبادی، دل محمد خواجہ، ذکیہ غزل، رشید قیصرانی، رئیس احمد رئیس، شاعر صدیقی، شاہد جمیل، شمیم انجم وارثی، صہبا اختر، صابر آفاقی، طاہر سعید ہارون ڈاکٹر، عبدالعزیز خالد، عرش صدیقی، ع۔س۔ مسلم، فراز حامدی، قتیل شفائی، کشور ناہید، مشتاق عاجز، مناظر عاشق ہرگانوی، نذیر فتح پوری، وحید قریشی ڈاکٹر اس وقت اردو زبان کے متعدد شعرا دوہے کے فروغ میں اہم کردار ادا کر رہے ہیں۔ قیام پاکستان کے بعد وطن عزیز میں دوہے میں

ادیبوں اور قارئین کی دلچسپی جمیل الدین عالی کی مساعی کی مرہون منت ہے۔ ان کی اس خدمت کو تاریخ ادب میں ہمیشہ یاد رکھا جائے گا۔

جمیل الدین عالی نے تخلیقی فعالیت میں متنوع فنی تجربوں کو ہمیشہ پیش نظر رکھا۔ وہ تخلیق فن کے لمحوں میں ان متنوع فنی تجربوں کے اعجاز سے تخلیق ادب کے متعدد نئے امکانات تک رسائی حاصل کرنے میں کامیاب رہے۔ تخلیق ادب میں یکسانیت اور جمود کا خاتمہ کرنے اور تاریخ، تہذیب اور ثقافت میں دلچسپی پیدا کرنے کے سلسلے میں ان فنی تجربوں نے اہم کردار ادا کیا۔ ان کی دوہا نگاری کے پس منظر میں بھی فنی تجربوں سے ان کی دلچسپی کار فرما رہی ہے۔ ستمبر ۱۹۴۴ء میں جمیل الدین عالی نے میرا جی (محمد ثناء اللہ ڈار) کو دہلی میں اپنے دوہے سنائے، یہیں سے جمیل الدین عالی کی دوہا نگاری کا آغاز ہوتا ہے۔ میرا جی تخلیق ادب میں نئے تجربات کو قدر کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ انہوں نے جمیل الدین عالی کے دوہے پسند کیے اور دوہا نگاری کے بارے میں اپنے اس تاثر سے بھی جمیل الدین عالی کو آگاہ کیا کو دوہا نگاری غزل گوئی سے زیادہ ارتکاز توجہ اور فنی ریاضت کی متقاضی ہے۔ بادی النظر میں یہ ایک واضح حقیقت ہے کہ جہاں غزل میں بالعموم معنی آفرینی ہی تخلیق کار کا مطمح نظر رہتا ہے، وہاں دوہے میں تخلیق کار ایک عجیب مرحلے سے گزرتا ہے۔ تخلیق فن کے لمحوں میں دوہا نگار قلبی سوز، روحانی وجد اور جذبات و احساسات کی تمازت کو الفاظ کے قالب میں ڈھال کر پتھروں کو بھی موم کر دیتا ہے۔ اپنی دوہا نگاری میں جمیل الدین عالی نے کسی قدیم دوہا نگار کے اسلوب کی تقلید نہیں کی۔ ان کا منفرد اسلوب ہی ان کی پہچان بن گیا۔

ساجن ہم سے ملے بھی لیکن ایسے ملے کہ ہائے
جیسے سوکھے کھیت سے بادل بن برسے اُڑ جائے

بیتے دِنوں کی یاد ہے کسی ناگن کی پُھنکار
پہلا وار ہے زہر بھرا اور دوجا امرت دھار

یہ ہر سُندر نار کو تکنا یہ جُھک جُھک پرنام
عالی تُو تو گیانی دھیانی یہاں تیرا کیا کام

عالی اب کے کٹھن پڑا دیوالی کا تہوار
ہم تو گئے تھے چھیلا بن کر بھیا کہہ گئی نار

اس عالمِ آب و گل میں فرد کی زندگی جوئے شیر و تیشہ و سنگِ گراں ہی تو ہے جہاں سعیٔ پیہم کے بغیر کسی جوہر کے کھلنے کی توقع ہی عبث ہے۔ جمیل الدین عالی کی دوہا نگاری کا بہ نظر غائر جائزہ لینے سے یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ انہوں نے سراپا نگاری، حسن و رومان، معاملہ بندی، پیار اور محبت کے عہد و پیمان جیسے فرسودہ اور پامال موضوعات سے اپنے قلم کو آلودہ نہیں ہونے دیا بلکہ زندگی کے تند و تلخ حقائق پر توجہ مرکوز رکھی ہے۔ انہوں نے زندگی کی حقیقی معنویت کو اُجاگر کرنے کی خاطر جو مساعی کی ہیں ان کا ایک عالم معترف ہے۔ ان کی شاعری قارئین کے ذہن و ذکاوت کو صیقل کر کے فکر و نظر کو مہمیز کرنے میں بے حد ممد و معاون ثابت ہوتی ہے۔ زندگی میں بلاشبہ رومانی مزاج رکھنے والے افراد عشق و محبت کے نتیجے میں ملنے والے ہجر و فراق کے صدموں سے بھی دوچار ہوتے ہیں لیکن جمیل الدین عالی نے ان دکھوں کے مسموم اثرات سے نجات حاصل کرنے کے لئے ان کا انسلاک زندگی کے دیگر مسائل سے نہایت خوش اسلوبی سے کیا ہے۔ عشق کے صدموں سے کہیں بڑھ کر انہیں دُکھی انسانیت کے مصائب و آلام کے بارے میں تشویش و اضطراب ہے۔ وطن اور اہلِ وطن کے ساتھ قلبی وابستگی اور والہانہ محبت ان کے دوہوں کا نمایاں وصف ہے۔

جمیل الدین عالی کو اس بات پر حیرت تھی کہ آزادی کے بعد پاکستان میں دوہا نگاری جیسی قدیم صنف شاعری پر تخلیق کاروں نے بالعموم زیادہ توجہ نہیں دی۔ اس کی بنیادی وجہ یہ رہی ہے کہ اکثر شعرا نے غزل کو اظہار و ابلاغ کا موثر ترین وسیلہ سمجھتے ہوئے محض غزل گوئی پر اپنی توجہ مرکوز رکھی۔ اپنی کوششوں سے جمیل الدین عالی نئی نسل کے ذوق سلیم سے متمتع تخلیق کاروں کو دوہا نگاری کی طرف مائل کرنے میں بڑی حد تک کامیاب ہو گئے۔ اردو زبان کے جن ممتاز شاعروں اور دوہا نگاروں نے لفظ کی حرمت کو ملحوظ رکھتے ہوئے حرفِ صداقت کو زندگی کی تمام نسبتوں کا اہم ترین حوالہ اور ربطِ باہمی کا موثر ترین وسیلہ سمجھا، انہوں نے دوہے کو اجتماعی بھلائی کی ندا کے طور پر اپنے اسلوب میں جگہ دی۔ جمیل الدین عالی کی اس طرز فغاں کو بہت پذیرائی ملی اور پاکستان میں دوہا نگاری نے اب ایک مضبوط اور مستحکم روایت کی صورت اختیار کر لی ہے۔ آلامِ روزگار کو

صرفِ بیاں کرنے والے شعرا نے اپنی دوہا نگاری کی دھاک بٹھا دی اور ان کے دوہوں کے مجموعے شائع ہوئے، جنہیں اردو زبان وادب سے دلچسپی رکھنے والے باذوق قارئین نے بے حد سراہا، یہ اس صنف شاعری کی مقبولیت کی دلیل ہے۔ جن شعراء کے دوہوں کے مجموعے شائع ہو چکے ہیں ان میں خواجہ دل محمد، جمیل الدین عالی، الیاس عشقی، پرتو روہیلہ، جمیل عظیم آبادی، رشید قیصرانی، تاج قائم خانی، طاہر سعید ہارون اور مشتاق عاجز شامل ہیں۔ اردو زبان میں دوہے کے ارتقا پر تحقیقی کام کا جو معیار ڈاکٹر عرش صدیقی نے پیش کیا اس کے اعجاز سے اس صنف شاعری کو تاریخی تناظر میں دیکھنے میں بہت مدد ملی۔ ڈاکٹر عرش صدیقی کا عالمانہ تحقیقی مقالہ ''پاکستان میں اردو دوہے کا ارتقا'' جو ۱۹۹۱ میں شائع ہوا اصناف ادب کے ارتقا کے موضوع پر تحقیق کا وقیع نمونہ ہے۔ اس گراں قدر تحقیقی مقالے میں دوہے میں طبع آزمائی کرنے والے ان تمام ممتاز پاکستانی شعراء کے اسلوب کا تجزیاتی مطالعہ شامل کیا گیا ہے جنہوں نے قیام پاکستان کے بعد گزشتہ نصفِ صدی کے عرصے میں اس صنفِ شاعری کو پروان چڑھانے میں اہم کردار ادا کیا۔ ڈاکٹر عرش صدیقی خود بھی دوہے لکھتے تھے اس لئے اس تحقیقی مقالے میں ان کے اپنے دوہے بھی شامل ہیں۔ دوہے کے ارتقا سے دلچسپی رکھنے والوں کے لئے اس تحقیقی مقالے کا مطالعہ بہت افادیت کا حامل ہے۔ اس تحقیقی مقالے میں جمیل الدین عالی کے اسلوب کا تفصیلی جائزہ لیا گیا ہے اور اردو دوہے کے فروغ میں ان کی خدمات پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ اردو زبان میں جب بھی دوہا نگاری کے ارتقا کی تاریخ لکھی جائے گی بیسوی صدی کے دوہا نگاروں میں جمیل الدین عالی کا نام نمایاں رہے گا۔

ذیل میں ان کے چند دوہے پیش کیے جا رہے ہیں:

کیا جانے یہ پریت کی آگ بھی کیا کیا اور جلائے   عالی جیسا مہا کوی بھی بابو جی کہلائے

بابو گیری کرتے ہوگئے عالی کو دو سال   مرجھایا وہ پھول سا چہرہ بھورے پڑ گئے بال

دھیرے دھیرے کمر کی سختی کرسی نے لی چاٹ   چپکے چپکے من کی شکتی افسر نے دی کاٹ

کس کو خبر یہ ہنس مکھ عالی کیا کیا چھپ کر روئے   جیسا ساتھی من ڈھونڈے تھا ویسا ملا نہ کوئے

گھنی گھنی یہ پلکیں تیری یہ گرما تا رُوپ   تو ہی بتا او نار میں تجھ کو چھاؤں کہوں یا دھوپ

میٹھی میٹھی کسک تھی دل میں نا کوئی غم نہ سوگ   دو ہی دن کے بعد مگر یہ پریت تو بن گئی روگ

عجز وانکسار، خلوص و مروّت اور انسانی ہمدردی کے جذبات جمیل الدین عالی کے روح اور قلب کی گہرائیوں میں سما گئے تھے۔ ان کے معجز نما اثر سے ان کے منفرد اور دل کش اسلوب میں وسعتِ نظر، رواداری، صبر و استغنا اور وسیع المشربی کی شان پیدا ہوئی۔ یہ ایک لرزہ خیز اور اعصاب شکن حقیقت ہے کہ اس بے حس معاشرے میں قسطائی جبر کا شکار اور آلام روزگار کے مسموم بگولوں کی زد میں آنے کے بعد ستم کشِ سفر رہنے، سوالی مظلوم اور بے بس والا چار انسانیت نے اپنی ورق ورق زیست کی دھجیوں کو قبائے حزن والم میں ڈھانپ رکھا ہے سیل زماں کے تھپیڑے سہتی اور جان لیوا سناٹے، بھیانک تیرگی اور یاس و ہراس کے عالم میں حالات کی زد میں آنے والی انسانیت کو جمیل الدین عالی نے اپنی تحریروں کے ذریعے طلوع صبح بہاراں کی نوید سنائی ہے کٹھن حالات میں بھی حوصلے اور اُمید کی شمع فروزاں رکھنا سدا ان کا شیوا رہا۔ ان کی تحریروں میں موجود جدید حسّی رَو کی ضیا پاشیاں سفاک ظلمتوں کو کافور کر کے عصری آگہی کو پروان چڑھانے میں اہم کردار ادا کرتی ہیں۔ ان کی تخلیقات معاصر عالمی ادبیات کے تیزی سے بدلتے ہوئے رجحانات کی تفہیم میں کلیدی کردار ادا کرتی ہیں۔ ارضی وثقافتی حوالے سے وہ سوہنی دھرتی کی رومانی تلمیحات کے برمحل استعمال سے اپنے اسلوب کے حسن کو چار چاند لگا دیتے ہیں۔ معاشرتی اور سماجی زندگی کی ناہمواریوں، تضادات اور کجی کے ہمدردانہ شعور کو روبہ عمل لاتے ہوئے اُنھوں نے جس فنی مہارت سے اپنی گل افشانی گفتار سے کیف و مستی کا سماں باندھا ہے وہ ان کی انفرادیت کی دلیل ہے۔ اپنی شگفتہ مزاجی اور فن کارانہ امیج سے اپنی شاعری کو ساحری میں بدل دیا ہے۔ اپنی شاعری کے وسیلے سے قارئین کو نہ صرف زندگی کی رعنائیوں کے بارے میں آگہی عطا کرتے ہیں بلکہ زندگی کے تلخ حقائق اور ان سے عہدہ برآ ہونے کے اسرار و رموز سے بھی آگاہ کرتے ہیں۔

گزر گیا ہے جو وقت اُس میں جا کے دیکھتے ہیں   طرح قبول غزل آزما کے دیکھتے ہیں

جن اہلِ درد کو پنجابیوں نے لُوٹ لیا   اُنھیں یہ سسی پُنوں سُنا کے دیکھتے ہیں

اُن کے درج ذیل سفرنامے قارئین میں بہت مقبول ہوئے۔ اپنے سفرناموں میں جمیل الدین عالی نے قارئین کو پوری دُنیا کی سیر کرائی ہے۔ ان کے درج ذیل سفرنامے قارئین میں بہت مقبول ہوئے:

۱۔ 'دنیا مرے آگے' پہلی اشاعت ۱۹۷۵ء، دوسری اشاعت ۱۹۸۴ء، اس سفرنامے میں جمیل الدین عالی نے دُنیا کے جن ممالک کی سیاحت کی اُن میں ایران، عراق، لبنان، مصر، بھارت، روس، فرانس اور برطانیہ شامل ہیں۔

۲۔ 'تماشا مرے آگے!' یہ سفرنامہ ۱۹۸۵ء میں منظرِ عام پر آیا۔ یہ سفرنامہ جرمنی، ہالینڈ، اٹلی، سوئٹزرلینڈ اور امریکہ کی سیاحت کی روداد پر مشتمل ہے۔ ابتدا میں یہ دونوں سفر روزنامہ جنگ کراچی کی ہفتہ وار اشاعت ''سنڈے میگزین'' میں قسط وار شائع ہوئے۔ اخبار میں سفرناموں کی اشاعت کا سلسلہ چار سال (۱۹۶۳ء تا ۱۹۶۶ء) جاری رہا قارئین کی دلچسپی کو دیکھتے ہوئے ان سفرناموں کو بعد میں کتابی صورت میں شائع کیا جا چکا ہے۔

۳۔ 'آئس لینڈ' پہلی اشاعت دسمبر ۲۰۰۱ء، اُردو زبان میں آئس لینڈ کے بارے میں یہ پہلا سفرنامہ ہے۔

دُنیا کے مختلف مقامات کے بارے میں خوب صورت الفاظ کے برمحل استعمال سے جمیل الدین عالی نے جو لفظی مرقع نگاری کی ہے اس کے اعجاز سے قاری چشمِ تصور سے وہ تمام مقامات دیکھ لیتا ہے جن کا احوال ان سفرناموں میں بیان کیا گیا ہے۔ تخلیق کار کے ذہن اور روح کے جملہ تاثرات اسے ان مقامات تک پہنچا دیتے ہیں اور وہ ان کی سیر سے خوب حظ اُٹھاتا ہے۔ جمیل الدین عالی نے اپنے نہایت منفرد اور دل کش تجربات، مشاہدات اور جذبات واحساسات کو اس حسین اور دِل کش انداز میں سفرناموں میں پیش کیا ہے کہ قاری ان کے سحر میں کھو جاتا ہے۔

ان کی تحریر کا اہم وصف یہ ہے کہ وہ اپنے سفرناموں میں حسین لفظی مرقع نگاری سے صرف اہم مقامات کا حقیقی منظر نامہ ہی نہیں دکھاتے بلکہ ان تمام مقامات کا تاریخی پس منظر بھی ان کا اہم موضوع بن جاتا ہے۔ اقوام و ملل کے عروج و زوال پر ان کی گہری نظر رہتی ہے۔ وہ اس تاریخی صداقت کی طرف متوجہ کرتے ہیں کہ سیلِ زماں کے مہیب تھپیڑوں میں اقوام اور ملل کا کرّ وفر، رعب و دبدبہ اور جاہ و جلال تو خس و خاشاک کے مانند بہہ جاتا ہے مگر تہذیب پر آنچ نہیں آتی۔ آج کوئی بھی قصرِ فریدوں یا درِ کسریٰ پر صدا نہیں کرتا۔ ہر شخص جانتا ہے کہ ان بوسیدہ کھنڈروں کی اب کوئی حیثیت ہی نہیں۔ جمیل الدین عالی اپنی تہذیبی میراث کی اہمیت کو اجاگر کرنے کی مقدور بھر سعی کرتے ہیں۔ مشرقی تہذیب کو سمے کے سم اور طوفان مغرب کے مہیب بگولوں نے جو ناقابلِ تلافی نقصان پہنچایا ہے اسے دیکھ کر جمیل الدین عالی بہت دِل گرفتہ رہے۔ مغرب اور مشرق کے تہذیبی، ثقافتی، معاشی، سماجی اور معاشرتی زندگی کے تضادات، اختلافات، بے اعتدالیوں اور کج ادائیوں کو دیکھ کر وہ اپنے رنج و کرب کا برملا اظہار کرتے ہیں۔ یورپ کی طاقت ور اقوام کی شقاوت آمیز ناانصافیوں کے باعث مشرق کی پس ماندہ اور کمزور اقوام پر جو کوہِ ستم ٹوٹا ہے اس کی وجہ سے اہل مشرق کی زندگی کی تمام رُتیں ہی بے ثمر ہو کر رہ گئی ہیں۔ وہ اس جانب متوجہ کرتے ہیں کہ مشرق کے مکینوں کو مغرب کی بھونڈی نقالی کے بجائے اپنی مٹی پر چلنے کا قرینہ سیکھنا چاہیے۔ جب تک وہ احساسِ کمتری سے نجات حاصل نہیں کریں گے وہ دُنیا میں عزت اور وقار کی زندگی بسر نہیں کر سکیں گے۔ عالمی تاریخ کے مختلف سانحات اور تلمیحات کے حوالے سے جمیل الدین عالی کے سفرناموں کا ایک ایک لفظ گنجینۂ معانی کا طلسم ثابت ہوتا ہے۔ اپنے فہم و ادراک کو روبہ عمل لاتے ہوئے انھوں نے اپنے سفرناموں میں اصلاح اور مقصدیت کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے اپنی تخلیقی صلاحیتوں کی تجسیم اس موثر انداز میں کی ہے کہ قاری فکر و خیال اور حیرت و استعجاب کی نئی دُنیا میں پہنچ جاتا ہے۔ ان کے سفرنامے ''تماشا مرے آگے'' سے ایک اقتباس سعوبتوں کے سفر میں رہنے والے مظلوم انسانوں کے لیے قابلِ غور ہے:۔

''دُنیا بھر نے سمجھ لیا ہے کہ نیرو ختم ہوگیا تو اس کے ساتھ بانسری بھی ختم ہوگئی۔ حالانکہ میں اس بانسری اس گٹار کی آواز برابر سُن رہا ہوں، سبھی کانوں والے سُن رہے ہیں اور نہ جانے کب تک سنتے رہیں گے۔ میں پوری ذمہ داری کے ساتھ گواہی دیتا ہوں کہ میں نے مشرق، مغرب، شمال جنوب یعنی دُنیا کی چار سمتوں میں شعلے بھڑکتے دیکھے اور نیرو کی بانسری بھی سنی اور گٹار بھی سنا۔ میں گواہی دیتا ہوں کہ وہ شعلے آج بھی زندہ ہیں وہ بانسری آج بھی بج رہی ہے۔ اس گٹار کی دل خراش آواز آج بھی چاروں طرف پھیلی ہوئی ہے، نیرو مر گیا، ختم ہوگیا مگر اس کی بانسری زندہ اس کا گٹار زندہ ہے۔ اس کے لگائے ہوئے شعلے بھڑک کے جا رہے ہیں اور نہ جانے کب بجھیں گے''۔

قلبی اور جذباتی سکون کے حصول کے لئے جمیل الدین عالی نے قلم وقرطاس کا بھرپور استعمال کیا۔ وہ سات عشروں تک برابر پرورشِ لوح وقلم میں مصروف رہے۔ ان کے گیت جہاں ان کے تزکیہء نفس کی ایک صورت بن گئے وہاں قارئین کے لئے یہ ذہنی سکون اور مُسرت کے حصول کا ایک منبع ثابت ہوئے۔ زندگی کی درخشاں اقدار اور روایات سے انہیں والہانہ محبت تھی۔ ان کے گیتوں میں خلوص، مروت، ایثار، وفا، حسن و جمال، پیمانِ وفا اور کتابِ زیست کے سب ابواب کا احوال سمٹ آیا ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے وہ اپنی شاعری بالخصوص گیتوں کے ذریعے زندگی کی حیات آفریں اقدار کے تحفظ اور انسانیت کے وقار اور سربلندی کو یقینی بنانے کی آرزو لئے برابر آگے بڑھنے کا درس دیتے ہیں۔ ان کے گیتوں میں زندگی کی تمام رعنائیاں دھنک رنگ مناظر اور جہدوعمل کی راہیں سامنے لاتی ہیں۔ فکری تنوع، موضوعات کی جدت، خیال کی تازگی اور نُدرت نے ان گیتوں کی جاذبیت، حُسن اور دل کشی کو چار چاند لگا دیئے ہیں۔ ان کے اسلوب میں ان کا تخیل ان کے شعور سے ہم آہنگ ہو کر فکر و خیال کے نئے آفاق تک رسائی حاصل کر لیتا ہے۔ رسیلے گیتوں کی مدبھری تان سننے کا شوق انہیں گیت نگاری پر مائل کرتا ہے۔ گیت نگاری میں ان کا ذوقِ سلیم قاری کو رنگ، خوشبو، حسن، رومان اور وفا کے سب روح پرور ہنگاموں سے روشناس کراتا

ہے۔ یہ گیت محبت کا ایسا اثاثہ ہیں جو مہیب سناٹوں اور بھیانک تاریکیوں میں طلوعِ صبحِ بہاراں کے بعد گلشنِ ہستی میں کھلنے والے گل ہائے رنگ رنگ کی نوید سناتے ہیں۔ ان رسیلے گیتوں کی مہک کائنات کی وسیع فضاؤں میں بکھرے سینکڑوں مناظر کا احاطہ کرتی ہے اور قاری کو وادیٔ خیال کے حسین مناظر دیکھنے پر مائل کرتی ہے۔ ان گیتوں میں پایا جانے والا رجائیت کا عنصر قاری کے لئے حیات بخش ثابت ہوتا ہے: گیت

آدرشوں کا خوں پیتے ہیں ۔۔۔ کوئی آئے گا کوئی آئے گا
کوئی اپنی پھلواری کو بھی ۔۔۔ ہم اسی سہارے جیتے ہیں
مہکائے گا ۔۔۔ کوئی آئے گا

اپنے شعری اسلوب کو جمیل الدین عالی نے قلب اور روح کی اتھاہ گہرائیوں میں اُتر جانے والی اثر آفرینی سے مزین کیا ہے۔ ان کی شاعری سوچ کے نئے دروا کرتی چلی جاتی ہے۔ ان کے اسلوب کی انفرادیت کا راز ندرت بیان، سادگی، پاکیزگی اور سہل ممتنع میں پوشیدہ ہے۔ تخلیقِ فن کے لمحوں میں وہ خون بن کر رگِ سنگ میں اترنے کی جو سعی کرتے ہیں اس کے اعجاز سے وہ قاری کو اپنے تجربات میں شامل کر لیتے ہیں۔ اپنے جذبات، احساسات اور ادراک کی صلاحیتوں کو روبہ عمل لاتے ہوئے انہوں نے اپنے اسلوب کو داخلی اور خارجی وسعت کے اعتبار سے ایک محیطِ بے کراں کا روپ عطا کیا ہے۔ اس میں تنوع اور ندرت کے عناصر نے اسے افلاک اور آفاق کے حقائق کا آئینہ دار بنا دیا ہے۔

کیوں بجھ گئے ہو آتشِ پنہاں کو کیا ہوا ۔۔۔ عالی تمہارے سوزِ دل و جاں کو کیا ہوا
ہے کیوں قبائے زر سے مکلّف تمام جسم ۔۔۔ اس افتخارِ چاک گریباں کو کیا ہوا
وہ شہرتِ جنونِ گُل و غنچہ کیا ہوئی ۔۔۔ اس وحشت خراب گلستان کو کیا ہوا
کیوں آ گیا ہے ضبط و سلیقہ خطاب میں ۔۔۔ اس شدتِ خلوصِ فراواں کو کیا ہوا
کیوں ہو چلے ہو شیفتۂ جلوت و جلوس ۔۔۔ آشفتگیٔ طبع گریزاں کو کیا ہوا
کیوں عمر بھر کے دوست نہیں اب شریکِ حال ۔۔۔ اس احترامِ خاطرِ یاراں کو کیا ہوا

کوئی نہیں کہ ہو اِس دشت میں ہمرا دم ساز ہر ایک سمت سے آئی ہے اپنی ہی آواز
کبھی تو ہوگی ملاقات اے چمن آرا کہ میں بھی ہوں تری خوشبو کی طرح آوارہ

قحط الرجال کے موجودہ دور میں معاشرتی زندگی میں ہوسِ زر اور مفاد پرستی نے حدِ نگاہ تک اجنبیت کی بساط پھیلا رکھی ہے۔ جمیل الدین عالی بے لوث محبت سے دلوں کو مسخر کرنے کے راز جانتے تھے۔ ایثار، خلوص اور دردمندی ان کے امتیازی اوصاف تھے۔ عجز و انکسار کا پیکر بن کر وہ سب ملنے والوں کی راہ میں دیدہ و دل فرش راہ کر دیتے۔ وہ کسی کے لئے اجنبی نہ تھے اس لئے ایک نرم خُو اور صلح جُو میزبان کی حیثیت سے ہر شخص سے اخلاق اور اخلاص سے پیش آنا سدا ان کا شیوہ رہا۔ انجمن ترقی اردو سے وابستہ ہونے کے بعد پاکستان کی قومی زبان اردو کے فروغ اور دنیا بھر میں اردو زبان و ادب کی ترویج و اشاعت کے لئے انہوں نے اپنی زندگی وقف کر رکھی تھی۔ دنیا کی بڑی زبانوں سے تراجم کے ذریعے علوم و فنون کی اردو زبان میں منتقلی کی خاطر انہوں نے جو شبانہ روز محنت کی وہ قومی زبان اور قومی تشخص کے ساتھ عشق کی حدوں کو پہنچے ہوئے ان کے اشتیاق اور منفرد و بے کنار جذبۂ حب الوطنی کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ انجمن ترقی اردو کے لئے ان کی اعزازی خدمات چھ عشروں پر محیط ہیں۔ اس دوران انہوں نے کسی قسم کی مراعات یا کوئی معاوضہ قبول نہ کیا۔ ہوسِ زر نے نوعِ انساں کو اس قدر منتشر کر دیا ہے کہ معاشرتی زندگی سے مروت، اخوت اور ایثار عنقا ہے۔ معاشرتی زندگی سے وفا کے اٹھ جانے سے ہر دردمند کا دل بیٹھ گیا ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ فطرت کے حسین مناظر کی رنگینیاں، شادابیاں اور رعنائیاں ہوا و ہوس کی مسموم فضا میں ماند پڑنے لگی ہیں۔ جمیل الدین عالی نے آزمائش کی ہر گھڑی میں ہوس سے دامن بچا کر رخِ وفا فروزاں رکھنے پر اصرار کیا۔ وہ مایوسی، بے یقینی اور بے عملی کے سخت خلاف تھے۔ عملی زندگی میں انہوں نے زندہ تمناؤں کی مشعل سرِ طاق جاں فروزاں رکھنے کی راہ دکھائی۔ اپنی اَنا اور عزتِ نفس انہیں دل و جاں سے عزیز تھی۔ جمیل الدین عالی نے ''نقار خانے'' کے عنوان سے جو کالم تحریر کیے وہ باذوق قارئین نے بہت پسند کیے۔ وہ زندگی بھر خونِ دل میں انگلیاں ڈبو کر قوم کے

مقدر کی لکیروں کو اُجالنے اور خوف و دہشت کی فضا میں یاس و ہراس کے باعث الجھے ہوئے معاملات کو سنبھالنے کے نسخہ ہائے دوا تحریر کرتے رہے۔ اللہ کریم نے انہیں ایک مضبوط و مستحکم شخصیت سے نوازا تھا۔ زندگی بسر کرنے کیلئے انہوں نے جو اصول و ضوابط متعین کئے ان کی بالادستی کے لئے وہ ہر قربانی دینے پر آمادہ رہتے تھے۔ ان کی ساری زندگی ارفع اصولوں اور واضح دستور العمل کے مدار میں گزری۔ یہ بات بلا خوفِ تردید کہی جا سکتی ہے کہ اپنی عزتِ نفس کو ملحوظ رکھنے والا حریت فکر کا ایسا مجاہد جبر کے سامنے کبھی سپر انداز نہیں ہو سکتا۔

پاکستانی زبانوں کے ادیبوں کے حقوق کا تحفظ، مستحق ادیبوں کے لئے مراعات کا حصول اور ان کے مفادات کا خیال اور ان کی محنت کے اعتراف میں انعامات اور سپاس گزاری کے اہتمام میں انہوں نے ہمیشہ گہری دلچسپی لی۔ انہوں نے مقتدر حلقوں کے ساتھ معتبر ربط سے ادیبوں کیلئے ان کے شایانِ شان متعدد گراں قدر انعامات عطا کرنے کے فقید المثال سلسلے کا آغاز کیا۔ ان انعامات اور اعزازات کے حصول سے اپنی ذات کو الگ رکھا۔ وہ زندگی بھر ستائش اور صلے کی تمنا سے بے نیاز رہتے ہوئے تخلیقی کاموں میں مصروف رہے۔ انہوں نے ادیبوں کے لئے درج ذیل انعامات کا اہتمام کیا:

۱۔ آدم جی ادبی انعام (۱۹۶۰)
۲۔ داؤد ادبی انعام (۱۹۶۲)
۳۔ نیشنل بنک ادبی انعام (۱۹۶۳)
۴۔ حبیب بنک ادبی انعام (۱۹۶۴)
۵۔ یونائیٹڈ بنک ادبی انعام (۱۹۶۵)
۶۔ پاکستان رائٹرز گلڈ ادبی انعام (۱۹۶۶)
۷۔ ARY گولڈ ادبی انعام۔ دس ہزار ڈالر (۲۰۰۰)

سال ۲۰۰۱ء میں اے آر وائی انتظامیہ کے اصرار پر جمیل الدین عالی نے ان کا مقرر

کردہ انعام وصول کرنے پر آمادگی ظاہر کر دی اور یہ انعام وصول کر لیا۔ ستائش اور صلے کی تمنا سے بے نیاز رہنے کی ایسی کوئی نظیر دنیا میں ماضی یا حال کہیں موجود نہیں۔ نمود و نمائش، جاہ و منصب اور زر و مال کی ہوس سے گریزاں رہنے والا ایسا نادر و نایاب ادیب مستقبل بعید میں بھی ملکوں ملکوں ڈھونڈنے سے کہیں نہ ملے گا۔ تاریخ ہر دور میں ان کے نام کی تعظیم کرے گی۔ جمیل الدین عالی کی تصانیف درج ذیل ہیں:

۱۔اے میرے دشتِ سخن ۲۔غزلیں دوہے گیت ۳۔جیوے جیوے پاکستان

۴۔لاحاصل ۵۔دوہے ۶۔حرفے ۷۔سفرنامے

۸۔دنیا مرے آگے ۹۔تماشا مرے آگے ۱۰۔آئس لینڈ

انجمن ترقی اردو کے ساتھ باسٹھ سال کی اعزازی وابستگی کے دوران جمیل الدین عالی نے نئے خیالات، نئے موضوعات، نئے اسالیب اور نئی تکنیک کی حوصلہ افزائی کو نصب العین بنایا۔ شعبہ نشر و اشاعت اور اردو ڈکشنری بورڈ میں ان کی مشاورت بہت افادیت کی حامل ثابت ہوئی۔ وہ ایسے حساس، زیرک، فعال اور مستعد تخلیق کار تھے جن کی فہم و فراست اور فکر و تدبر جہاں قومی تشخص اور حب الوطنی کا مظہر ہے وہاں اس کے معجز نما اثر سے قارئین کے دلوں میں تعمیر وطن کا ایک ولولۂ تازہ پیدا ہوتا ہے۔ تخلیق فن کے لمحوں میں وہ کسی مصلحت کے قائل نہ تھے، ان کی تخلیقی جبلت ان کی گل افشانیٔ گفتار میں اس دلکش انداز میں جلوہ گر ہوتی ہے کہ ان کی حق گوئی اور بے باکی قاری کو مسحور کر دیتی ہے۔

گلہ ہی کیا کہ ظالم ہے وقت کا دھارا
یہ عمر بھر کے رشتے جو ٹوٹ جاتے ہیں

اب بھی نہ اُن کی پیاس بجھی تو گھر جنگل ہو جائے گا
سوکھ چلے وہ غنچے جن سے کیا کیا پھول اُبھرتے تھے

کہاں کہاں کی ترے غم نے خاک چھنوائی
تجھے تو کیسے بتاؤں کہ خود بھی یاد نہیں

جب ترا ذکر چھڑا نام کئی یاد آئے
دل آشفتہ پہ الزام کئی یاد آئے

ذہن تمام بے بسی روح تمام تشنگی — سو یہ ہے اپنی زندگی جس کے تھے اتنے انتظام
ہزار خشک رہا اپنی زندگی کا چمن — تری بہار کو لیکن کبھی خزاں نہ کہا
مسرتیں جو ملیں تیرے لطفِ پیہم سے — مچل رہی ہیں کسی جورِنا گہاں کے لئے

جمیل الدین عالی کی علمی، ادبی اور قومی خدمات کے اعتراف میں انہیں درج ذیل اعزازات سے نوازا گیا:

۱۔سنت کبیر ایوارڈ دہلی (1989) ۲۔اردو اکیڈمی کینیڈا ایوارڈ (1990)
۳۔صدارتی ایوارڈ برائے حسن کارکردگی (حکومت پاکستان) (1991)
۴۔ڈی۔لٹ (جامعہ کراچی) (1991) ۵۔ہلال امتیاز (حکومت پاکستان) (1998)
۶۔کمالِ فن ایوارڈ (اکادمی ادبیات پاکستان) (2007)
۷۔نشانِ سپاس پاک امریکن الائنس (2007)
۸۔ڈی۔لٹ دادا بھائی انسٹی ٹیوٹ (2008) (*)

اپنی عملی زندگی کا آغاز برطانوی دور میں محکمہ ٹرانسپورٹ حکومتِ ہند میں اسسٹنٹ کی حیثیت سے کیا۔ پاکستان ہجرت کے بعد وزارت تجارت حکومت پاکستان میں ۱۹۴۷ء میں اسسٹنٹ کے طور پر ان کا تقرر ہو گیا۔ اسی دوران انہوں نے ۱۹۵۱ء میں سی ایس ایس کا مقابلے کا امتحان پاس کیا اور انکم ٹیکس میں افسر ہو گئے۔ سرکاری ملازمت کے مختلف عہدوں پر فائز رہنے کے بعد ۱۹۸۸ء میں ریٹائر ہوئے۔ اس کے بعد ان کی زندگی تصنیف و تالیف میں گزری۔ جمیل الدین عالی نے قومی زندگی کے نشیب و فراز کو بہت قریب سے دیکھا تھا۔ پاکستان کی سیاست میں انہوں نے گہری دلچسپی لی اور ۷ مارچ ۱۹۷۷ء کو پاکستان پیپلز پارٹی کے ٹکٹ پر سید منور حسن کے مقابلے میں قومی اسمبلی کی نشست پر کراچی سے انتخابات میں حصہ لیا لیکن وہ کامیاب نہ ہو سکے۔ اس کے

(☆ روزنامہ ایکسپریس، لاہور، 24 نومبر 2015 صفحہ 18۔)

بعد وہ متحدہ قومی موومنٹ کے تعاون سے مارچ ۱۹۹۷ء میں چھ سال کے لئے پاکستان سینٹ کے رکن منتخب ہوئے۔

جمیل الدین عالی کی ادبی نثر اور شاعری میں اصلاح اور مقصدیت کی جو شان ہے وہ ہر اعتبار سے لائق تقلید سمجھی جاتی ہے۔ان کی تخلیقی فعالیت کا مقصد حب الوطنی اور قومی تعمیر و ترقی کے جذبات کو مہمیز کرنا تھا۔انہوں نے جس موضوع پر بھی قلم اٹھایا اس کی توضیح و تصریح کی مقدور بھر کوشش کی۔زندگی بھر حق گوئی اور بے باکی ان کا مسلک رہا۔الفاظ کو فرغلوں میں لپیٹ کر پیش کرنے کے وہ سخت خلاف تھے۔ان کے اسلوب میں مضمون آفرینی کا جادو سر چڑھ کر بولتا تھا۔ جمیل الدین عالی کی وفات کے بعد لفظ ہونٹوں پر پتھر اگئے ہیں۔ایسا دانشور کہاں سے لائیں جسے جمیل الدین عالی جیسا کہا جاسکے۔صدمے کی اس کیفیت میں کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا لکھا جائے۔عبدالمجید سالک کے یہ اشعار میرے جذبات حزیں کے ترجمان ہیں:

چراغِ زندگی ہوگا فروزاں ہم نہیں ہوں گے چمن میں آئے گی فصلِ بہاراں ہم نہیں ہوں گے
ہمارے ڈوبنے کے بعد اُبھریں گے نئے تارے جبینِ دہر پر چھٹکے گی افشاں ہم نہیں ہوں گے
ہمارے دور میں ڈالیں خرد نے اُلجھنیں لاکھوں جنوں کی مشکلیں جب ہوں گی آساں ہم نہیں ہوں گے

محمد طارق غازی، ٹورانٹو (امریکہ)

جمیل الدین عالی

چھوٹا شاعر مشاعروں میں شرکت کے سبب سے اور بڑا شاعر اپنے فکر کی بنا پر معروف ہوتا ہے۔ جمیل الدین عالی مشاعروں میں شرکت کرتے ہیں، مگر ان کا تعارف مشاعرہ نہیں ان کا شعری فکر ہے۔ میں نے انہیں کبھی کسی مشاعرہ میں نہیں سنا تھا۔ مگر میں ان سے واقف ضرور تھا۔ اور بعد میں ایک مشاعرہ میں بھی سنا۔ باجودیکہ جدہ کے ادبی ریگزار میں ادبی مجلات تک رسائی اتفاقی شے تھی، مگر کبھی کوئی رسالہ مل جاتا تو اس میں گاہے گاہے عالی، عبدالعزیز خالد، قتیل شفائی، اختر انصاری اکبرآبادی، پیرزادہ قاسم، سحر انصاری، محسن بھوپالی، محشر بدایونی، حمایت علی شاعر، محسن احسان وغیرہ کی تخلیقات نظر سے گزرتی تھیں۔ ان جیسے اہل فن مشاعروں میں شرکت نہ بھی کریں تو ان کے فن پر آنچ نہیں آتی ہے۔ نہ ان کی پہچان متاثر ہوتی ہے۔ چنانچہ عالی بہرحال ایک بڑے شاعر کی حیثیت سے جانے جاتے تھے۔ اور جانے جاتے رہیں گے۔ انہوں نے شاعری میں تجربات بھی کئے ہیں۔ ہندی سے کچھ زیادہ واقفیت نہ ہونے کے باوجود دوہے کہے، نیم سیاسی اور ثقافتی کالم لکھے۔ اقتصادیات اور ادبیات اور لسانیات سب سے قریب وبعید تعلق کی اساس پر انہوں نے ایک طویل نظم 'انسان' کہی جو گزشتہ صدی کی آخری دو دہائیوں تک دس ہزار مصرعے اور سطریں کہے جانے کے بعد بھی ان کے بیان کے مطابق نہ مکمل تھی اور نہ کبھی مکمل ہو سکتی تھی۔

عالی نے کہا:

''جب تک انسان کا وجود باقی ہے نظم جاری رہے گی''

جس زمانہ میں ان کا تعلق پاکستان کے بنکوں اور اقتصادیات کے محکمہ سے تھا عالی صاحب اکثر جدہ آتے رہتے تھے۔ اس زمانہ میں رسول احمد کلیمی سعودی مملکت میں بنک الجزیرہ کے سربراہ تھے اور جدہ میں مقیم تھے تو عالی صاحب جب بھی جدہ آتے تو ایک درجہ میں کلیمی کے

منصبی مہمان ہوا کرتے تھے۔ پاکستان سے آنے والے ممتاز شاعروں کی مہمانداری کلیمی کا شوق بھی تھا۔ انہوں نے محسن بھوپالی مرحوم اور افتخار عارف سے بھی اپنے گھر پر ملاقاتوں کا اہتمام کیا تھا۔ ان دونوں موقعوں پر صرف شاعری ہوئی تھی اور ہم نے دونوں مہمانوں سے قند پاکستان کا خوب لطف لیا تھا۔

ایک بار کلیمی نے عالی صاحب سے ایک ملاقات کا اہتمام کیا۔ ان کا فون آیا:

آج شام کو میرے گھر آیئے۔ چائے ساتھ پی لیجئے۔

کوئی خاص سبب؟

ہاں بہت خاص، جمیل الدین عالی آئے ہوئے ہیں کہہ رہے تھے کہ جدہ کے لوگوں سے ملاقات کرواؤ۔ کچھ باتیں کرنی ہیں۔ میں نے آپ کا اور سعدی صاحب کا نام لیا کہ جدہ میں کہ ان دو سے مل لو تو کافی ہے۔ کلیمی نے اس دن عالی صاحب کی شاعری سنوانے کے لئے نہیں بلایا تھا۔ مجھے عالی صاحب سے ملنے میں تو کوئی مسئلہ نہیں تھا مگر جدہ میں میری ادبی حیثیت ضرور مسئلہ تھی۔

میں؟ شاعر نہ ادیب۔ ہاں سعدی صاحب کی بات الگ ہے۔

اس کی فکر نہ کیجئے۔ یہ مجھ پر چھوڑ یئے۔ بس آپ آجایئے۔

کلیمی نے دوستی کی ایک مختلف، بلکہ منفرد قسم سے ہونے کا ثبوت دیا تھا۔ آدمی چاہے کچھ نہ ہو محبت کے مارے اسے وہ سب کچھ بنا دو جو تم اسے دیکھنا چاہتے ہو۔ یہ تو ہوئی بات کلیمی کی۔ اپنا حال یہ کہ زندگی میں کوئی ڈھنگ کا کام نہ کیا۔ صحافی بنے وہ بھی والد کی نافرمانی کر کے تو بھلا ہاں کونسا اعزاز ہونا تھا۔ لکھنے پڑھنے کا شوق تو تھا مگر کیا مجال جو کچھ لکھ پڑھ کے دیا ہو۔ ملک وملت کی خدمت کا بھی بڑا زعم تھا، لیکن یہ زعم دل ودماغ میں لے کر ملک بھی چھوڑ دیا اور ملت کو بھی نظر انداز کر دیا۔ ان لاکھوں لوگوں کی طرح جن کے نزدیک اپنی آسائش کی زندگی کو دنیا کی ہر شے اور زندگی کے ہر مقصد پر ترجیح حاصل تھی۔ لوگوں نے اصلاح وتعلیم کے بیڑے اٹھائے اور کیا کیا کارنامے صفحہ ارض پر نہ چھوڑ دیئے اور کیسے کیسے ادارے بنا کرے دنیا کو وراثت میں دے کر نہ چلے

گئے۔ ہم ساری زندگی اسی خوش گمانی میں رائیگاں رہے کہ ہم تو خود ہی کوئی ادارہ ہیں۔ پھر کلیمی پر اب کیا چھوڑ دیں۔ پھر بھی اس دن کلیمی کی دوستی کے نتیجہ میں خود پر کچھ اعتبار بڑھ گیا۔ دوست کی بات ٹالی نہ گئی۔ شام سے پہلے سعدی صاحب خود گھر پر آ گئے۔ چلئے کلیمی نے بلایا ہے۔ عالی صاحب سے ملاقات کرنی ہے۔۔

سعدی صاحب بھی کبھی پہلے عالی صاحب سے نہ ملے تھے۔ مگر ان کے لئے بھی عالی غیر معروف نہیں تھے۔ ہم نے ٹیکسی پکڑی اور جامعہ جدہ کے نواح میں کلیمی کے گھر پہنچ گئے۔ ٹیکسی اس لئے پکڑی کہ ہم دونوں اُس جدہ میں بے کار تھے جہاں کار رکھنا لوگوں کے لئے سانس لینے سے زیادہ ضروری تھا۔ برصغیر سے جوں جوں مغرب کی طرف بڑھتے جایئے یہ ضرورت ہر ضرورت سے زیادہ ضروری بنتی جاتی ہے۔ اور اب تو خیر سے ہندوستان میں بھی یہی حال ہے کہ کار رکھنے والے مردوں اور عورتوں کو دن بھر کاروں میں گھومنے کے بعد ہر شہر میں صرف اپنی صحت برقرار رکھنے کے لئے سرِ شام سنسان سڑکوں اور ویرانوں میں یوں دیوانہ وار بھاگتے دیکھا جا سکتا ہے جیسے کسی کی جیب کاٹی ہو۔

کلیمی ہمارے منتظر تھے۔ عالی ان سے زیادہ مشتاق تھے۔ مگر اس سے پہلے وہ خود کوئی بات کریں سعدی صاحب نے ان کی شاعری پر گفتگو شروع کی۔ عالی ہمہ تن گوش ہو گئے۔ سعدی صاحب نے ان کی شاعری پر ایک اجمالی تبصرہ کے بعد ان کی ایک چھوٹی سی نظم کا حوالہ دیا اور لمحوں میں اس کا تجزیہ کر دیا۔ عالی صاحب کے لئے یہ کچھ نیا سا تجربہ تھا۔ شائد اس طرح کسی نے ان سے پہلی ملاقات نہیں کی تھی۔ وہ چھوٹے موٹے شاعر نہیں تھے۔ لوگ پہلی بار ان سے بڑی نیازمندی سے ملتے ہوں تو کچھ عجب نہیں۔ مگر وہاں تو ایک مختلف شخص ان سے مخاطب تھا۔ چند جملوں میں عالی تو سعدی صاحب کے قتیل ہو گئے۔ منٹوں کی بات تھی۔ اِدھر سعدی صاحب نے اپنا چمتکار دکھایا اُدھر عالی صاحب ان کے گرویدہ ہوئے۔

میرے پاس ایسا کوئی چمتکار نہیں تھا۔ بس آنکھیں تھیں اور دور کے جلوے تھے۔ عالی

صاحب اپنی جلالتِ ادب کے باوجود بڑے انکسار سے ملے تھے ان کے مزاج میں دہلی کے قدیم شرفاء کی مغل تہذیب کی خُو بُو ایسی رچی بسی ہوئی تھی کہ ان کی کسر نفسی ہمیں شرمندہ کرتی تھی۔ غالب کے خانوادہ سے تعلق اور لوہارو سے ماضی کی نسبت نے ان کی شخصیت میں ایک عجیب بوستانی کیفیت پیدا کردی تھی۔ غالب ہزار شوخی پسند اور ظریف طبع ہوں، مگر تھے تو ایک تہذیب شرافت ہی کے نمائندہ۔ وہی عالی نسبی عالی صاحب کی میراث تھی۔ میں انہیں دیکھ رہا تھا۔ نظم کے حوالے سے سعدی صاحب کے ہر جملہ پر ان کی آنکھوں میں اترتی روشنی کی تحریریں۔ ان کے بُشرہ پر ابھرتے تاثرات، ان کے لبوں پر سرگوشیاں کرتی ہوئی شکرگزاریاں ایک فرد کے بجائے ایک زمانہ کا تعارف کرواری تھیں۔ کچھ دیر کو ایسا لگا جیسے بزم میں بس وہی دو شخص ہوں، ہر تیسرے کا وجود مبہم ہو گیا تھا اور یہ تیسرے کئی افراد تھے۔

نظم کا تجزیہ مکمل ہوا تو عالی صاحب اس بزم میں واپس آگئے ان کے سامنے کئی سوالات تھے۔ وہ اپنی معرکۃ الآراء نظم 'انسان' کے سلسلہ میں کچھ بات کرنا چاہتے تھے۔

انسان!　آدم　ابن آدم　بنی آدم　بنی نوع انساں

انسان جو اجتماعیت سے اُنس رکھتا ہے۔ آدم جو تنہا پیدا ہوا مگر تنہائی کا خوگر نہیں تھا۔ ابھی اکیلا ہی تھا کہ اسے سکونت اور سکنت کے لئے ایک ہم جنس کی فطری ضرورت محسوس ہوئی۔ وہ ایک سے دو ہوا، جوڑا مہیا ہوا تو انسیت پیدا ہوئی اور وہ آدم سے انسان بن گیا۔ انسان دو ہوئے تو ان کے درمیان ایک تیسرا آ دھمکا اور زندگی کا پہلا بحران پیدا ہوا۔ اس بحران کی کوکھ سے دنیا بنی اور اس دنیا میں ایک آدم انسانوں میں تقسیم ہو کر دو سے تین، تین سے تین ہزار، لاکھ، کروڑ، ارب ہوتا چلا گیا۔

انسان اسی بکھرتے ہوئے انسان کی منظوم کہانی تھی۔ اس طویل کہانی میں بے شمار پہلو تھے۔ برسوں سے ان پہلوؤں پر عالی صاحب مصرعے اور سطریں اور بند کہتے چلے آرہے تھے۔ وہ ایک ایسی نظم کہہ رہے تھے جس کی رہنمائی کے لئے فقط وجدان کافی نہیں تھا۔ صرف افکار و اشعار کی آمد پر انحصار نہیں کیا جاسکتا تھا۔ اس مقصد کے لئے عالی صاحب مطالعہ کر رہے تھے۔ دنیا کے ان

تمام موضوعات کا جو انسان کے ساختہ پرداختہ تھے۔ یا انسان کے وجود سے جن کا سوتا پھوٹتا تھا۔ نفسیات، فلسفہ، تاریخ، اقالیم، زمین، آسمان، تہذیبیں، تمدن، فساد، عناد، کون سا شعبہ تھا جس پر مطالعہ کے بغیر اس نظم کو آگے بڑھایا جا سکتا تھا۔ عالی سمندروں میں غواصی کر رہے تھے۔ گوہر نکال رہے تھے اور ایک سلک مروارید بنا رہے تھے۔ عالی پہاڑوں کو کاٹ رہے تھے جوئے شیر کے لئے جواہرات کی کانیں دریافت کرنے کے لئے وہ شہر شہر، ملک ملک شاید اسی لئے دوڑ دوڑ کر جاتے تھے کہ شاید کہیں خضر سے ملاقات ہو اور خضر ہر بار تین سوال پیدا کرے اور پھر ان کے محیر العقول جواب مہیا کرے

میں نہیں جانتا اس طویل سفر میں کتنی بار کسی ایسے استاذ سے ان کی ملاقات ہوئی جس نے مسئلے مشخص کر کے سوالوں کی شرح و جواب میں بدل دیا ہو اس شام یہ موضوع بھی نہ تھا۔ وہ شام عالی کو دریافت کرنے کی تھی۔

انہوں نے اپنے خیال کے سرعنوان سے ردائے اخفا کو سرکایا۔

یہ دوام کیا ہے؟

انسان دوامی ہے۔ انسان دوامی نہیں ہے۔

شاید یوم آخرت میں انسان سمٹ کر پھر آدم کی شخصیت میں مجتمع ہو جائے تو دوام آدم کا ہوا تو پھر انسان کیا ہے۔

سوالات کئی تھے اور اہم تھے۔ وہ طالب علمانہ سوالات نہیں تھے۔ ایک ذی علم شخص کی کھوج کے نشانات تھے۔ وہ بسیط و عمیق مطالعات کے آفاق تھے۔ وہ بیکراں اور بے تھاہ سمندروں کی سوچ کا ممتحن تھے۔

سعدی صاحب انہیں تصوف اور سلوک کی گزرگاہوں پر چہل قدمی کے لئے لے گئے۔ عالی اس راہ کے مسافر تو نہ تھے مگر ان راستوں سے بے خبر بھی نہ تھے۔ امام غزالی اور غوث اعظم سے شیخ ہجویری اور سید بندہ نواز تک سارے ہی بزرگ صوفیاء کی کتابیں وہ دیکھ چکے تھے۔ نکات کی

تشریحات نے انہیں اپنے مقصود سے بے شک قریب تر کیا۔

میرے پیش نظر مسئلہ کا عمرانی پہلو تھا۔ آدمی پیدا ہوتا ہے پھر جہاں سے گزر جاتا ہے مگر جسد کے خاتمہ سے وہ خود ختم نہیں ہو جاتا جس کا ایک مطلب ہے کہ اس کے وجود میں عدم کا ایک اشارہ ضرور پایا جاتا ہے جو دوام کا نقیض بھی ہے اور اس کی کلید بھی۔ عدم کی رستخیز کے باوجود کچھ آدمی مرنے کے بعد بھی باقی رہتے ہیں۔ قدیم میخی حروف میں لکھی جانے والی ساری زبان اکادی میں دنیا کی پہلی داستانی تحریر جلجامش اسی نام کے بادشاہ کی کہانی ہے۔ جو کم و بیش ۴۵۰۰ سال پہلے اکادی عراق میں اور ارک کا حکمراں تھا۔ گارے کی اینٹوں پر کھودی ہوئی اس داستان کی 'کتاب' -یا خشتاب- صدیوں بعد ۱۸۵۳ء میں دوبارہ دریافت ہوئی تو جلجامش کے عدم سے دوسری بار دوام کا دور ابھر کر آیا۔ خود جلجامش کو بھی، عالی صاحب کی طرح، خلود ہی کی جستجو تھی۔ یعنی دوام کا مسئلہ نیا نہیں تھا۔ وہ سارے انسان جو پروہتوں کے روپ یا بادشاہوں کی شکل میں خدائی صفات کے دعویدار ہوئے وہ سب دوامیت ہی کے خواہشمند تھے۔ آج بھی تاریخی عمارات کی دیواروں اور ستونوں پر لکھے ہوئے گمنام انسانوں کے نام دواموں کی آرزوئے خام کے کیا ہوتے ہیں۔

غالب کا انتقال ۱۸۶۹ء میں ہوا مگر ان کا دیوان اس ساری مدت میں پڑھا جا رہا ہے۔ چنانچہ غالب کا دوام برقرار ہے۔ اگر وہ دیوان کبھی معدوم ہو جائے تو ممکن ہے صدیوں بعد داستان جلجامش کی طرح اس کی بازیافت بھی ہو جائے۔ اس بازیافت کے نقطۂ نظر سے غالب کے دوام کا دوسرا دور جلجامش کی مانند شروع ہو جائے گا۔

عالی صاحب سے یہ گفتگو تا دیر چلتی رہی۔ اس عرصہ میں عالی صاحب زیادہ تر سن رہے تھے۔ سوالات کر رہے تھے۔ جرح نہیں کر رہے تھے۔ بحث نہیں تھی صرف تحقیق تھی اور دونوں اردو میں۔ عالی صاحب اقتصادیات کے آدمی بھی تھے۔ وہاں بھی ایک سوال ان کے ذہن کو مضطرب کیئے ہوئے تھا۔ اسلامی اقتصادیات پر بیسویں صدی میں لوگوں نے خصوصی توجہ کی ہے ویسے درحقیقت آٹھویں صدی میں اپنے عہد میں فقہ کے امام ابو یوسف نے اس علم کو اسلامی اساس پر

کتاب الخراج میں مدون کر دیا تھا۔ جدید تحقیق کا آغاز مولانا حفیظ الرحمٰن سیوہاروی نے کیا تھا۔ ان کی کتاب اسلام کا معاشی نظام چوتھی دہائی کے آخر یا پانچویں دہائی کے آغاز میں منظر عام پر آگئی تھی۔ اس کے بعد مغربی معاشیات کے خطوط پر کچھ دیگر لوگوں نے اس میدان میں کام کیا۔ مگر عالی صاحب کے سوال کا جواب کہیں نہیں تھا۔

ان کا نکتہ العفو کے بارے میں تھا۔ سورہ البقرہ (۲:۲۱۹) میں آتا ہے کہ رسول اللہؐ سے لوگ پوچھتے ہیں اللہ کی راہ میں کیا خرچ کریں تو ''کہہ دو کہ جو تمہارے اخراجات سے سوا ہو''۔ سوال یہ تھا کہ اخراجات کے بعد بھی کافی بچت ہو سکتی ہے تو کیا وہ سب خیرات کر دی جائے۔ اخراجات کی شرح کیسے طے ہوگی۔ یہ معاملہ دو گونہ تھا۔ ایک کا تعلق ذاتی اخراجات کی شرح سے تھا اور دوسرے کا معاشرہ کی ضروریات اور اپنے حوصلہ اور صدق نیت سے۔ یہی وجہ ہے کہ اس سلسلہ میں سب انسانوں کے لئے کوئی ایک ہمہ گیر قانون نہیں بن سکتا تھا۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ کے نصاب میں اپنی ضرورت کی تو کوئی اہمیت ہی نہ تھی۔ جو کچھ تھا سبھی معاشرہ کی نذر تھا۔ حضرت عمرؓ کے گھر میں نصف اپنی ضروریات کے لئے تھا اور باقی نصف ملت کے واسطے وقف تھا۔ حضرت عثمان غنیؓ کے حساب میں کبھی ۲۰ ہزار درہم کا کنواں اور کبھی ۳۰ ہزار سے زائد کے جیش عسرت میں سے ایک تہائی فوج کی مکمل لام بندی العفو کی تعریف میں آتی تھی۔ علماء تفسیر اس آیت کو ایک آیت (القصص ۲۸:۷۷) کے تناظر میں دیکھتے ہیں جہاں حکم دیا گیا ہے دنیا میں اپنے حصہ کو نظر انداز مت کرو۔ البتہ اپنی کمائی میں سے حصہ لینے کے بعد اپنے مال کو آخرت کا گھر بنانے کے خیال سے پھر خرچ کرو۔

یہ موضوع بھی دیر تک لفظ و بیاں کے زیر و بم میں رواں رہا اور اس دوران کسی کو چائے کا خیال نہ آیا۔ مجلس برخاست ہوئی تو ایک سرور کی کیفیت تھی۔ بہت مدت بعد کسی ذی علم شخص کے ساتھ تادیر علمی بات چیت ہوئی تھی۔

مجھے اُن لوگوں کی مجلسوں میں کچھ تکدّر رسا ہوتا تھا جہاں ایک شاعر کو دیکھتے ہی شعر سننے

اور اس سے زیادہ اپنے شعر سنانے سے دلچسپی ہوتی تھی۔ کم وبیش اسی زمانہ کی بات ہے جدہ کی ایک نشست میں ڈاکٹر ابن فرید ایک ایسی شخصیت کا ذکر کر رہے تھے جس نے ہندوستان کی تاریخ کے ایک سنگین دور میں ذہن سازی کا زبردست کام کیا تھا۔ ڈاکٹر ابن فرید کی سنجیدہ تقریر جاری تھی کہ پیچھے سے کسی من چلے نے آواز لگائی کہ مشاعرہ شروع کرو۔ ڈاکٹر ابن فرید نے بڑی ناگواری سے ان منچلوں کو ڈانٹا تھا کہ زندگی گل وبلبل اور لیلیٰ مجنون کے علاوہ بھی بہت کچھ ہے ٹھیک ہے۔ کہیں ایک ایسا شاعر آیا ہوا ہو جس نے شعر کہنے کے علاوہ دنیا میں کوئی اور کام کیا ہی نہ ہو تو بات الگ ہے سن لو اس سے شعر اور سنا لو اس کو اپنا کلام لیکن جہاں شعر کے پردہ میں فکر بھی ہو وہاں پہلا کام تو اس فکر کی خوشہ چینی ہی ہوتا ہے اور اس شاعر کو بھی اسی میں زیادہ لطف آتا ہے۔

''چہ بہ از دولت لطف سخن و طبع سلیم''

اس دن کے بعد جب بھی عالی صاحب جدہ آتے ملنے کے لئے بے چین ہوتے ہمیں بھی ان کا انتظار رہتا۔ ایک روز میرے دفتر میں ان کا فون آیا وہ اسی روز جدہ پہنچے تھے میں نے کہا شام کو کلیمی کے گھر ملاقات ہوگی۔ کہنے لگے کلیمی کی کیا شرط ہے۔ میں ابھی آپ کے دفتر پہنچ رہا ہوں وہیں ملاقات کروں گا۔ اور وہ آگئے۔ کچھ دیر بیٹھے۔ پھر شام کو ملاقات کا وعدہ لے کر رخصت ہوئے۔ شام کو اول وقت کلیمی کے گھر پر ملاقات رہی وہاں سے اٹھے تو قریب ہی اپنے ایک عزیز کے گھر ان کا قیام تھا۔ مجھے وہاں لے گئے اور پھر دیر تک ان کے گھر پر بیٹھے رہے۔

عالی صاحب کے پاس بہت موضوعات تھے۔ اپنی شاعری سنانے سے انہیں دلچسپی نہیں تھی۔ ہاں مگر ایک بار سید محمد امین صاحب نے جدہ ایرپورٹ کی خصوصی کالونی کے ہال میں ایک پاک ہند مشاعرہ کیا تو وہاں اپنی غزلیں خوب خوب متوجہ کر کے سنائیں۔ دوہے بھی سنائے اور میری درخواست پر نظم 'انسان' کا ایک بند بھی عنایت کیا۔ وہ الگ قسم کی محفل تھی۔ وہاں یہی کام درست تھا اور حسب حال تھا۔

ہر دو چار مہینہ بعد کار منصبی کی خاطر عالی کا جدہ آنا ہوتا تھا اس بار آئے تو صدر ضیاء الحق

کی حادثاتی موت کے بعد پاکستان کا الیکشن ہو چکا تھا اور حیرت انگیز طور پر بے نظیر بھٹو کی پارٹی کو پارلیمان میں سب سے زیادہ نشستیں حاصل ہو گئی تھیں۔ البتہ نئی حکومت ابھی نہیں بنی تھی۔ پاکستانی سیاست دانوں اور اخباروں میں عورت کی پارٹی کے جیتنے کے بعد یہ بحث چھڑی ہوئی تھی کہ ایک مسلم ملک میں عورت کی قیادت درست ہے یا غلط۔

اس رات حیّ العزیز یہ میں کلیمی کے گھر پر عالی صاحب سے ملنے کے لئے میں اور سعدی صاحب پاکستان کی طرف سے خاصے فکر مند تھے۔ ملک کے مستقبل کے بارے میں ان کا دل دردمند تکلیف محسوس کر رہا تھا۔ ضیاء الحق کی اچانک موت نے ساری بازی پلٹ دی تھی ملک کسی سمت جا رہا تھا اور پھر دوسری طرف کو نکل کھڑا ہوا تھا۔ راستہ ہی نہیں منزل بھی بدل گئی تھی۔ ارادوں کے ساتھ نگاہوں میں فرق آ گیا تھا۔ عالی صاحب کی فراست بہت دور تک دیکھ سکتی تھی۔ ان کے روابط بہت اونچے حلقوں میں استوار تھے۔ ان کی رائے سطحی یا خامکارانہ نہیں تھی۔ پھر بھی انہوں نے راست مجھ سے پوچھا:

آپ پاکستانی نہیں ہیں، باہر سے پاکستان کو دیکھتے ہیں۔ میں جو کچھ پاکستان میں دیکھ رہا ہوں وہ معروضی نہیں ہے۔ پاکستان کے بارے میں آپ کی رائے کیا ہے؟

میری رائے!

پہلی بار کسی سچے کھرے پاکستانی نے پاکستان کے بارے میں میری رائے پوچھی تھی۔ ہندوستانی اور پاکستانی دوستوں میں بیٹھ کر پاکستانی سیاست پر تبصرے تو گویا ہمارا روز کا معمول تھے۔ یہ بھی درست ہے کہ وہ تبصرے بھی معروضی اور حق پسندانہ ہی ہوتے تھے۔ مگر اس دن میری ذمہ داری بہت بڑھ گئی تھی۔ میں ۱۹۴۶ء کے ابوالکلام آزاد کے افکار سے بھی اپنی رائے دے سکتا تھا اور ۱۹۴۷ء کے ابوالکلام آزاد کی زبان میں بھی۔ مگر وہ لا حاصل ہوتا اپنی کہکشاں کے مرکز کے گرد گھومتے ہوئے سورج اور نظام شمسی اکتالیس سال میں ۱۴راگست ۱۹۴۷ء کے نقطۂ آغاز سے ۱۸ کھرب میل کا فاصلہ طے کر چکا تھا۔ کائنات میں نہ سہی، زمین پر یہ بہت طویل مدت کا دورانیہ

بنتا تھا۔ کائناتی وقت میں وہ کہانی بہت، بہت بوسیدہ ہو چکی تھی۔ اس کا تذکرہ ان کے لئے بھی بے سود تھا جو اس واقعہ کے غم میں اپنی جانیں گھلائے دے رہے تھے اور ان کے لئے بھی کشش کھو چکا تھا جن کے نوشتوں میں وہ جشن مرگ انبوہ کے سوا کچھ نہ تھا۔

عالی صاحب پاکستان کی طرف سے فکر مند تھے۔ ان کے پیش نظر مسئلہ ملک و قوم کا تھا۔ وہ حالات سے غیر مطمئن تھے لیکن نتائج پر خوشی بچوں کو ہوتی ہے یا انہیں جن کو وزارت ملنے کا ارمان یا امکان ہو۔ عالی صاحب ان دونوں میں سے کسی گروہ میں نہیں تھے۔

میں نے ان کے چہرے پر تشویش کے سائے دیکھے تھے۔ اندیشہ ہائے دور و دراز خطرناک حالات کی غمازی کرتے ہیں۔ یہ تشویش اور اندیشے جب جب کسی ایسے شخص کے چہرے کا بادل بن جائیں جو غلام گردشوں میں ہونے والی سرگوشیوں کو بھی لفظوں کے ہیولوں میں دیکھ سکتا ہو تو وہ ہاتھوں کے کٹوروں میں دعا کے اترنے کا لمحہ ہوتا ہے۔

میں نے نظر بھر کر عالی صاحب کو دیکھا۔

ہندوستان میں جمہوریت کے تجربہ کو ۴۲ سال ہو چکے ہیں وہاں جمہوریت ابھی دور طفلی میں ہے۔ گھٹنوں کے بل چلنے کے قابل ہوئی ہے۔ ابھی اس عمر کو نہیں پہنچی جہاں قوموں کو اپنی منزل کا عرفان ہوتا ہے۔ ہاں اگر قیادت اپنے منصب، ملک اور ملت کے ساتھ مخلص ثابت ہو تو آزادی کی صدی مکمل ہونے کے وقت ہندوستان کو اپنی منزل کا نشان دکھائی دے سکتا ہے پاکستان میں گزشتہ الیکشن کے نتیجہ کو پارلیمان میں تجربہ کی راہ سے گزرنے دیا جائے تو پانچ سال بعد وہاں طفلک جمہوریت سیدھا بیٹھنے کے قابل ہو سکتا ہے۔ عالی صاحب کے لئے میرا تاثر زیادہ ہی رجائی تھا۔ انہوں نے کہا ابھی تو ملک میں یہی طے نہیں ہوا کہ عورت کی حکمرانی جائز ہے یا نہیں تو مستقبل کی بات اتنے وثوق سے کیسے کہی جا سکتی ہے؟ میرے خیال میں وقت کی اس ساعت میں عورت کی قیادت کا سوال پاکستان میں بعید از وقت تھا۔ عورت کی حکمرانی کا مسئلہ تو ۱۴۰۰ سال پہلے طے ہو گیا تھا۔ آپ کی قوم نے تازہ الیکشن میں اس تاریخی اعلان کو دوسری بار رد کر دیا۔ اس سے پہلے بھی آپ

کی قوم ۱۹۶۵ء میں یہی کام کر چکی تھی۔ پھر اب بحث اس بار اور کیوں؟

بحث سے قطع نظر میرے نزدیک مسئلہ یہ نہیں ہے کہ پاکستان میں عورت حاکم اعلیٰ بنے یا نہ بنے۔ مسئلہ جمہوریت اور اس سے بڑھ کر سیاسی عمل کے تسلسل کا ہے۔ میں جانتا تھا کہ پاکستان کا مسئلہ پاکستان بننے سے پہلے بھی منزل کا ہی تھا، منزل اور منزل کے ہیولیٰ میں بڑا فرق ہوتا ہے۔

عالی صاحب کے ساتھ ان سہ ماہی اور ششماہی ملاقاتوں کی ایک خصوصیت یہ تھی کہ ان میں عموماً کسی ایک ہی موضوع پر تفصیل سے بات ہوا کرتی تھی، خواہ ملاقات عشاء کے بعد سے فجر تک جاری رہے۔ دوسرے ان ملاقاتوں میں شعر شاعری کبھی نہیں ہوئی۔ ہاں کبھی کبھی ادبی موضوعات چھڑ جاتے تھے۔ عالی صاحب بابائے اردو مولوی عبدالحق، انجمن ترقی اردو پاکستان، مقتدرہ قومی زبان، اردو کالج اور اردو یونیورسٹی وغیرہ کے بارے میں معلومات فراہم کرتے تھے۔ پاکستان کی ادبی صورتحال پر ان کی رائے مثبت اور امید افزا ہوتی تھی اس میں شک نہیں کہ اگرچہ پاکستان میں بھی اردو کو ہموار زمین نہیں ملی تھی۔ اس کے باوجود آزادی کے بعد اس زبان میں جس قدر توانا ادب پاکستان میں لکھا گیا ویسا ہندوستان کے اردو والے تخلیق نہیں کر سکے۔ بات سردار جعفری اور احمد ندیم قاسمی اور وزیر آغا اور شمس الرحمٰن فاروقی کے موازنہ کی نہیں تھی۔ فرق یہ ہے کہ پاکستان سیاسی سطح پر اگرچہ ایک نظریہ ہی کا عملی وجود تھا لیکن ادب میں نظریوں کا ویسا غلام نہ بنا جیسا ہندوستان کا اردو ادیب وشاعر ہو گیا تھا۔ پاکستان میں غالباً سیاسی نظریہ کی ناکامی نے انہیں مزید کوئی ایسا تجربہ کرنے سے باز رکھا ہو۔ شاید یہی وجہ ہو کہ عالی صاحب جب اردو کی بات کرتے تھے تو ان کے لہجہ میں وہ تشویش یا اندیشے نہیں ہوتے تھے جو سیاسی معاملات میں ان کے قومی اخلاص کو آزماتے تھے۔

کلیمی کے گھر پر ایک ملاقات میں شمول سعدی صاحب حسب روایت ہم وہی چار افراد تھے کہ عالی صاحب نے اچانک ہندوستانی مسلمانوں کے احوال کے بارے میں سوال کر دیا۔ میں اس سوال پر حیران ہوا۔

عالی صاحب! آپ پہلے پاکستانی ہیں جنہوں نے اس معاملہ میں مجھ سے کوئی سوال کیا ہے۔ ہم اور سعدی صاحب اپنے دوستوں کی محفلوں میں ساری دنیا کے مسائل پر باتیں کرتے ہیں اور پاکستان کے حالات کے سنجیدہ مطالعہ کے بعد ان پر آزادانہ رائے رکھتے ہیں اور اس کا برملا اظہار بھی کرتے ہیں لیکن یہ حسرت ہی رہی کہ کوئی پاکستانی دوست کبھی ہندوستان یا ہندوستانی مسلمان پر مطالعاتی رائے دینے کا اہل ہو یا اس پر معلومات آفریں گفتگو کی زحمت اٹھائے۔

عالی صاحب نے سنجیدگی سے کہا، بھئی میں تو ہندوستانی مسلمانوں اور ان کے حال و مستقبل سے دلچسپی رکھتا ہوں اور ہندوستان جاتا رہتا ہوں تو وہاں کے حالات پر جگن ناتھ آزاد اور گلزار دہلوی وغیرہ اور دوسرے بہت لوگوں سے بات بھی کرتا ہوں۔ قرۃ العین حیدر سے بھی میں نے اس معاملہ میں بڑی تفصیل سے بات کی تھی۔

ہاں جگن ناتھ آزاد اور آنند موہن گلزار زتشی دہلوی تو کھرے لوگ تھے، ان کے سینوں میں انسانوں کے دل دھڑکتے تھے۔ عالی صاحب ان سے بات نہ کرتے تب بھی وہ دونوں گفتگو اور شاعری دونوں میں سچ کو سچ ہی کہتے تھے۔ ان کی نسل کے بعد اوروں کی بات تو الگ رہی، خود ہندوستان کا نیا اردو شاعر ہنگاموں کے بعد اب ہذیانی شاعری کرنے لگا تھا اور مشاعروں میں ملت کے زخموں کو کرید کرید کر چیخ پکار کو ادب سمجھ بیٹھا تھا۔ اس نسل تک نہ عالی صاحب پہنچے۔ نہ ان کا سوال نہ ان کا درد۔

میں نے عالی صاحب سے وہی بات کہی جو بارہا کہی ہے اور برابر کہتا رہتا ہوں۔ ہندوستان کا مسلمان ابھی راہ میں ہے۔ اسے منزل نہیں ملی۔ خیر، سفر طویل ہو جائے تو کوئی ایسی پریشانی کی بات نہیں، ہاں ذرا تاخیر کی تکلیف بڑھ جاتی ہے۔ یہ کوئی بہت بڑی بات نہیں۔ تکلیف دہ بات یہ ہے کہ ہندوستان کے مسلمان کو راہ دکھانے والا کوئی نہیں رہا۔ اب اس کا راستہ بے میل، اس کی منزل بے نشان اور اس کا وجود بے ارادہ ہو گیا۔ تفصیل میں جاؤ تو کبھی اپنا سر کھل جاتا ہے اور کبھی اپنا گھٹنا۔

دبئی میں سلیم جعفری ہر سال کسی ایک اردو شاعر ادیب کا جشن مناتے تھے۔ جمیل الدین عالی کا نام آنے سے پہلے وہ دنیا سے سدھار گئے۔ ایک بار کسی سفر کے دوران عالی صاحب کے برابر کی نشست پر سلیم جعفری کے بجائے سلیم معینی آ بیٹھے۔ معینی صاحب انجینئر تھے۔ جدہ میں ہوائی اڈہ کی نگراں ٹیم میں بڑے عہدہ پر تھے۔ انہوں نے عالی صاحب کا جشن منانے کا فیصلہ کرلیا۔ عالی صاحب پر مقالہ پڑھنے کے لئے قرۃ العین حیدر دہلی سے خاص طور پر آئیں۔ جشن کے بعد عالی صاحب کی معیت میں عینی نے مدینہ منورہ میں حاضری دی۔ عینی سے ملاقتوں اور روضہ مبارک کے احوال خود عالی صاحب نے مجھ سے بیان کئے تھے۔

یہ وہی زمانہ تھا جب ہندوستان میں مسلمان ایک چھوٹی سی بابری مسجد کی واگزاری کے لئے اپنی جمہوری جنگ لڑ بھی رہے تھے اور ہار بھی رہے تھے۔ جدہ میں ایک دن عالی صاحب نے عینی سے اس مسئلہ پر بات کی۔ وہ مسئلہ کو سمجھنا چاہتے تھے عینی نے عام مسلم جذبات کی نمائندگی کرتے ہوئے بابری مسجد کو مسلمانوں کے حوالہ کرنے کی تائید کی۔ عالی کا مشورہ کچھ اور تھا۔

ایک چھوٹی سی مسجد کے لئے اتنے وسائل اور صلاحیتیں لگانا کیا ضروری ہے، چھوڑ دو اسے۔

عینی بپھر گئیں۔

عالی، وہ ایک چھوٹی سی مسجد نہیں ہے۔ بابری مسجد ہندوستان میں ہماری شناخت کا مسئلہ ہے۔

عینی نے اس شد ومد سے بابری مسجد کے مقدمہ کی وکالت کی عالی صاحب حیران رہ گئے۔

اسی حیرانی کو حرف وصوت سے مزین کر کے انہوں نے کہا:

''اسی دن مجھے معلوم ہوا کہ بابری مسجد کا مسئلہ اصل میں کیا ہے۔ اور اس معاملہ میں ہندوستانی مسلمانوں کے حقیقی جذبات کیا ہیں۔ مجھے ان جذبات کی بڑی قدر ہوئی۔ عینی سے گفتگو کے بعد میں ہندوستانی مسلمانوں کی نفسیات کو زیادہ بہتر طور پر سمجھنے کے قابل ہوا تھا۔''

پھر عینی نے دوسری بار مدینہ منورہ میں انہیں حیران کیا تھا۔ عالی صاحب اور عینی دونوں

مواجہہ مبارک پر پہنچے۔ بارگاہِ رسولؐ میں سلام پیش کررہے تھے کہ عینی رونے لگیں۔ پھران کی ہچکی بندھ گئی۔ وہ ازخود رفتہ ہوگئیں۔ میں انہیں سمجھا رہا تھا عینی ہوش میں آؤ، عینی خود کو سنبھالو۔ مگر وہ بس اشک بار تھیں۔ اور بے حال تھیں۔ آنسو تھمنے کا نام ہی نہیں لے رہے تھے اور اسی طرح بادیدۂ نم اس دربار سے وہ رخصت ہوئیں۔ رسول اکرمؐ سے عینی کی محبت مثالی تھی۔ یہ وہی عورت تھی جس پر عصمت چغتائی کے طنز اردو تاریخ کا حصہ ہیں۔ عالی نے اس تاریخ کا دوسرا حصہ بیان کیا تھا۔ میں نے اسی لئے اسے بیان کردیا کہ تاریخ کے حافظہ میں جھول نہ رہ جائے۔

عالی صاحب سے آخری ملاقات میرے گھر پر ہوئی تھی۔ وہ تھے، ان کی بیگم بھی عمرہ کے لئے آئی ہوئی تھیں۔ سعدی صاحب اور کلیمی تھے۔ دو چار لوگ اور تھے۔ وہاں ہم نے عالی صاحب سے ان کی نظم 'انسان' کے کئی بند سنے تھے۔ وہ ہر بند کو اس کے اپنے ثقافتی پس منظر میں الگ الگ لہجوں میں سناتے تھے۔ کبھی ترنم سے کبھی تحت اللفظ۔ ہر بند کی اپنی صوتی محاکات تھیں۔ اپنا پس منظر تھا۔ اپنے کردار تھے۔ اپنے مکالمے تھے۔ اپنی جدا زبان تھی۔ اپنا لطف تھا۔ اپنا مزہ تھا۔

اس طویل نظم میں راوی کا کردار ادا کرنے والے شخص کا نام جمالی ہے۔

میں نے کہا:

عالی صاحب، جمال جمیل الدین عالی کا مخفف ہے۔

• عالی صاحب مسکرا دیئے۔ پھر سنجیدہ ہو گئے۔

اس شاہکار نظم کے تمام کرداروں کا عارف جمیل الدین عالی جیسا انسان ہے جس انسان کو انسان کا عرفان ہوا وہی اس منصب کا حقدار تھا۔

By Abdul Hasanat

Jamiluddin Aali – A man in search of identity

Jamiluddin Aali, lovingly called Aaliji, was an ambitious man with an undying, never-ending lust for fame and prominence. More than that he was an enigma, a man of many contradictions, eluding any fair assessment of his personality. His was a life full of achievements. He was a successful man as a careerist, as a poet and a writer. But he was never sure of his successes and always remained a dissatisfied man suffering from an internal strife, restlessness and a fear of being consigned to oblivion.

Born on January 20, 1925 in Delhi as Nawabzada Mirza Jamiluddin Ahmad Khan, Aaliji did not have pleasant memories of his childhood days. His mother, a direct descendant of Khwaja Mir Dard, was the fourth wife of Sir Amiruddin Khan, the Nawab of Loharu, a princely state in northern India. Aali was hardly 11 or 12 years old when his father died and the family was obliged to manage life on a meager stipend allowed by the British-India government.

Poetry was first love of Aali for the vocation had since long been there in the family having ties of kinship with Mirza Ghalib. He started composing poetry at an early age. He referred his early age. He referred his early compositions to Nawab Sirajuddin Khan Sail Dehlavi to learn the techniques of the art. Beginning as a *ghazal* poet

he turned to *doha* after he fell in love with Tayyaba Bano whom he married in 1944. By the time he graduated from Delhi's Anglo Arabic College in 1944, Aali had already earned for himself a name as a poet.

He along with his family migrated to Pakistan in 1947 and started his career as an assistant in the Ministry of Commerce. In 1951 he cleared the Central Superior Service examination to join the Pakistan Taxation Service. He was Officer on Special Duty at President House from 1959 to 1963. After serving as Registrar Copyright at Ministry of Education and Secretary National Press Trust, he joined National Bank of Pakistan and remained there till his retirement.

But his was a restless soul. The recognition and admiration he earned for his poetry would not quench his perennial thirst for fame and prominence. He always wanted to be in limelight and loved to be amidst one or the other controversy. But the controversy he was caught in the early days of Ayub Khan's martial law regime continued to haunt him all through his life. As the story goes, Aali along with his few friends initiated a move in 1959 to set up what later turned out to be the Writers Guild. However, those who censure Aali for this 'unholy sin' were never fair in their criticism. These detractors while trying to defame Aali forgot that almost all the known poets and writers on either side of the ideological divide were very much on board in this project and became its founding members. They, however, thought that this 'trade union of writers and poets' would be used

as a tool and propaganda machine in furtherance of the objectives of martial law regime. What added credence to these misplaced apprehensions was Aali's posting as Officer on Special Duty at Ayub Khan's secretariat.

But this would not dampen his spirits. He had the capacity and the ability to outwit all his detractors and critics. With his God-gifted talent for creativity, he invoked the Muses and proved that he was unbeatable.

Those were turbulent times when Aali started writing poetry. The Progressive Movement was there and its proponents wee out to challenge the status quo. For this new breed of writers and poets the cultural, social and literary traditions of the past were meaningless and devoid of the potential to meet the demands of modern age. The *ghazal* which symbolized most the values and norms of the society naturally became their prime target. It was already being threatened by the movement of modern poetry spear-headed by Altaf Husain Hali and Muhammad Hussain Azad under the patronage of British-India government.

All this did not impress Aali and he would not subscribe to the agenda of either of the two movements. Instead he set himself out to compose *ghazals*. Though adhering to the traditional form of the craft, his was a fresh voice. He soon developed his own diction with evocative imagery and a lyricism that was unique. But he shows his real potential and creativity in *dohas*.

Gifted with a melodious voice and an understanding of classical music, Aali would take the listeners to a state of ecstasy and leave them in trance. His poetic sensibility is better captured and expressed in his *dohas* than his *ghazals*. Though laden with erotic themes, there is no lewd sentiment or base thought in his *dohas*. He broke new grounds while experimenting with its form and technique which he would later referred to as *Aali Chaal* (Aali's style or innovation). Aali deviated from the centuries-old strict rules of Hindi *doha* and took the genre to new heights by redefining its thematic boundaries and altering its form. A considerable part of his *ghazals* and *dohas* is autobiographical. But elsewhere social sensibility and concern about the contemporary issues also find expression.

His most original and greatest contribution to the world of literature is his long poem *Insan*. Though still incomplete, it took Aali more than five decades to write more than 10,000 lines. Such dramatic, allegorical poems had their origin in ancient Greek drama. But it was rarely used even in Western literature and had no precedence in Urdu at all. Crafted on the pattern of drama, *Insan* is divided into different acts or cantos which merge with each other lending it a thematic and contextual unity. It is indeed a superb mix of dialogue, monologue, soliloquy and narrative and all these techniques are deployed to retain the variety and peculiarity of expression to suit the demands of different characters.

Aali also composed songs or *geet* and a few of his national songs, like the anthem he wrote for the first summit of heads of Muslim states in 1974 or the *Jevay, Jevay Pakistan*, earned him laurels. These unconventional songs are remarkable for their lyricism and rhythmical tone.

He was a prolific writer of Urdu prose as well. He wrote hundreds of forewords for the books published by *Anjuman Tarraqi Urdu*. His travelogues, which were serialized in Urdu daily *Jang*, have been published in three volumes. Besides from 1967 till 2010 he wrote a regular weekly column for the same Urdu daily. Contrary to his poetical compositions, he cared less for the clarity of thought and sanctity of language in his prose writings which were more journalistic and hardly literary. But few of his forewords not only indicate the depth of his scholarship and comprehension of the literary subjects but also reveal that how good a writer he could be when he wanted to be. His essay on sail Dehlavi is simply an outstanding literary piece and a real contribution to the art of sketch writing in Urdu literature.

There is another side to his personality and that is the role of a crusader and savior he played for the establishment and growth of a number of institutions in the field of education, literature and language. Never willing to accept defeat for his commitments, especially when it came to the issues of Pakistan and Urdu, Aali fought many battles, earned the hostility of many, but ultimately managed to have his way.

He took pride in being successor of *Baba-e-Urdu* Moulvi Abdul Haq and saw to it that his mission was carried forward and his dreams were realized. It is another agonizing chapter of Aali's life when he maneuvered and fought in the corridors of power and out-witted all the schemers who had planned to sideline Moulvi Abdul Haq and to deprive Urdu of its national status. How he struggled to save Urdu College when it was nationalized in 1972, how he struggled for its survival and later to take it to the status of a university is a long tale and subject of another article.

The *Anjuman Tarraqi Urdu* is another institution that would have died long ago had Aali not been there at the helm of its affairs. He took over as honorary secretary of the Anjuman after the death of Moulvi Abdul Haq in 1962 and did everything humanly possible to ensure its survival and growth. (He has left the seeds for another controversy behind that may haunt him even after his death, i.e. his decision to 'bequeath' the *Anjuman Tarraqi Urdu* to his son.) Aali could also be credited as a savior of the grand 22-volume *Urdu Lughat* project of the Urdu Dictionary Board.

It is, however, not known how and why Aali drifted into politics. Was it was once again his impulsive behavior for fame and prominence or there were some other unavoidable and inescapable compulsions? Aali would always evade questions about this side of his personality. What this writer can gather, Aali never wanted to swim in this ocean, the depth of which he did know.

He was 'compelled' to contest the 1977 National Assembly elections on Pakistan People's Party ticket only to lose to munawwar Hasan of Jammat-i-Islami. His second stint in politics was when in 1997 he became a senator as a nominee of the Muttahida Qaumi Movement.

All these successes, all these achievements and all these laurels notwithstanding, Aali's was a restless soul – dissatisfied and disenchanted and in his own words:

Jewan aanch nay kiya bakhsha ik sachay sur ki piyas
Who sacha sur laga nahein aur Aali gai Udas

What has this existence bestowed?
A burning Soul and a longing
For a *Sur*, the heavenly tune
To unveil the secrets of Life;
But Lo! Failing to invoke Muses,
Goes Aali, forlorn and cast down.

A fighter for a cause!

It was the morning on February 7, 2005. I was still in bed after my routine work at night when I received a phone call from Dr Rauf Parekh asking me to 'immediately' see Dr Farman Fatepuri. Though not knowing what the actual problem was, I sensed the 'urgency' and rushed to the office of Urdu Dictionary Board.

As soon as I entered the office of Dr Farman and before I could settle myself on a chair across his table, he told me "you must do something to save this project." He then showed me some letters/faxes from Islamabad which indicated that the government intended either to merge the Board with some other organization or to wind it up. I asked for the copies of these letters so that I could run a story. To this he said no and even refused to come on record in this regard. "How can I help you Farman Sahib in this situation," I asked. "That is your headache," he said adding that "but you have to do something." This naturally left me puzzled. Immediately a thought occurred to me that Jamiluddin Aali could be of some help. I asked Dr Farman that did he speak to Aaliji. "No. But you may do it," he told me adding further to my annoyance. Not really understanding the apprehensions or fears of Farman Sahib, I contacted Aaliji from my mobile phone asking if I could see him immediately. He was at Urdu university and asked me to come over there.

I found him in his office resting on a mattress in a corner of the room. He was not well and was running

temperature. As I told him the whole story, Irealised that he already knew about it but was not much keen to take any initiative. "Why Farman himself cannot take up the matter? Tell him to hold a press conference and expose the whole conspiracy; only then I will see what I can do," Aaliji said with a visible distaste on his face. I tried to make him understand the compulsions of Dr Farman and other officials of the Board. He would not buy these explanations and almost dismissed me with a firm declaration: "Then I cannot do anything." But I had known Aaliji since long and knew some of his weaknesses. "Look Aaliji, you claim to be the custodian of the legacy of Moulvi Abdul Haq and this *Urdu Lughat* was still an unrealized dream of Baba-e-Urdu. Will you let it shatter like this?" That worked. With his eyes fixed on me he seemed tense and lost for a few moments. But soon he was in his usual self and said to me: "This is emotional blackmail but you a have a point there and I will see what I can do." After a long pause, Aaliji told me" there is an inaugural function of Saknan-i-shahr-i-Quaid Trust today. Some ministers and other government officials are expected there. Since I am not well, I had regretted to the organisers. But now I will go there and you will see what I do." My mission accomplished, I sought his leave. But there was something else on Aaliji's mind. It was now his turn to blackmail me. Probably knowing well that I avoid such gatherings, he told me in a very firm voice" "You also have to be there personally and must ensure that I am 'lead' on your page." I agreed.

And Aaliji lived up to his promise. Taking advantage of his sickness, he convinced the organisers to be the first speaker. Once on the rostrum, he thundered and roared attacking the government with all the rhetoric at his disposal for its nefarious designs about the *Urdu Lughat* and the Urdu Dictionay Board. As he set the tone for succeeding speakers, the organisers complained that Aaliji had spoiled their function. Immediately after his speech but before leaving the venue he came to me in the back rows. "Was I up to the mark?" he asked and I simply tanked him. He did not stop here. In the following days he used all the might of his tongue and pen to plead the case of Urdu Board and could rightly be credited as a savior of the 22-volume *Urdu Lughat* project. – **AH**

صاحبزادی اُنیسہ بانو

جمیل الدین عالی۔۔۔میری نظر میں

۵ دسمبر ۲۰۱۵ کو ہم تمام خاندان والے دوست احباب اسلام آباد میں مراد جمیل کی رہائش گاہ ''مشکواۃ الانوار'' میں اکٹھے ہوئے۔اس دعائیہ تقریب کا مقصد تمام رشتہ داروں اور احباب کے ساتھ مل کر نوابزادہ جمیل الدین عالی کو خراجِ تحسین پیش کرنا، ان کے لئے دعائے خیر مانگنا اور ان قیمتی لمحات ان کی یاد تازہ کرنا تھا جو ان کے ساتھ بتائے گئے تھے۔اس دعائیہ تقریب میں صاحبزادی طاہرہ بانو بیگم (ہمشیرہ عالی صاحب)، تینوں فرزند جناب ذوالقرنین جمیل عالی، نصیر جمیل، مراد جمیل اور ان کی اہلیہ سمیرا صدیقی، بڑی صاحبزادی حمیرا مصطفیٰ اور ان کے شوہر نامدار جناب مصطفیٰ قصوری، چھوٹی صاحبزادی رابعہ شاداب اور ان کے خسر جناب شاداب مسرت، صاحبزادہ یعقوب خان معہٗ اہلیہ طوبیٰ بیگم، صاحبزادی ماہ بانو بیگم قریشی اور ان کے شوہر نامدار سابق سفیر پاکستان جناب ڈاکٹر سمیع قریشی، جناب خورشید محمود قصوری اور ان کی اہلیہ بیگم نسرین قصوری، جناب احمد رضا قصوری، محترمہ فوزیہ قصوری، صاحبزادی زرین بانو بیگم، صاحبزادی ظفر بانو بیگم، صاحبزادی اظہر بانو بیگم، صاحبزادہ معظم الدین مظہر و اہلیہ، صاحبزادہ مفتخر احمد خان و بیگم نجیبہ اور ناچیز اُنیسہ بانو اپنے فرزند کرنل عزیز احمد کے ساتھ شریک محفل ہوئے۔معروف احباب میں جناب امجد اسلام امجد، جناب سرتاج عزیز و دیگر شامل رہے۔

اس تقریب کا انتظام گھر سے ملحق لان میں کیا گیا۔مخملی شامیانے کی ایک جانب جناب جمیل الدین عالی صاحب اور ان کی اہلیہ صاحبزادی طیبہ بیگم کی قدِ آدم تصاویر لگائی گئیں۔جو ان کے دارالمطالعہ کا ایک منظر پیش کرتی تھیں۔گویا خاندان کا اوڑھنا بچھونا کتاب ہی رہا ہے۔ایک جانب میز پر تاثرات رقم کرنے کے لئے رجسٹر رکھا گیا۔اسی میز پر جناب عالی صاحب کی معروف طویل نظم 'انسان' کی کاپیاں سجی ہوئی تھیں۔تقریب سے مخاطب ہونے کے لئے مائیک استادہ کیا گیا۔اس

مائیک سے میزبان صاحبزادہ مراد جمیل نے اپنے والد مرحوم کے آخری لمحات سامعین کے گوش گزار کیئے۔ اور جس تحمل، محبت، اعتقاد اور اپنائیت سے یہ تذکرہ کیا گیا اس کی مثال ملنا مشکل ہے۔

تلاوت قرآن کے بعد انہوں نے جناب جمیل الدین عالی کے آخرے لمحات بیان کیئے کہ جس سہولت سے ان کی روح جسدِ خاکی سے جدا ہوئی جیسے کہ جگ سے پانی کا ایک قطرہ گلاس میں منتقل ہوتا ہے۔ اس پر انہوں نے اللہ تعالیٰ کا خصوصی شکر ادا کیا۔ ان کا بیان اس تربیت کی عکاسی کر رہا تھا جو انہیں اپنے کنبہ پرور والدین کی جانب سے بہم پہنچائی گئی تھی۔ نہ صرف اسلام آباد بلکہ کراچی میں بھی جمیل الدین عالی صاحب کے لئے تقریب دعا منعقد کی گئی اور لاہور بھی اس سلسلے میں انتظام کیا گیا۔

صاحبزادہ یعقوب نے ان کے بارے میں اپنے خطاب میں کہا کہ انہوں نے اپنی نسل کی عمدگی سے نمائندگی کی ہے۔ ان کے تصورات حب الوطنی، خلوص اور سچائی سے لبریز رہے ہیں جن کو انہوں نے اپنی تحریروں، نغموں اور شاعری کے ذریعے بیان کیا اور ملک اور قوم کی گراں قدر خدمات انجام دیں، خصوصاً ایسے حالات میں جو ملک کے لئے انتہائی تشویشناک تھے۔ انہوں نے کبھی مایوسی کا اظہار نہیں کیا اس کی مثال انہوں نے پینسٹھ کی جنگ میں 'اے وطن کے سجیلے جوانو!' اور آگے چل کر 'جیوے جیوے پاکستان' جیسے نغمے لکھ کر قائم کردی ہے۔ تاریخ ہمیشہ ان کی خدمات کو سنہرے حروف میں لکھے گی۔

سر تاج عزیز صاحب نے جناب جمیل الدین عالی کو ان الفاظ میں خراج تحسین پیش کیا کہ عالی صاحب سے میری ملاقات ۱۹۹۷ء میں ہوئی۔ یہ اپنی تازہ کتاب دوہے لے کر آئے۔ ان کے بارے میں اس وقت بہت چرچا تھا کہ ایک نوجوان شاعر اُبھرا ہے جو نہ صرف شاعری بلکہ نثر میں بھی اپنا مقام بنا رہا ہے۔ میں ان کی شخصیت سے بہت متاثر ہوا۔ ان کی شخصیت اتنی ہمہ گیر ہے کہ میں نے آج تک ایسی شخصیت نہیں دیکھی۔ مشرقی پاکستان کے بنگلہ دیش بننے میں جو کرب انہوں نے جھیلا بیان سے باہر ہے۔ ان کی شاعری میں انسانیت، شرافت نمایاں رہی ہے اس کی مثال ان کی خواتین

کے بارے میں لکھی گئی نظم:

ہم مائیں، ہم بہنیں، ہم بیٹیاں　　قوموں کی عزت ہم سے ہے

قابلِ ذکر ہے۔ اس کے بعد وہ سول سروس میں آئے پھر بینکر بنے لیکن قلم سے اپنا رشتہ استوار رکھا۔
سرتاج عزیز صاحب کے بعد دیگر شرکاءِ محفل نے اپنے تاثرات پیش کیے جو عالی صاحب کی قد آور
شخصیت کی غمازی کرتے تھے۔

عالی صاحب رشتے میں میرے والد محترم صاحبزادہ صلاح الدین (عرف جمی میاں) کے
چچا ہوتے تھے اور یوں وہ میرے دادا ہوئے۔ میرے والد خاندانِ لوہارو سے تعلق رکھتے تھے۔ یہ خاندان
برصغیر کے ان ممتاز خاندانوں میں ایک ہے جو ادب سے لگاؤ اور خدمت کی وجہ سے جانے جاتے ہیں۔
خاندانِ لوہارو میں کئی شعرا کے حوالے ملتے ہیں جن کا ذکر مرزا غالب کے خطوط اور کلام میں بھی ملتا ہے۔
مرزا غالب کی شادی میرے والد کی پھوپی امراؤ بیگم سے ہوئی تھی۔ اسی طرح داغ دہلوی کا سلسلہ بھی
ملتا ہے۔ خاندان کے صاحبِ دیوان شعرا اعظم مرزا اور سائل دہلوی نمایاں رہے ہیں جبکہ دیگر مذاقِ سخن
رکھنے والے مرزا غالب سے اصلاح لیتے رہے ہیں۔ میرے والد محترم بھی سائل دہلوی کے شاگرد رہے
ہیں۔ اس پس منظر میں جناب جمیل الدین عالی کا شاعرانہ مزاج سمجھ میں آنے والی بات ہے۔ ان کی
شاعرانہ اختراع 'دوہے' نے شاعری میں ایک نیا رُجحان پیدا کیا ہے اور ان کی نثر نے اپنا جداگانہ مقام
بنایا ہے۔ ان کی کتب کی تفصیل طویل ہے جو انہیں زندۂ جاوید رکھے گی۔

میرا عالی صاحب سے ادبی تعارف جنگ اخبار سے ہوا۔ ابھی میں نہم میں تھی اور اخبار میں
شائع دو کالم پڑھنے کا مجھے بہت شوق تھا ان میں ایک جناب جمیل الدین عالی کا 'تماشہ میرے آگے' اور
ایک ابن انشاء صاحب کا تھا۔ اس وقت میرے والد رحیم یار خان میں برسرِ ملازمت تھے۔

ان دونوں دانشوروں کی تحریروں نے مجھ میں ادبی ذوق پیدا کیا اور میری مطالعہ کی عادت
پختہ ہوگئی۔ عالی دادا سے میری پہلی تفصیلی ملاقات اسلام آباد میں ہوئی جب انہیں حکومت کی طرف
سے ان کی خدمات کے صلے میں تمغے سے نوازا گیا۔ اس وقت دونوں طیبہ دادی اور عالی دادا بہت خوش

تھے۔ ان دونوں میں باہمی موافقت دیکھ کر مجھے بہت رشک آیا۔ دادی جان شاپنگ کے لئے سپر جناح سے لوٹی تھیں اور وہ انہیں اپنے خریدے ہوئے چاندی کے کنگن دکھارہی تھیں۔ اس وقت کے فیشن کے مطابق کنگن ملگجے سے لگ رہے تھے جو دادا جان کو پسند نہیں آرہے تھے انہوں نے مشورہ دیا کہ انہیں اُجلوا لیا جائے تو رد پہلے کام کے جوڑوں کے ساتھ خوب میل کھائیں گے۔ طیبہ دادی نے اس خیال کو بہت پسند کیا۔ میں سوچنے لگی کہ بات تو معمولی سی ہے لیکن کتنے گہرے معنی دیتی ہے۔ ماشاء اللہ ان دونوں کی رفاقت تقریباً ساٹھ برس سے اوپر رہی ہے اور ہمارے لئے ایک مثال قائم کرگئی ہے۔ مجھے جب بھی کراچی جانے کا اتفاق ہوا اُن سے ملاقات کے لئے حاضری کو سرِ فہرست رکھا۔ میری خوش نصیبی کہ میں ان سے کئی بار شرفِ ملاقات حاصل کرچکی ہوں اور ان کی دانشورانہ گفتگو سے گوہرِ نایاب سمیٹتی رہی ہوں۔ اور ہر بار ان کے دستِ مبارک سے اپنے نام کی گئی کتب وصول کرتی اور اپنی قسمت پر ناز کرتی کہ میرے دادا کی نظرِ کرم مجھ پر ہے۔

اپنے والد کی وفات کے بعد میں ان کا شاعرانہ کلام لے کر دادا جان کی خدمت میں گئی اور ان سے مشورہ مانگا کہ اسے کیسے شائع کیا جائے۔ میرے والد مرحوم انتہائی فرض شناس سرکاری افسر رہے ہیں لہٰذا انہوں نے اپنی زندگی میں اپنا کلام شائع نہیں کروایا کہ سرکاری ملازمت کے اُصول کے خلاف ہے۔ تاہم ریٹائرمنٹ کے بعد اسے صاف کروالیا تھا۔ دادا جان کے مشورے سے کراچی کے ہی ایک پبلشر کے ذریعے 'دیوانِ محشر' کے نام سے اسے شائع کیا گیا۔ جب میں یہ نسخے لے کر دادا جان کی خدمت میں پہنچی تو وہ بہت خوش ہوئے اور کہا لو جی میاں بھی صاحبِ دیوان ہو گئے۔ والد صاحب کے کلام کو بہت پسند کیا اور میری بہت حوصلہ افزائی کی۔ دادا جان کو میرے لکھنے کے شوق کا علم تھا ہر مرتبہ مجھ سے پوچھا کرتے تھے کہ اب کیا شغل ہے۔ میرے جواب پر مسرت کا اظہار کرتے اور میرے لئے اپنی نئی کتب منگوا کر اپنے ہاتھ سے لکھ کر دستخط کرتے اور میرے سپرد کرتے تھے۔

ایک مرتبہ ایک مسئلے پر مجھے اعتراض ہوا جو مہربان متین صاحب کی وجہ سے درپیش تھا اور مجھ سے ہضم نہیں ہو پا رہا تھا۔ متین صاحب اس بات پر مُصر تھے کہ لفظ 'منھ' دوچشمی ھ سے لکھا جائے

اور میں 'منہ' کو ہائے ہوز سے لکھنے کی حامی تھی۔ جبکہ صوتی حوالے سے منھ کا تلفظ بالکل غلط ہو جاتا ہے۔
چنانچہ میں نے دادا جان کی خدمت میں راجو بھائی کے ذریعے پیغام پہنچایا دادا علی اس وقت کافی علیل تھے تاہم انہوں نے میرے نکتے کی نہ صرف تائید کی بلکہ یہ کہہ کر میرا دل بڑھایا کہ خوشی کی بات ہے کہ خاندان میں کوئی اُردو کی سمجھ والا پیدا ہوا ہے۔ ان کی یہ بات میرے لئے ایک اعزاز سے کم نہیں ہے۔

عالی دادا کی شخصیت کے بارے میں لکھنا جوئے شیر لانا ہے۔ دریا کو کوزے میں بند کرنا میری ہمت نہیں لیکن میرے مہربان جناب منصور عاقل صاحب کے اخلاص کو بھی مدِ نظر رکھنا ہے جو توقع انہوں نے مجھ سے لگا رکھی ہے اس کے مطابق تو ہرگز یہ ایسی تحریر نہیں ہے البتہ خاندانی حوالے سے ایک ناچیز کوشش ہے۔

پروفیسر ڈاکٹر غلام شبیر رانا

ہرمن نارتھروپ فرائی (Herman Northrop Frye)

ہرمن نارتھروپ فرائی (پیدائش ۱۴ جولائی ۱۹۱۲ء، وفات ۲۳ جنوری ۱۹۹۱) کا تعلق کینیڈا سے تھا۔ وہ کینیڈا کے شہر شہر بروک '(Sherbrooke) میں پیدا ہوا۔ سات برس کی عمر میں مونکٹون پہنچا۔ بچپن ہی سے وہ فطین مستعد اور فعال طالب علم تھا۔ نصابی اور ہم نصابی سرگرمیوں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتا تھا۔ اس نے سکاوٹنگ کی تربیت حاصل کی اور دکھی انسانیت کے ساتھ درد کا رشتہ استوار کیا۔ پیانو بجانا اور سائیکل چلانا اس کے مشاغل تھے۔ ۱۹۲۹ء میں اس نے اعلا تعلیم کی خاطر مونکٹون سے ٹورنٹو کا سفر کیا۔ اس رجحان ساز نقاد اور ادبی نظریہ ساز تخلیق کار کا شمار بیسویں صدی کے عالمی شہرت کے حامل انتہائی اہم اور موثر دانش وروں میں ہوتا ہے۔ ایک ذہین تخلیق کار کی حیثیت سے ہرمن نارتھروپ فرائی نے افکار تازہ کی مشعل تھام کر جہانِ تازہ کی جانب روشنی کے سفر کا آغاز کیا۔ کینیڈا کے ادب، ثقافت اور تہذیب و تمدن کے نباض کی حیثیت سے اسے جو مقبولیت نصیب ہوئی وہ اپنی مثال آپ ہے۔ ولیم بلیک (William Blake) کی شاعری کی نئی تفہیم اور نئی ترجمانی ہرمن نارتھروپ فرائی کی پہلی تصنیف (Fearful Symmetry) جب سال ۱۹۴۷ء میں منظر عام پر آئی تو دُنیا بھر کے علمی و ادبی حلقوں نے اس کی زبردست پذیرائی کی۔ اس کے ساتھ ہرمن نارتھروپ فرائی شہرت کی بلندیوں پر جا پہنچا۔ ولیم بلیک (پیدائش ۲۸ نومبر ۱۷۵۷ء، وفات ۱۲ اگست ۱۸۲۷ء) کے حقیقی مقام و مرتبہ کے تعین میں اس کتاب کو کلیدی اہمیت حاصل ہے۔ اردو زبان کی کلاسیکی شاعری میں اس کی بڑی مثال شیخ ولی محمد نظیر اکبر آبادی (پیدائش ۱۷۴۰ء وفات ۱۸۳۰ء) کی طرح ولیم بلیک کی شاعری کا حقیقی احسان اس کی زندگی میں نہ ہو سکا۔ ہرمن نارتھروپ فرائی نے اس یگانہ روزگار تخلیق کار کی تخلیقی فعالیت کے بارے میں مدلل گفتگو سے نئے مباحث کا آغاز کیا۔ جب وہ گریجویشن کی سطح پر تعلیم حاصل کر رہا تھا تو اس نے ولیم بلیک کے، بعد الطبیعیات پر مبنی پُراسرار خیالات اور پیش گوئیوں کا تجزیاتی مطالعہ کیا اور کئی حقائق کی گرہ کشائی

کرنے کی سعی کی۔ اپنی ذاتی اُپج کو بروئے کار لاتے ہوئے اس نے واضح کیا کہ ولیم بلیک کی تخلیق فعالیت میں علامات کے ایک خاص نظام کو محوری حیثیت حاصل ہے۔ تخلیقی عمل میں یہ علامات ایک ایسے نفسانی کُل کے روپ میں جلوہ گر ہوتی ہیں جن کے معجز نما اثر سے لاشعور کی حرکت وحرارت اور تاب وتواں کو متشکل کرنے میں بڑی مدد ملتی ہے اس نے روحانیت کے حوالے سے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ بادی النظر میں ولیم بلیک کی پیش گوئیوں کے پس پردہ انجیل کی الہامی تعلیمات کے اثرات ہیں ۔وہ اس نتیجے پر پہنچا کہ ولیم بلیک کی پیش گوئیوں کے سوتے اس کی روحانیت، استغنا اور تپسیا سے پھوٹتے ہیں ادبیات عالیہ لے دس سال کے مطالعات اور تحقیق وتنقید کا ثمر، Fearful Symmetry کی صورت میں سامنے آیا۔ اس کتاب میں ہرمن نارتھروپ فرائی نے قارئین کو ولیم بلیک کی تخیلاتی دنیا کے پُراسرار ماحول سے روشناس کرانے کی کوشش کی اس کتاب کی اشاعت سے ولیم بلیک کے خیالات کے بارے میں پایا جانے والا ابہام دور ہوگیا۔ اس کتاب کے مطالعہ سے قارئین کو تخلیق کار کی آواز اسلوب اور تصورحیات سمجھنے میں مدد ملی۔ تحقیق وتنقید کا حسین امتزاج، حوالہ جات کی منفرد اور ممتاز کیفیت، اظہار وابلاغ کی شان دل ربائی، جامع انداز میں موضوع کا احاطہ، سادگی اور سلامت، صداقت اور ثقاہت دلائل اور بیانات کی مسحور کُن مطابقت اور موضوع سے دردمندی اور خلوص کے تعلق کی بنا پر اس کتاب کو بے پناہ پذیرائی نصیب ہوئی۔ ولیم بلیک کے اس اسلوب کے بارے میں اس اہم تنقیدی تصنیف کے بعد ہرمن نارتھروپ فرائی کی ایک اور تصنیف ''Anatomy of Criticsm'' کے نام سے ۱۹۵۷ء میں شائع ہوئی۔ بیسویں صدی میں ادبی تھیوری کے موضوع پر یہ کتاب کلیدی اہمیت کی حامل سمجھی جاتی ہے اس تنقیدی کتاب میں چار وقیع مقالات شامل ہیں جن میں مصنف نے اس امر کی مقدور بھر کوشش کی ہے کہ ادبی تنقید کے دائرۂ کار نظریۂ اصول، تکنیک اور قواعد وضوابط کے بارے میں کوئی ابہام نہ رہے اور تمام متعلقہ امور کے بارے میں حقائق پیش کر کے قاری کو مثبت شعور وآگہی سے متمتع کر کے عصری آگہی کو پروان چڑھانے کی سعی کی گی ہے۔ ہرمن نارتھروپ فرائی کے خیالات کا عمیق مطالعہ

کرنے سے قاری اس نتیجے پر پہنچتا ہے کہ اس ناتمام کائنات میں دمادم صدائے کن فیکون آ رہی ہے بادی النظر میں ہر انسان اس وسیع و عریض کائنات کے تمام مظاہر کو دو حصوں میں منقسم پاتا ہے۔اس عالم آب وگل میں دو حصے کیا ہیں؟ یہی سوال عہد حاضر کے قاری کے لئے توجہ طلب ہے ان میں سے ایک تو ہر فرد کا مطلوبہ اور پسندیدہ حصہ ہے جس میں راحت واطمینان، مسرت وانبساط اور حسن ورُ دمان کی فراوانی زندگی میں شادمانی کی نوید لاتی ہے۔دوسرا حصہ جسے ناپسندیدہ سمجھا جاتا ہے وہ رنج وکرب، یاس اور اضطراب کے عذاب سے متعلق ہے۔اس المیہ میں اپنے آنسوؤں کے خوش رنگ دامنوں میں نہاں کر کے زندگی گزارنی پڑتی ہے۔اس کے تصور ہی سے سینہ و دِل حسرتوں سے بھر جاتے ہیں اور یاس و ہراس کے ہجوم میں دل گھبرا جاتا ہے اور آنکھوں سے جوئے خوں رواں ہو جاتی ہے۔تخلیقِ ادب میں بھی ایک تخلیق کار کا واسطہ دونوں قسم کے حالات سے پڑتا ہے۔فکر وخیال کی دُنیا میں طربیہ اور المیہ کی جو کیفیات صبح و شام اور باغ و جنگل کی صورت میں دکھائی دیتی ہیں ان کا تعلق زندگی کے ان نمونوں ہی سے ہے اپنے تنقیدی اسلوب میں ہرمن نارتھروپ فرائی نے تنقید کو ایک منفرد روپ اور نئے آہنگ سے آشنا کیا۔اپنی اس معرکہ آرا تصنیف میں ہرمن نارتھروپ فرائی نے نئی تنقید کی بالا دستی، غلبے اور فکری تسلط کو مدلل انداز میں چیلنج کر کے فکرونظر کی کایا پلٹ دی۔اس نے تنقید کو جو معیار، وقار، سانچہ، ڈھنگ، پیمانہ، اسلوب، رنگ اور نمونہ عطا کیا وہ اس کا ذاتی قرار دیا جا سکتا ہے۔اس نے تنقید کے لیے جس طرزِ فغاں کی اختراع کی اسی کو مستقبل کے لئے طرز ادا کا درجہ ملا۔تنقید کے اس خاص نمونے کو ہرمن نارتھروپ فرائی کے مجوزہ تنقیدی سانچے (Archetype) سے تعبیر کیا جاتا ہے جس کے آثار ہر عہد کی تنقید میں ملیں گے۔

وکٹوریا کالج یونیورسٹی میں ہرمن نارتھروپ فرائی نے سال ۱۹۲۹ء میں داخلہ لیا جہاں وہ ٹائپ کے ایک مقابلے میں حصہ لینے کے بعد پہنچا تھا۔وکٹوریا کالج یونیورسٹی جس نے ۱۸۳۶ء میں روشنی کے سفر کا آغاز کیا تعلیم کے وسیلے سے کردار کی تعمیر کی مساعی کے معتبر حوالے سے دُنیا بھر

میں ممتاز مقام رکھتی ہے۔ فلسفہ اور ادیان عالم میں اپنی تعلیم ٹورنٹو یونیورسٹی سے مکمل کرنے کے بعد ہرمن نارتھروپ فرائی نے ۱۹۳۶ء میں کچھ عرصہ چرچ کے منتظم کے طور پر کینیڈا میں خدمات انجام دیں۔ وہ بچپن ہی سے ادب اور فنون لطیفہ کا شیدائی تھا۔ ابتدائی تعلیم کے مراحل طے کرنے کے بعد وہ اعلیٰ تعلیم کے حصول اور پوسٹ گریجویٹ کی تعلیم کی خاطر میرٹون کالج آکسفورڈ پہنچا۔ آکسفورڈ یونیورسٹی سے فارغ التحصیل ہونے کے بعد وہ ۱۹۳۹ء میں واپس ٹورنٹو پہنچا اور اپنے محبوب تعلیمی ادارے وکٹوریہ کالج یونیورسٹی میں تدریسی خدمات پر مامور ہوا۔ سال ۱۹۵۲ء میں وہ اس عظیم اور قدیم مادر علمی میں انگریزی ادبیات کے شعبہ کا صدر بنا۔ اس کے بعد وہ اسی تاریخی درس گاہ کا پرنسپل مقرر ہوا اور نو برس یہاں قیام کیا۔ اس مادر علمی کے ساتھ اس کی والہانہ محبت اور قلبی وابستگی کا یہ عالم تھا کہ اس نے اپنی پوری زندگی یہاں درس و تدریس میں گزار دی۔ اس کی قابلیت اور وسیع تدریسی تجربے اور علمی خدمات کے اعتراف میں ہرمن نارتھروپ فرائی کو اس جامعہ کا چانسلر مقرر کیا گیا۔ جہاں اس نے چودہ برس (۱۹۹۱ء۔۱۹۷۸ء) تک خدمات انجام دیں۔ برطانیہ اور امریکہ کی تمام جامعات میں اُس کے توسیعی لیکچرز کا تواتر سے اہتمام کیا جاتا تھا جہاں لاکھوں طلبا اس رجحان ساز ادیب کے خیالات سے مستفید ہوئے۔ اس کی ادبی تھیوری کی علمی و ادبی حلقوں میں وسیع پیمانے پر پذیرائی ہوئی اور دنیا کی متعدد جامعات نے اسے اعزازی ڈگریوں سے نوازا۔ اس کی ایک مثال چارلس ایلیٹ نارٹون پروفیسر آف پوئٹری کی حیثیت سے اس کا ہارورڈ یونیورسٹی میں (۱۹۷۵ء۔۱۹۷۴ء) تقرر رہا۔ یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ وہ بیسویں صدی کا سب سے اہم اور موثر نظریہ ساز نقاد تھا۔

ادب کے طالب علم جب اس یگانۂ روزگار ادیب کے اسلوب کا جائزہ لیتے ہیں تو ان پر یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ ہرمن نارتھروپ فرائی نے تخلیق فن کے لمحوں میں خون بن کر رگ سنگ میں اُترنے کی جو سعی کی وہ ثمر بار ہوئی۔ اس کا خیال تھا کہ جہاں تک تخلیق فن اور تکنیک کے تنوع کا تعلق ہے ایک زیرک، فعال اور مستعد تخلیق کار کی اہم ترین، افادیت سے لبریز قوی،

فکر پرور اور خیال افروز مباحث سے معمور تخلیق ہی اس کی وہ زندہ جاوید تصنیف ہے جس میں تقلید کی مہلک روش کو ترک کر کے جدّت کے مظہر نئے تجربات کو فکر و فن کی اساس بنایا گیا ہو۔ جہاں تک رنگ، خوشبو اور حسن و خوبی کے جملہ استعاروں کی جستجو کا تعلق ہے یہ صداقت، خوبی اور خیر کی تلاش سے کہیں بڑھ کر کٹھن مسافت، صبر آزما مشقت، مجنونانہ طلب، جان لیوا ریاضت اور طرزِ زندگی کی تپسیا کی احتیاج ہے۔ زندگی کے ان کٹھن مراحل کو طے کرتے وقت ذاتی انا کے مدار سے نکلنا پڑتا ہے اور وسعتِ نظر کو شعار بنانا پڑتا ہے۔ ہرمن نارتھروپ فرائی کو اس بات کا قلق تھا کہ دنیا کے بعض ممالک کے باشندے زر و مال خرچ کرنے میں اسراف کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ کچھ قومیں آمد و خرچ کے حساب کی جانچ پڑتال پر اپنی توجہ مرکوز رکھتی ہیں لیکن فکر و خیال کی اس تہی دامنی کو کس نام سے تعبیر کیا جائے کہ اپنے من میں ڈوب کر سراغ زندگی پانے اور تیزی سے بدلتے ہوئے سماجی اور معاشرتی حالات میں زندگی کی اقدار عالیہ اور درخشاں روایات کی زبوں حالی کے باعث قحط الرجال کی جس کیفیت نے نوع انساں کو ناقابل اندمال صدمات سے دوچار کر رکھا ہے اس کی جانب کسی کو دھیان دینے کی فرصت ہی نہیں۔ جب کارواں کے دِل سے احساس زیاں عنقا ہونے لگے تو بے حسی اور بے عملی کا عفریت ہر سُو منڈلانے لگتا ہے جو سماجی اور معاشرتی زندگی کے لئے بہت بُرا شگون ہے۔ اپنی تسبیح روز و شب کا دانہ دانہ شمار کرنے کی اہمیت کو اجاگر کرتے ہوئے ہرمن نارتھروپ فرائی نے کئی چشم کشا صداقتوں کی جانب متوجہ کیا۔ اس نے اس بات پر اصرار کیا کہ ہر ذی شعور شخص کو دن کا آغاز آنے والے لمحات کی پیش بینی اور غور و خوض سے کرنا چاہیے۔ دوپہر تک اسے اپنے ارادی افعال کی تنظیم نو پر اپنی توجہ مرکوز رکھنی چاہیے۔ جب شام کے سائے گہرے ہونے لگیں تو کام کے سب سلسلے موقوف کر کے طعام، آرام اور گردش مدام سے بچ کر نیند کی آغوش میں جانے کے لئے تیاری کرنی چاہیے۔ بادی النظر میں یہ ایک عام سی بات ہے مگر اس میں زندگی کی حقیقی معنویت کو اُجاگر کرنے کی خاطر جس خلوص اور دردمندی پر مبنی پیرایۂ اظہار اپنایا گیا ہے وہ فکر و نظر کو مہمیز کرنے کا موثر وسیلہ ہے۔

نئے تجربات اور جدید اندازِ فکر مظہر اپنی عملی تنقید میں ہرمن نارتھروپ فرائی نے واضح کیا کہ طرزِ ادا اور منفرد اسلوب ہی کو ایسے معائر اور کسوٹی کی حیثیت حاصل ہے جو تخلیقی فن پارے کی جانچ پرکھ کے لئے ناگزیر ہیں۔ ہرمن نارتھروپ فرائی نے تنقید کے تصورات پر سب سے پہلے کاری ضرب لگاتے ہوئے اس پر گرفت کی۔ اس نے تیشۂ حرف سے نئی تنقید کے خودساختہ نظریاتی حصار کو مکمل انہدام کے قریب پہنچا دیا اور اس کے ساتھ ہی ساختیاتی فکر کو پروان چڑھانے میں اہم کردار ادا کیا۔ اس نے اس جانب متوجہ کیا کہ نئی تنقید نے انفرادی سوچ پر مبنی تخلیقی عمل میں زبان و بیان اور لسانی عمل کے تجزیہ پر جس طرح اصرار کیا وہ تیزی سے بدلتے ہوئے حالات کے تناظر میں ناقابل عمل ہے۔ اپنی عملی تنقید میں اس نے ٹی۔ ایس ایلیٹ، جان ملٹن اور شیکسپئر کا اسلوبیاتی مطالعہ کرتے وقت اپنی انفرادیت کا لوہا منوایا۔ انگریزی ادبیات پر رومانویت کے اثرات پر اس کے تجزیاتی مطالعات کی اہمیت کا ایک عالم معترف ہے۔ اس نے اپنی تنقیدی بصیرت سے نہ صرف کینیڈین ادبیات کی ثروت میں اضافہ کیا بلکہ اس کے فکر پرور اور خیال افروز مباحث کے عالمی ادبیات پر بھی دوررس اثرات مرتب ہوئے۔ ادب کو محض حقیقت نگاری کی اقلیم قرار دینے کے خلاف ہرمن نارتھراپ فرائی کے خیالات نے ادبی حلقوں میں ہلچل مچا دی۔ اس کے خیالات کے بارے میں متعدد تحفظات کا اظہار کیا گیا لیکن اس نے اپنے موقف میں کبھی کوئی لچک نہ دکھائی اور سدا حق گوئی اور بے باکی اپنا شعار بنایا۔

چار ابواب پر مشتمل ہرمن نارتھروپ فرائی کی معرکہ آرا تنقیدی کتاب "Anatomy of Criticism" جو ایک واضح ادبی نظریے کی امین ہے گلشن ادب میں تنقید کے تازہ ہوا کے جھونکے کے مانند قریۂ جاں کو معطر کرنے کا وسیلہ ثابت ہوئی۔ اس کتاب میں کسی ایک قوم یا مملکت کے ادب کا کسی دوسری قوم کے ادبیات سے موازنے کا کوئی تصور نہیں۔ ادبی کائنات کے انداز نرالے ہوتے ہیں جہاں اپنے من کی غواصی کرنے کے بعد سراغ زندگی مل جاتا ہے۔ اس کتاب کے مداح یہ کہتے ہیں کہ ایسی وقیع تصانیف کسی کتاب مرکز یا کسی اشاعتی ادارے کی مرہونِ منت

نہیں ہوتیں بلکہ انھیں ایک ادبی میراث قرار دیا جا سکتا ہے۔ جس سے لوگ نسل در نسل فیض یاب ہوتے ہیں اور ان خیالات کو لمحے نہیں بلکہ صدیاں سنتی ہیں مصنف نے مغربی ادبیات کے وسیع اور عالمانہ مطالعہ کو اپنی اولین ترجیح قرار دیا۔ اس کتاب میں ادبی تنقید کو تخلیق کا درجہ دے کر مصنف نے اپنے اشہب قلم کی خوب جولانیاں دکھائی ہیں۔ اس کتاب کے مطالعہ سے قاری کے فکر و خیال کی دنیا میں انقلاب پیدا ہو جاتا ہے۔ مصنف نے اپنی تنقیدی بصیرت، تخلیقی وجدان اور ذہن و ذکاوت کو اس سلیقے اور قرینے سے پیرایۂ اظہار عطا کیا ہے کہ قاری اس نتیجے پر پہنچتا ہے کہ تنقید کو بھی تخلیق کی اثر آفرینی کے فن سے متمتع کر دیا گیا ہے۔ یہ کتاب معجزۂ فن کی ایسی نمود ہے جس میں طول دیئے گئے مفروضوں کو سمیٹتے ہوئے مثبت نتائج تک رسائی کی مساعی کو ثمر بار کرنے کی کاوش قاری کو حیرت زدہ کر دیتی ہے۔ پہلے باب میں اس نے ادب میں حقیقت نگاری کی مختلف سطحوں پر تنقیدی نگاہ ڈالی ہے۔ اس باب میں اس نے کئی نمونے پیش کر کے حقائق کی گرہ کشائی کی سعی کی ہے۔ اس کتاب کے دوسرے باب میں نشانات (Symbols) سے وابستہ حقائق پر توجہ دی گئی ہے۔ یہ نشانات متعدد ازلی اور ابدی صداقتوں کا احاطہ کرتے ہیں۔ کتاب کا تیسرا باب پُر اسرار مفروضوں کے احوال پر مشتمل ہے۔ ادبی تھیوری اور تنقید سے متعلق اس اہم باب مین اپنی تنقیدی بصیرت اور ذہن و ذکاوت کو روبہ عمل لاتے ہوئے ہرمن نارتھروپ فرائی نے نہایت مؤثر انداز میں یہ واضح کیا کہ جہاں سب موسموں کا تعلق دل کے کھلنے اور مُرجھانے سے ہے وہاں فطرت بھی ہر لحہ لالے کی حنا بندی میں مصروف عمل رہتی ہے۔ خزاں، بہار، سرما اور گرما کا اپنے وقت پر آنا جانا فطرت کے مقاصد اور قدرت کی منشا کا مظہر ہے لیکن یہ حقیقت بھی اپنی جگہ موجود ہے کہ سب موسموں کا تعلق دل کی کلی کے کھلنے اور مُرجھانے سے ہے۔ یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ انسانی زندگی کے نشیب و فراز کا بھی موسمون کے ساتھ گہرا تعلق ہے۔ ہرمن نارتھروپ فرائی نے گرما کو رومان، خزاں کو المیہ، سرما کو طنز و مزاح اور بہار کو طربیہ کیفیات کا مظہر قرار دیا۔ کتاب کے چوتھے باب مین اصناف ادب کی ہئیت اور اسلوب سے بحث کی گئی ہے۔ مصنف نے ادب اور فنون لطیفہ کے حوالے سے اس

باب میں موسیقی، رزمیہ اور ڈرامہ پر نئے اور خیال افروز تنقیدی مباحث کے ذریعے جمود کا خاتمہ کرتے ہوئے اشہب قلم کی خوب جولانیاں دکھائی ہیں۔

ہرمن نارتھروپ فرائی ایک سنجیدہ، خاموش طبع اور ادب کا گوشہ نشین خدمت گار تھا۔ وہ زندگی بھر ستائش اور صلے کی تمنا سے بے نیاز رہتے ہوئے پرورش لوح و قلم میں مصروف رہا۔ اس نے ساختیاتی فکر کو بہ نظرِ تحسین دیکھا اور اسے جہانِ تازہ کی مہکتی ہوئی ہوا سے تعبیر کرتے ہوئے اپنے افکار کی اساس بنایا لیکن وہ ساختیات کا پر جوش اور صفِ اول کا حامی نہیں تھا۔ اس نے ماضی کے مفروضوں کی اساس پر استوار ادبی حکایات پر سوالیہ نشان لگاتے ہوئے ادب میں حقیقت پسندی اور مقصدیت کو مروّج و مقبول بنانے پر توجہ مرکوز رکھی۔ اس کا خیال تھا کہ ماضی کی داستانوں کے طلسمِ ہوش رُبا سے باہر نکل کر زندگی کے تلخ حقائق سے آنکھیں چار کرنا ہی وقت کا اہم ترین تقاضا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ ادب میں حسن و رومان پر مبنی افسانوی اسلوب کو بھی پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھتا تھا۔ اس نے کہانیوں کی چار قسمیں بتائی ہیں۔ کہانیوں کی یہ قسمیں رومانس، طربیہ، المیہ اور طنزیہ ہیں۔ وہ اس نتیجے پر پہنچا کہ ادب میں سائنسی طریق کار کی اساس پر استوار ٹھوس مقصدیت اور خالص حقیقت نگاری اسلوب کو رنگینی، جاذبیت اور دل کشی سے محروم کر دیتی ہے۔ اس لئے اس نے دل کے ساتھ پاسبانِ عقل کی موجودگی کو مناسب بھی سمجھا لیکن یہ بھی کہا کہ حسن و عشق کی داستانوں اور پیمانِ وفا کے افسانوں میں عقل سے آگے نکل کر دل کے افسانے نگاہوں کی زباں پر لانا تنہا دل والوں کا کام ہے۔ ایسے سخت مقامات پر عقل محوِ تماشائے لبِ بام رہ جاتی ہے۔ ہرمن نارتھروپ فرائی نے ادب کے تنقیدی مطالعہ کی ضرورت و اہمیت کو اُجاگر کرتے ہوئے اس جانب متوجہ کیا کہ ادب کا تنقیدی مطالعہ افراد کی صلاحیتوں کو صیقل کر کے فکر و نظر کو مہمیز کرتا ہے اور جہد و عمل کی نئی راہوں پر گامزن ہونے پر مائل کرتا ہے۔ قحط الرجال کے موجودہ زمانے میں معاشرتی زندگی کو شدید دشواریوں اور کٹھن مسائل کا سامنا ہے۔ اس عہدِ ناپرساں کے جس معاشرے میں ہم سانس گن گن کر زندگی کے دن پورے کرنے پر مجبور ہیں اس میں ایک خاص

زاویۂ نگاہ کا انتخاب وقت کا اہم ترین تقاضا ہے۔ انسانی زندگی کی بے اعتدالیاں، تضادات، معاشرتی حالات اور سماجی زندگی کے ارتعاشات سے تخلیق کار گہرے اثرات قبول کرتا ہے۔ ادب کے تنقیدی مطالعہ کے معجز نما ثر سے تاریخ اور اس کے مسلسل عمل کے بارے میں حقیقی شعور و آگہی کو پروان چڑھانا ممکن ہے۔ زندگی اور اس کی حقیقی معنویت کو اُجاگر کرنا ہرمن نارتھروپ فرائی کا مطمح نظر رہا۔ اس کی تحریروں میں انسانیت کے وقار اور سر بلندی پر زور دیا گیا ہے۔ فرد کی زندگی کی ترجیحات اور نا آسودہ خواہشات کے بارے میں اس نے ایک جگہ لکھا ہے:

"The wider concern based on the preference for life, freedom, and happiness to their oppositesis, as we have just called it a projection of desire. The source of all dangers to social routine, real or fancied, is man, his feelings that his desires are not fulfilled by his community" (1)

ہرمن نارتھروپ فرائی نے اس جانب متوجہ کیا کہ ہر زبان میں الفاظ کی ایسی مثالیں اور نمونے موجود ہوتے ہیں۔ جو کئی طرفیں اور معانی رکھتے ہیں۔ بعض تخلیقات ایسی بھی ہوتی ہیں کہ متکلم کائنات کی وسعتوں تک پھیل جاتی ہیں۔ ان کی ورق ورق خاموشی زندگی کی داستان حرف بیان کر دیتی ہے۔ اس کتاب میں پیش کئے گیے اپنی نوعیت کے یہ اولین نمونے (Archetype) کہلاتے ہیں جو ہر عہد میں لائق تقلید سمجھے جاتے ہیں اور انھیں گنجینۂ معانی کے طلسم کی حیثیت حاصل ہے۔ اس کی چند مثالیں قابل غور ہیں۔

باغ، محبت، اور نمو، جنگل، لاقانونیت، خطرات، دریا، رواں دواں زندگی، سمندر، وسعتِ ظرف، خزائن، جزیرہ، تنہائی، پہاڑ، روح اور قلب کی رفعت، مینار، قوت اور ہیبت، گاؤں، سادگی، خلوص اور ملنساری۔

زبانوں میں نشان (Symbol) کو ہمیشہ گہری معنویت کا حامل سمجھا جاتا ہے۔ ہرمن نارتھروپ فرائی نے نشان، معنی کے مباحث میں گہری دلچسپی لی۔ اس نے متعدد نشانات کے

مفاہیم کی جانب متوجہ کیا جن میں چند درج ذیل ہیں۔
روشنی: اُمید، تاریکی: مایوسی، پانی: روئیدگی اور زندگی، آگ: جسم کی تمازت، جذبوں کی جولانی،
برف: بے حسی، موت اور جہالت، کالا: تیرہ شبی، سُرخ: خون، جذبوں کی جولانی، سبز: سبزہ
گُل کی نمو، زمین کی ہریالی، سفید: خالص، بادل: راز، دل: محبت۔

ہرمن نارتھروپ فرائی کے تنقیدی خیالات دقیق اور نکتہ رس ہیں۔ اور اس نے اپنے افکار کی ضیا پاشیوں سے سفاک ظلمتوں کو کافور کرنے کی مقدور بھر سعی کی۔ اس نے واضح کیا کہ جس طرح اس وسیع و عریض عالم آب و گل میں فطرت نے اپنا ایک نظام وضع کر رکھا ہے جس کے تحت تمام مظاہر فطرت مدام حرکت میں رہتے ہیں۔ اسی طرح اسالیب، الفاظ، معانی اور تخلیقی عمل بھی ایک نظام کے تحت سدا سرگرم سفر رہتے ہیں۔ نیچرل سائنسز کے بارے میں بھی اس کا یہی تصور تھا۔ کہ شجر، حجر مادہ عناصر، زندگی کے جملہ مظاہر اور اجرام فلکی سب ایک واضح اور مربوط نظام کے ساتھ منسلک ہیں۔ اسی طرح جب ایک تخلیق کار قلم تھام کر تخلیقی عمل کی راہ پر گامزن ہوتا ہے تو وہ قطرے میں دجلہ اور جزو میں کُل کا منظر دکھاتا ہے۔ یہ سارا تخلیقی عمل الفاظ کی صورت گری کے ایک منفرد نظام کا حصہ ہے اس کے باوجود اس تلخ حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اگرچہ ہرمن نارتھروپ فرائی کے تنقیدی نظریات ادب کے لئے بالعموم حیات آفرین، قوت بخش اور حرکت و حرارت سے لبریز سمجھے جاتے ہیں لیکن انھیں وسیع پیمانے پر قبولیت حاصل نہ ہوسکی۔ اس کا سبب یہ ہے کہ ہرمن نارتھروپ فرائی کے تنقیدی خیالات میں اضافِ ادب کے بارے میں جس خاص درجہ بندی کا غلبہ دکھائی دیتا ہے وہ کسی ٹھوس دلیل یا مثبت بنیاد کی بنا پر نہیں بلکہ یہ درجہ بندی مصنف کی ذاتی پسند اور ناپسند پر مبنی آمرانہ طرز فکر کی مظہر ہے اسی وجہ سے بعض سخت گیر ناقدین اس درجہ بندی کو خشک اسلوب کی آئینہ دار بے لچک درجہ بندی پر محمول کرتے ہوئے اس پر انحصار نہیں کرتے۔ ادب اور فنون لطیفہ کے متعدد اقسام کو ہرمن نارتھروپ فرائی کی متعین کردہ حدود اور درجہ بندی میں ان کے استحقاق کے مطابق موزوں اور برمحل جگہ نہیں دی جا سکتی۔ سائے کا تعاقب،

نشان کا شکار اور عنقا کی تلاش بسیار سے تھک ہار کر قاری ان پیچیدہ خیالوں میں کھو جاتا ہے کہ ان میں کون سی اُلجھن کو سلجھانے کی سعی کی جائے۔

جہاں تک تخلیق ادب میں نمونے کا تعلق ہے ہرمن نارتھروپ فرائی نے اس بات کی صراحت کرتے ہوئے کہا کہ ادب میں نمونہ دراصل ایک علامت ہے جسے ایک عکس سے بھی تعبیر کیا جا سکتا ہے۔اپنی ماہیت کے اعتبار سے نمونے کو ایک ایسے عنصر کی حیثیت حاصل ہے جو ایک زیرک ،مستعد اور فعال تخلیق کار کی شخصیت کی پہچان اور مجموعی اعتبار سے اس کے متنوع تجربات ، مشاہدات ، جذبات ، احساسات اور میلانات کا آئینہ دار ہوتا ہے۔تاریخی حقائق اور تاریخ کے مسلسل عمل کے مطالعہ سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ دنیا کے ہر معاشرے میں پُر اسراریت کی فضا میں پروان چڑھنے والے مفروضوں کا جادو ہمیشہ سر چڑھ کر بولتا رہا ہے۔پُر اسرار مفروضوں میں انسان کی دلچسپی نسل در نسل وراثت میں منتقل ہوتی رہی ہے اور ان کی جادو بیانی کا کرشمہ دامن دل کھینچتا ہے ان مفروضوں کی توسیع و ترویج و اشاعت کا سلسلہ بھی ہر دور میں جاری رہا ہے۔ادب کا وہ سہل پسند قاری جو مفروضوں کے ذکر سے اُلجھن محسوس کرتا ہے جسے ہیملٹ محض اس لئے ناپسند ہے کہ اس میں بھوتوں کا ذکر ہے اور وہ بھوتوں کے وجود کو تسلیم نہیں کرتا یا وہ ان تخلیق کاروں کے شعری ریاض سے نالاں ہے جو علم عروض کی پانچ بحور میں اپنا مافی الضمیر بیان کرنے کے عادی ہیں۔ایسے کور ذوق شخص کا ادب سے کوئی سروکار نہیں۔قحط الرجال کے موجودہ زمانے میں جب مادی دور کی لعنتوں نے زندگی کی اقدار عالیہ کو شدید ضعف پہنچایا ہے ادب سے قاری کا معتبر ربط اب قصہ پارینہ بنتا جا رہا ہے۔ہرمن نارتھروپ فرائی نے اس صورت ،حال پر گہری تشویش کا اظہار کرتے ہوئے کہا تھا کہ جب عوام میں تنقیدی شعور عنقا ہونے لگے اور وہ اپنی ذاتی پسند اور ناپسند اور اپنی خواہشات کے مطابق ادب کی تاویلات اور غیر محتاط حوالہ جات کو وتیرہ بنالیں تو اُن کی یہ بے بصری اور کور مغزی زندگی کی تمام رُتیں بے ثمر کر دیتی ہے اور تحریروں میں بے حسی ،خوف ،دہشت اور تشدد کے رُجحانات کو تقویت ملتی ہے۔جب مطالعہ ادب اور تخلیق ادب کو ذاتی مفادات کے تابع بنالیا

جائے تو یہ امر کسی بھی معاشرے کے لئے بہت بُرا شگون ہے۔

ہرمن نارتھروپ فرائی ایک کثیر التصانیف ادیب تھا۔ عالمی ادبیات کے بدلتے ہوئے معائر اور رجحانات پر اس کی گہری نظر تھی۔ اس نے اپنی بیس سے زائد وقیع تصانیف اور ایک سو سے زائد عالمانہ مقالات سے انگریزی اور کینیڈین ادبیات کی ثروت میں جو اضافہ کیا اس کے بار احسان سے اہل علم کی گردن ہمیشہ خم رہے گی۔ اس کی تصانیف کے متعدد ایڈیشن شائع ہوئے۔ دنیا کی جن بڑی زبانوں میں اس کی تصانیف کے تراجم کیے گئے ان میں چینی، چیک، ڈینش ڈچ، فرنچ، جرمن، یونانی، جاپانی، کورین، رومانین، پولش، سربوکروشین اور سپینش شامل ہیں۔ اس کی تنقیدی تصانیف کا جائزہ لینے کے بعد یہ حقیقت وضاحت طلب بن جاتی ہے کہ لسانیات، نفسیات ،علم بشریات، مذاہب، تاریخ، قانون اور ہر چیز کے بارے میں ان مختلف علوم کی کتابوں میں جو لفظی مرقع نگاری کی ہے اس میں کہاں تک اصلیت موجود ہے کیا یہ سب مرقع نگاری ان موہوم تصورات اور مفروضوں کی اساس پر استوار نہیں ہے جس کی عالمی ادبیات میں فراوانی ہے اس سادہ سے سوال کا نہایت آسان جواب ہر باشعور انسان کے ذہن میں گردش کر رہا ہے کہ دل سے جو بات نکلتی ہے وہ یقیناً قلب اور روح کی اتھاہ گہرائیوں میں اُتر جاتی ہے۔ اسی بارے میں ہرمن نارتھروپ فرائی کا استدل یہ رہا کہ سارے ڈسکورس ایک خاص لسانی ساخت کے مظہر ہیں۔ ہرمن نارتھروپ فرائی کی اہم تصانیف درج ذیل ہیں:

1. Fearful symnetry (1947) 2. Anatonmy of Critcism (1957)
3. The Educated Immagination (1963), 4. The great code (1982)
5. The collected works of Northrope Frye (2008)
6. The secular scripture (1976), 7. The daubb vision (1991)
8. The Bush garden essay (1971)
9. Northrope Frye on Shakespeare (1986)
10. Fabbles of Identity (1963), 11. A natural perspective (1965)
12. The critical path (1971), 13. Fools of time (1967)
14. Myths and Metaphor (1990), 15. The well tempered (1963)
16. Spiritus Mundi (1976), 17. The myth of deliverance (1983)
18. Creation of Recreation (1980)
19. The stubborn structure (1970)

20. The Harper Hand book to literature (1985)
21. Reaching the world (1990), 22. The modern century (1967)

ہرمن نارتھروپ فرائی کا شمار بیسویں صدی کی ادبی تھیوری کے ممتاز نقادوں میں ہوتا ہے اس کے ناقدین کا خیال ہے کہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اب اس کی تنقید کا سحر ٹوٹنے لگا ہے۔ وہ نقاد جس کی جرات آموز تاب سخن نے معاصر نئی تنقید کے علم برداروں پر کڑی تنقید کی خود بھی تنقید کی زد میں آ گیا۔ اس کے باوجود دُنیا بھر میں ہرمن نارتھروپ فرائی کی عزت و تکریم برقرار ہے اور اس کی مقبولیت میں مسلسل اضافہ ہو رہا ہے۔ اس نے جو اعزازات حاصل کیے وہ ستاروں پر کمند ڈالنے کے مترادف ہے۔ اس کے بارے میں یہی کہا جا سکتا ہے کہ کوئی اور کہاں ستارے چھو سکتا ہے سب کی سانس راہ میں اُکھڑ جاتی ہے اس نے دُنیا کی ایک سو سے زائد مشہور جامعات میں توسیعی لیکچرز دیے۔ پوری دنیا سے اسے تیس سے زائد اعزازی ڈگریاں ملیں۔ آرڈر آف کینیڈا کا اعزاز اسے ملا۔ اسے گورنر جنرل ایوارڈ برائے ادب عطا کیا گیا۔ اس کا یادگاری ٹکٹ جاری ہوا۔ اس کی مادر علمی کا نام پر اس کے نام پر نارتھروپ فرائی سکول رکھ دیا گیا۔ ٹورنٹو یونیورسٹی میں نارتھروپ فرائی سنٹر کا قیام عمل میں لایا گیا جہاں اس یگانہ روزگار فاضل کے تنقیدی نظریات اور ادبی تھیوری پر تحقیقی کام جاری ہے اس کے مداح اسے جدید دور کا ارسطو قرار دیتے ہیں جب کہ بعض لوگوں کے نزدیک وہ ہیومینیٹیز (Humanities) کا آئن سٹائن ہے۔ اس کا شمار دُنیا کے ان بارہ ممتاز ناقدین میں ہوتا ہے جن کا ہر عہد میں سب سے زیادہ حوالہ دیا جاتا رہا ہے کینیڈا کے مشہور شہر مونکٹون کی پبلک لائبریری کے سامنے چودہ جولائی ۲۰۱۲ء کو اس رجحان ساز نقاد کی ایک سو دیں سال گرہ کے موقع پر کانسی کے بنے ہوئے مجسمے کی تنصیب ہوئی۔ ہرمن نارتھروپ فرائی ایک بنچ پر بیٹھا ہے اور کتاب مطالعہ میں مصروف ہے۔ مطالعہ اور تحقیق و تنقید میں اس کے انہماک کا وہی عالم ہے جو زندگی بھر اس کا معمول رہا۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ وہ اب بھی یہ کہہ رہا ہے:

تیز رکھنا سرِ ہر خار کو اے دشتِ جنوں
شاید آ جائے کوئی آبلہ پا میرے بعد

ماٰخذ:

Northrop Frye : The Stubborn Structure , Routledge , New

سلیم زاہد صدیقی

تنہائی

''کیا لق ودق مکان تھا۔ اور بڑی بی تنہا رہتی تھیں اس میں؟''

راضعہ نے فا کہہ کے گھر آ کر برقعہ سر سے اتارتے ہوئے حیرت سے کہا۔

''کس کا امّی؟'' فا کہہ نے پوچھا۔

''ارے وہ میری سہیلی ہے نا انجم'' نازیہ نے امّی کی طرف سے جواب دیتے ہوئے کہا ''اس کے ابا کا انتقال ہو گیا تھا دو ماہ پہلے۔ مجھے اطلاع کل ملی۔ آج جب امّی یہاں آنے لگیں تو میں نے سوچا چلو انجم کی امی سے تعزیت کرتی چلوں۔ بس امّی کو بھی ساتھ لیتی گئی۔ اسی کا مکان بتا رہی ہوں کہ کتنا بڑا ہے۔

''تو کیا وہ مکان میں اکیلی رہتی تھیں؟'' فا کہہ نے پوچھا۔

''ہاں بس دونوں بڑے میاں اور بڑی بی رہتے تھے۔ اب جبکہ بڑے میاں بھی چل بسے تو بڑی بی اکیلی ہی رہ گئیں''۔

''ہا۔ بیچاری'' فا کہہ نے افسوس کا اظہار کیا۔ ''کیا کوئی بیٹا نہیں ہے؟''

''ہے کیوں نہیں، ماشاء اللہ سات بیٹے ہیں''

''سات بیٹے ہیں ماشاء اللہ بڑی بی کے اور وہ پھر بھی تنہا ہیں؟''

ارے امّی آپ بھی کیا لے بیٹھی ہیں۔ بھئی انجم کے ساتھ بھائی ہیں انجم کے ابا پرانے آئی سی ایس تھے۔ پاکستان آنے کے بعد کافی عرصہ فارن سروس میں رہے۔ بہت پیسہ کمایا۔ یہ مکان دو ہزار گز کے پلاٹ پر ہے۔ سات کے سات بیٹے بہت قابل ہیں۔ دونوں بڑے بیٹے حارث اور انور ڈاکٹر ہیں۔ امریکہ میں سیٹل ہیں۔ ان سے چھوٹے خاور کا لندن میں ہوٹل ہے۔

پھر جاوید اور ذیشان انجینئر ہیں دونوں نائیجیریا میں ہیں۔نہال کا بزنس ہانگ کانگ میں ہے۔ سب سے چھوٹا خالد میرین انجینئر ہے اور بحری جہاز پر ملازم ہے۔انجم اکیلی لڑکی تھی۔اس کی شادی بھی کینیڈا کے ایک تاجر کے ساتھ ہوگئی وہ بھی چلی گئی اب بڑی بی کے پاس کون ہے''۔

''تو بڑی بی بھی امریکہ اپنے بیٹے کے پاس چلی جائیں'' امی نے رائے دی۔

''بیٹا رکھتا تب نا!'' نازیہ نے کہا انجم نے کئی بار کہا ہے کہ ہمارے ساتھ کینیڈا چلو مگر بڑے میاں اور بڑی بی نہ مانے بولے ہم سات بیٹوں کے ہوتے ہوئے لڑکی کے گھر رہیں! یہ نہیں ہوگا''۔

خاور اور حارث کی بیویوں سے بڑی بی ناراض ہیں۔اور پھر یہ کہ لڑکے بھی شاید رکھنا نہیں چاہتے۔ایک مرتبہ جاوید سے کہا تھا کہ میں تمہارے ساتھ نائیجیریا چلوں گی تو جاوید نے ٹال دیا کہ وہاں کی آب و ہوا بڑی سخت ہے، تم امریکہ حارث بھائی کے پاس چلی جاؤ۔بس اس کے بعد سے نہ کسی بیٹے نے کہا کہ ہمارے ساتھ رہو۔اور نہ بڑی بی نے کسی بیٹے سے کہا تم ہمارے ساتھ رہو۔

''چلو اس وقت کی بات کچھ اور تھی۔ بڑے میاں زندہ تھے مگر اب تو بالکل اکیلی ہیں۔ اب تو کوئی بیٹا ان کو لے جائے'' راضعہ نے کہا۔

''کبھی بھی نہیں جائیں گی اب وہ۔ بہت خوددار خاتون ہیں......امی! ان کا دل بیٹوں سے پھٹ چکا ہے'' نازیہ نے کہا۔''انجم بتاتی ہے بڑی بی ایک مرتبہ پھسل گئیں کولہے کی ہڈی ٹوٹ گئی تو کسی بھی بہو نے خدمت نہیں کی۔اس زمانے میں حارث نیبیں پریکٹس کرتا تھا۔اس نے ایک نرس رکھ دی اور بس۔سارا کام انجم نے کیا بڑی بی نے نرس کو نزدیک بھی نہیں آنے دیا''۔

''افسوس ہوتا ہے یہ سن کر'' راضعہ نے کہا۔ابھی شاید یہ باتیں جاری ہی تھیں کہ دروازے پر گھنٹی بجی دروازہ کھلا تھا اختر السلام علیکم آپا کہتا ہوا اندر داخل ہوا اور راضعہ سے کہا ''امی جلدی چلئے میرے پاس وقت نہیں ہے۔میں آپ کو گھر اتار کر ایک ڈنر میں جاؤں گا شاید رات کے گیارہ بارہ بج جائیں''۔

''اختر بیٹھو چائے تو پیتے جاؤ'' نازیہ نے بھائی سے کہا۔''نہیں آپا پھر کبھی، دولہا بھائی

کہاں ہیں۔ ابھی نہیں آئے؟ اختر نے ٹالا ''اچھا فاکہہ سے تو مل لو''۔ نازیہ نے کہا ''ارے گندی باجی۔ اوہ معاف کیجئے آئی مین چھوٹی باجی بھی آئی ہوئی ہیں؟...... کہاں ہیں؟''

''ابھی تو یہیں تھی شاید کچن میں ہوں'' اسی اثنا میں فاکہہ آگئی اختر نے اسے چھیڑا ''سلام گندی باجی تمہارا پتہ تمہارے میاں نے کیسے کھول دیا''۔

''اختر بیٹا اب ایسی باتیں نہ کیا کرو۔ اس کا میاں سنے گا تو کیا کہے گا؟ راضعہ نے سرزنش کی ''ارے امّی کہنے دو یہ نہیں کہے گا تو کون کہے گا میرا ایک ہی تو بھائی ہے''۔ فاکہہ نے پیار سے کہا۔ 'اور ہاں ۔۔ یہ کہہ رہے تھے کہ تمہارا نام کمپنی والوں نے امریکہ جانے والوں کی لسٹ میں رکھا ہے۔ کب جا رہے ہو؟ فاکہہ نے پوچھا۔ ''پہلے یہ تو بتاؤ ''یہ'' کون ہیں؟ اختر نے پھر چھیڑا۔ ''وہ'' ''یہ'' ہیں تمہارے گندے بچوں کے ''اچھے پھوپھا''۔

اچھا اچھا وہ چرخ۔ پنڈت ہری رام پرشاد عرف سلمان صاحب اور ہمارے چھوٹے دولہا بھائی۔ تو وہ بی جمالو کا کام بھی کرتے ہیں؟''۔

''اس میں بی جمالو کا کیا حوالہ؟''

''بی جمالو کا حوالہ۔ یوں کہ انہوں نے آدھی بات بتائی آدھی گول کر گئے۔ بھئی سچ یہ ہے کہ کمپنی اپنا ایک آفس امریکہ میں کھول رہی ہے۔ اور آپ جانتی ہیں کہ آپ کے اس ناچیز حقیر فقیر پر تقصیر کی دفتر میں کتنی ڈیمانڈ ہے۔ پس انہوں نے مجھے وہاں جانے والوں کی لسٹ میں رکھ لیا۔ مگر یہ بات بہت پرانی ہے۔ تازہ بہ تازہ یہ ہے کہ وہ نام میری ریکوسٹ پر وہاں سے کٹ چکا ہے اور اب یہ حسین اور خوبصورت نوجوان یونہی آپ لوگوں کے سینے پر مونگ دلتا رہے گا۔ ٹن ٹنن چلو امّی اٹھو دیر ہو رہی ہے بلکہ ہو چکی ہے۔ لہٰذا قبل اس کے کہ یہ دونوں حوا کی بیٹیاں آدم کے اس شریف بیٹے سے کوئی اور سوال کر کے اس کا قیمتی وقت اور اعلیٰ ڈنر خراب کر سکیں چلی چلو امّی جان''۔

اختر یہ کہتا ہوا دروازے کی طرف لپکا۔ ماں بیٹیاں بھی ہنستی ہوئی دروازے کی طرف بڑھ گئیں۔ رات اختر جب ڈنر سے واپس لوٹا تو راضعہ اختر کے بیٹے کو سلانے کی ناکام کوشش کر رہی

تھی۔ جو باپ کے آنے کے انتظار میں جاگ رہا تھا۔ ''آپ ابھی تک نہیں سوئیں امی!'' اختر نے راضعہ سے پوچھا۔ ''یہ تیرا بیٹا سوئے تو میں بھی سوؤں۔ دلہن کے پاس تو یہ رہتا ہی نہیں دلہن کو تنگ کر رہا تھا۔ میں اٹھا لائی''۔ ''لایئے مجھے دے دیں''۔ اختر نے کہا اختر بیٹے کو لے کر اپنے کمرے میں چلا گیا فہمی کے برابر لٹایا تو فہمی جاگ گئی۔ ارے آپ کب آئے؟ فہمی نے اختر سے پوچھا۔ ''ابھی آیا ہوں اور شریر امی کو تنگ کر رہا ہے اور تم سو رہی ہو''۔ اختر نے فہمی کی سرزنش کی۔ ''امی خود اسے اٹھا کر لے گئی تھیں میں نے منع بھی کیا لیکن وہ نہیں مانیں''۔

رات کا ایک بجا تھا سب سو چکے تھے مگر راضعہ کی آنکھوں سے نیند دور تھی۔ اس کا ذہن نازیہ کی سہیلی انجم کی ماں کی جانب چلا گیا۔ کیسے رہتی ہیں اتنے بڑے گھر میں اکیلی ڈر نہیں لگتا وہ سوچتی رہی سات بیٹے ہیں ان کے مگر پھر بھی تنہا۔

وہ اپنا موازنہ کرنے لگیں۔ نجم کے انتقال کو دس سال سے زیادہ ہو گئے تھے مگر آج تک اسے کسی نے تنہا رہنے دیا؟ نجم کا خیال آتے ہی ان کا ذہن ماضی میں بہت دور چلا گیا۔ جب فاکہہ پیدا ہوئی تھی اسے ایک ایک لمحہ ایک ایک واقعہ یاد آ رہا تھا۔ وہ لیبر روم کے متصل کمرے کی دیوار کی طرف منہ کئے سفید چادر اوڑھے لیٹی تھیں۔ جب اسے نرس نے بتایا تھا کہ بیٹی ہوئی ہے ان کے دماغ میں جھکڑ چل رہے تھے انہیں ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ وہ ساری دنیا میں اکیلی رہ گئی ہیں۔ ہر آدمی ان کو استہزائی نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ ان کے کانوں میں خیالی آوازیں گونج رہی تھیں۔ تُو تو کوئی مرد نہیں جن سکتی۔ تو منحوس ہے۔ تیرے سائے سے ہر عورت کو بچنا چاہیے اسی ہجوم میں اسے نجم نظر آیا وہ نہ صرف افسردہ تھا بلکہ اس کی آنکھوں میں نفرت کے شعلے دہک رہے تھے وہ ٹھہری آواز میں سرد مہری سے مخاطب تھا۔ راضی۔ تو مجھے ایک بیٹا نہیں دے سکی۔ تو منحوس ہے میں نے تجھے کتنا آرام دیا کتنا خیال رکھا کتنی محبت دی۔ تجھے اپنے دل کی۔ اپنے گھر کی رانی بنا دیا۔ مگر تو مجھے ایک بیٹا نہ دے سکی میں تجھے گھر میں رکھ کر کیا کروں۔ تیری میرے گھر میں موجودگی میری جگ ہنسائی کا باعث ہے۔ راضی! لوگ مجھ پر ہنس رہے ہیں کہ میری بیوی ایک بیٹے کو جنم دینے کی اہل نہیں راضی

میں تجھے اپنے ساتھ نہیں رکھ سکتا تو میرے لئے ...... ابھی اس کے کانوں میں یہ خیالی آوازیں گونج رہی تھیں کہ نجم کی آواز نے اسے چونکا دیا تھا۔

''مبارک ہو راضی'' نجم نے مسکراتے ہوئے کہا۔ رافعہ نے گردن نجم کی طرف موڑی اس کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ وہ نجم کو دیکھ کر سسک پڑی اور بھرائی ہوئی آواز میں دھیرے سے بولی۔ نجم...... مجھے معاف کردو...... پھر...... پھر...... اور رو پڑی۔ ارے...... ارے...... راضی...... پگلی...... یہ کیا...... یہ رونے کی بات ہے۔ نجم نے راضی کے بالوں میں دھیرے دھیرے انگلیوں سے مساج کرتے ہوئے کہا۔ دو ہیں!...... معافی کس بات کی...... اللہ کا شکر ہے راضی...... اس نے تم کو دوسری زندگی دی...... اور پھر ہمارے گھر تو...... خوش بختی آئی ہے...... اللہ کی رحمت آئی ہے۔ اور تم جاہلانہ بات کر رہی ہو...... پاگل نہیں تو کہیں کی...... چپ ہو چلو چپ ہو شاباش''...... نجم نے راضی کی پیشانی چوم لی...... راضی نے نجم کا ہاتھ مضبوطی سے تھام لیا...... نجم وہ گلوگیر آواز میں بولی...... ''نجم! لوگ کیا کہیں گے۔ میں تم کو ایک بیٹا بھی نہیں دے سکی...... یہ چوتھی بیٹی ہے...... نجم''۔ اچھا! نجم نے مصنوعی حیرت سے کہا...... یعنی یہ اولاد کی جنس کے تعین کرنے کا حق اللہ تعالیٰ نے بالآخر دے ہی دیا آپ خواتین کو...... احمق نہیں تو کہیں کی...... اس نے پیار سے رافعہ کو ڈانٹا۔

نجم دنیا والے تو یہ سب نہیں دیکھتے وہ تو مجھے ہی الزام دیں گے۔ تم تو پاگل ہوگئی ہو...... اب اگر تم نے کچھ کہا تو ناراض ہو جاؤں گا۔ نجم نے کہا...... اسی اثنا میں نرس نوزائیدہ کو نہلا کر اور کپڑے پہنا کر کمرے میں لے آئی۔ اور اسے رافعہ کے برابر میں لٹانے لگی۔ نجم نے دونوں ہاتھ پھیلاتے ہوئے کہا اس رحمت کو میری گود میں دو نا ادھر کہاں لٹا رہی ہو''۔

نرس نے بچی کو نجم کو دیتے ہوئے کہا ''سر یہ آپ کی چوتھی بیٹی ہے؟''۔

''ہاں۔ ماشاء اللہ''۔

''چلیں سر کوئی بات نہیں...... میری آنٹی کے سات بیٹیوں کے بعد اللہ نے بیٹا دیا

تھا...... اللہ بڑا کارساز ہے۔"

"سسٹر...... تم کہنا کیا چاہتی ہو...... کہیں تمہارا خیال یہ تو نہیں کہ مجھے بیٹی کی خوشی نہیں ہے...... ارے میں نے اس کا نام بھی طے کرلیا ہے...... فاکہہ کیسا نام ہے راضی...... !"

"سر! بیٹے کی خوشی سب لوگ مناتے ہیں...... بیٹی کی خوشی دل والے مناتے ہیں...... ہم تو مٹھائی بھی نہیں مانگتے ہیں بیٹی کی...... مبارکباد دیتے ہوئے بھی ڈرتے ہیں...... لوگ ناراض ہو جاتے ہیں۔"

"احمق اور ناشکرے ہوتے ہیں ایسے لوگ سسٹر...... یہ لیجئے مٹھائی کھایئے گا اور مبارکباد دیجئے مجھے اور راضی کو...... نجم نے پرس سے سو کا نوٹ نکال کر نرس کو دیتے ہوئے کہا۔ سسٹر شکریہ...... ہم پیسے نہیں لیتے ہیں...... آپ مٹھائی لائیں گے تو ہم بھی کھالیں گے سر دیکھئے کتنی خوبصورت آنکھیں ہیں آپ کی بیٹی کی...... نرس نے کہا۔ پھر بچی کو نجم کی گود سے لے کر راضعہ کے برابر میں لٹا کر چلی گئی۔

"نجم تم کو واقعی افسوس نہیں ہوا؟" راضعہ نے پوچھا۔

"تم کتنی احمق ہو راضعہ میرے ساتھ تمہیں رہتے ہوئے بارہ سال ہو گئے مگر تم ابھی تک مجھے نہیں سمجھ سکیں۔ سچ بتاؤ کیا ان بارہ سالوں میں میں نے تم سے کہا کہ ہمارا کوئی بیٹا نہیں ہے"۔

"نہیں، کہا تو نہیں مگر خواہش تو ہوگی...... راضعہ نے کہا

"ہوگی سے تمہاری کیا مراد ہے! ...... خواہش ہونا تو کوئی بری بات نہیں مگر سب خواہشیں تو پوری نہیں ہوتی ہیں نا۔ اور پھر آج کل لڑکے اور لڑکی میں کیا فرق باقی رہ گیا ہے۔ لڑکے کونسے لڈو پیڑے دے دیتے ہیں۔ راضی میں نے دکھ دیتے ہی دیکھا ہے لڑکوں کو، یہ جاہلانہ باتیں ہیں اس دور کی ہیں جب لوگ جاگیردار ہوا کرتے تھے لڑکے کی تمنا کرتے تھے کہ جاگیر اِدھر اُدھر نہ ہو جائے اور دھوکا دیتے تھے یہ کہہ کر کہ نام لڑکا چلاتا ہے...... ہم کون سے بادشاہ ہیں یا

جاگیردار ہیں کہ ہم کو فکر ہو کہ ہمارے بعد کون ہمارے نام کا سکہ چلائے گا۔ راضی! نام بیٹوں سے نہیں نیک کام کرنے سے چلتا ہے میں نے تو یہ دیکھا ہے کہ لوگوں کے دس دس بیٹے ہوتے ہیں مگر جنازے کو کندھا محلے والے دیتے ہیں۔ لڑکے لڑکی سے کوئی فرق پڑتا ہے اور آج کل تو خاص طور پر کوئی فرق نہیں پڑتا۔ بس ایک ہی دعا کرتا ہوں کہ اللہ تو اپنی مرضی سے جو دینا چاہتا ہے دے بس نیک۔ دیندار عزت والا اور طویل اور صحت مند زندگی والا دے"۔

"نجم بیٹا بڑھاپے کا سہارا تو ہوتا ہی ہے"۔

"کون جانے" نجم نے کہا "اور یوں تو بیٹیاں بھی......"۔

راضعہ نے بات کاٹ دی "بیٹیاں پرایا دھن ہوتی ہیں۔ پرائی امانت ہیں۔ ان پر ہمارا کیا زور"۔

"تو کیا بیٹے پر کوئی زور ہوتا ہے ماں باپ کا......؟"

کیوں نہیں؟

"ہاں جب تک وہ کسی قابل نہیں ہو جاتے اور پھر اس کے بعد......وہ سارا زور دھرا رہ جاتا ہے......نہیں راضی زور کی بات کبھی مت سوچنا......تم کسی سے بھی بزور محبت نہیں کرا سکتیں...... پھر بیٹے پر کیا زور بیٹے سے زیادہ محبت اور خیال تو بیٹیاں اور داماد کرتے ہیں راضی"۔

"تم ٹھیک کہا کرتے تھے نجم! راضعہ نے اپنی آنکھوں سے بہتے ہوئے آنسوؤں کو پونچھتے ہوئے دھیرے سے خود کلامی کی مجھے میری بیٹیوں نے ہی تمہارے بعد تنہا نہیں رہنے دیا نجم!

صبح راضعہ نے اختر سے کہا تم امریکہ کیوں نہیں جانا چاہتے؟

"امی آپ تنہا رہ جائیں گی" اختر نے کہا

"تنہا؟ نہیں بیٹا......تم جاؤ......جن کی بیٹیاں ہوں وہ عورتیں کبھی تنہا نہیں ہوتیں"۔

کیا واقعی امی؟ آپ خوشی سے اجازت دے رہی ہیں؟

اختر نے بے تابی سے کہا۔

راضعہ نے زبان سے کچھ نہ کہا......صرف مسکرا کر سر ہلا دیا۔

عثمانہ اختر جمال۔(امریکہ)

تصویر بتاں

جب سے شمسہ اس گھر میں شادی ہو کر آئی تھی، اس کے لوینگ روم کی سجاوٹ وہ دونوں پینٹنگس تھیں، جن سے اس کو سخت نفرت تھی۔ اُس کا بس چلتا تو وہ اس کو اٹھا کر پھینک دیتی یا پھر ان دونوں تصویروں کی جگہ وہ اسٹور ہوتا جہاں بابا آدم کے وقت کا سامان بھرا پڑا تھا۔ ان تصویروں کو کبھی بھی اس کی ساس پھینکنا گوارا نہیں کرتی تھیں۔ شمسہ سوچتی تھی کہ اگر کوئی کباڑی ان تصویروں اور سٹور کے بے کار سامان کو ن لے جاتا تو اس کی دو وقت کی روٹی کا انتظام ہو جاتا اور گھر بھی صاف ہو جاتا۔ مگر اس کی ساس کو جیسے ضد تھی کوڑا کرکٹ گھر میں سنبھال کر رکھنے کی۔ ان پینٹنگز سے تو ان کو ایسے محبت تھی کہ جیسے کسی اعلیٰ مصور کی ہوں۔ اور اس سے ان کی بہت سی یادیں وابستہ ہوں۔ مگر ان تصویروں سے یادوں کا تو سوال ہی نہیں اٹھتا تھا۔ وہ تو پرانا سامان بیچنے والی کسی دکان سے ایک ایک ڈالر میں خریدی گئی تھیں جس کو بار بار بتانے میں اس کی ساس فخر محسوس کرتی تھیں۔ ہر ملنے والے کو بتاتے وقت بھی وہ اتنا ہی فخر کرتی تھیں جب وہ دوسروں سے یہ ذکر کرتی تھیں تو اس کو بہت شرم آتی تھی اور اپنی ساس پر غصہ بھی بہت آتا تھا۔ اس نے کسی اور کے گھر میں اس قسم کی باتیں کبھی نہیں سنی تھیں۔ اُن کی چیزیں تو بہت مہنگی ہوتی تھیں اور دوسرے ملکوں سے خریدی ہوئی ہوتی تھیں۔ کوئی بھی پرانی چیزوں کی دکان سے کچھ بھی نہیں خریدتا تھا اگر خریدتا بھی تھا تو بتاتا نہیں تھا۔ ایک اس کی ساس تھیں جو پرانی چیزیں بیچنے والی دکان سے خریدی اپنی چیز پر دوسروں کے سامنے فخر کرتی تھیں۔ اس کو بہت عجیب بات لگتی تھی۔ دنیا کے ہر شہر میں ایسی پرانی چیزیں بیچنے والی بہت سی دکانیں ہوتی ہیں جہاں لوگ اپنے گھر کا غیر ضروری سامان ڈونیٹ کر دیتے ہیں اور کم آمدنی والے یا غریب لوگ بہت کم قیمت پر خرید کر اپنی ضرورتیں پوری کرتے ہیں۔ اس سے ان

کی غریبی کا عیب ڈھک جاتا ہے اور ان کے گھر میں اچھا سامان بھی دکھائی دیتا ہے۔ ان کے جسم پر اچھے کپڑے نظر آتے ہیں۔ اس طرح امیر غریب کا فرق مٹ جاتا ہے۔ اسی لئے اس نئی دنیا میں کوئی ننگا بھوکا نہیں دکھائی دیتا ہے۔ سب خوشحال دکھائی دیتے ہیں۔ وہ سب ملک بھی امیر اور خوشحال دکھائی دیتے ہیں جہاں جہاں یہ اسٹورز ہوتے ہیں۔ اب وہی اسٹورز خوبصورت شوروم میں بدلتے جا رہے ہیں۔ بہت مہنگے ہو گئے ہیں۔ لگتا ہے ایک ایسا بھی زمانہ آئے گا کہ وہاں سے بھی امیر ہی خرید وفروخت کر سکیں گے۔ غریب بیچاروں کی پہنچ وہاں تک بھی نہیں ہو پائے گی۔ ان اسٹورز کی بدولت کبھی کبھی غریب امیر بھی بن جاتے ہیں۔ ڈونیشن میں لوگ سونا چاندی، ہیرے جواہرات، قیمتی سامان، اور بیش قیمت اینٹیک چیزیں بھی غلطی سے یا جان بوجھ کر پھینک دیتے ہیں۔ شاید کسی ضرورت مند غریب بیچارے کے کام آ جائیں۔ ہر ایک تو ان کی ویلیو نہیں پہچان پاتا ہے۔ بس جس کی قسمت چمکنی ہوتی ہے وہی اس کی ویلیو یا وقعت سمجھ جاتا ہے اور مالا مال ہو جاتا ہے۔ یا پھر ان اسٹورز کو چلانے کے لئے یہ ایک افواہ بھی ہو سکتی ہے۔

اپنا گھر ہونے کے فخر سے شمسہ کی ساس اس کو بہت پریشان کرتی تھیں۔ شمسہ کے میاں اپنے ماں باپ کے اکلوتے بیٹے تھے۔ اس لئے الگ گھر کا وہ تصور بھی نہیں کر سکتی تھی۔ وہ بھی کوئی مثالی لڑکی نہیں تھی ایک عام سی لڑکی تھی۔ جس کے کچھ خواب تھے۔ ایک ایسے گھر کا خواب جو اس کا ہو، وہ جیسا چاہے اس کو رکھے، جیسا چاہے اس کو سجائے۔ مگر اس گھر پر تو اس کی ساس حاوی تھیں۔ وہ اس کا کیسے ہو سکتا تھا؟ اس گھر کو سجانے والی بھی ساس ہی تھیں۔ وہ تو بس اس کو دور سے دیکھ سکتی تھی۔ اپنے وقت کی، اپنی ضرورت کی، یا اپنی پسند کی کوئی تبدیلی نہیں کر سکتی تھی۔ اگر ایسا کرتی یا کرنے کی کوشش کرتی تو گھر کا ماحول خراب ہو جاتا تھا۔ دونوں ساس بہو میں جھڑپیں چلتی رہتی تھیں۔ اس نے بھی روایتی بہوؤں کی طرح کئی بار ان سے الگ اپنا گھر لے کر رہنے کی کوشش کی۔ مگر اس کے میاں نے ساتھ نہیں دیا۔ ایک نیک شریف اور ایماندار بیٹے کی طرح صاف جواب دے دیا "مجھے اپنے ماں باپ سے بہت محبت ہے۔ میں اپنے بوڑھے ماں باپ کو اکیلا نہیں چھوڑ

سکتا''۔ سسر شریف آدمی تھے۔ انہوں فیصلہ کر دیا'' اسی گھر میں اپنے لئے الگ حصہ بنوالو اور جیسا چاہو اپنا گھر رکھو''۔ اس نے ایسا ہی کیا پرانی چیزوں سے اس کو سخت نفرت تھی اور وہ کبھی پرانی چیزیں خریدنا بھی پسند نہیں کرتی تھی۔ سستی مہنگی نئی نئی چیزیں خرید کر اس نے اپنا پورشن سجانا شروع کر دیا۔ اس کو اپنی ساس کے ڈرائنگ روم اور اس کی سجاوٹ سے اب بھی بہت چڑ اور نفرت تھی۔ خاص کر ان پینٹنگس سے جو اس کی ساس کی پسندیدہ تھیں۔ اس کی ساس کے ملنے والے آتے بلاوجہ کے لئے ان کے لوینگ روم اور خاص کر ان پینٹنگس کی بہت تعریف کرتے تھے۔ ان کے اعلیٰ ذوق کی داد دیتے تھے۔ اس کا بس چلتا تو وہ تصویریں اتار کر ان کے حوالے کر دیتی اور کہتی ''یہ اعلیٰ ذوق آپ اپنے ساتھ لے جایئے''۔ اس کے ساس اور سسر اپنی پچاسویں شادی کی سالگرہ منا چکے تھے اور ایک ایک ڈالر کی خریدی پچاس سال سے ان کے گھر میں ٹنگی وہ پرانی پینٹنگس اب بھی سب کی تعریف وصول کر رہی تھیں۔ اس کی شادی کو بھی بیس سال سے زیادہ ہو چکے تھے۔ ایک دن اس کی ساس اس دنیا سے چلی گئیں۔ پورا گھر اس کا ہو گیا۔ اس نے لوینگ روم میں تبدیلیاں کرنی شروع کر دیں جو کہ اس کا پچیس سال پرانا خواب تھا۔ ان پینٹنگس کو اس نے گھر سے باہر تو نہیں پھینکا لیکن وہاں سے نکال کر اسٹور میں ڈال دیا یہ سوچ کر کہ موقع ملتے ہی گھر سے باہر کر دے گی۔ اس کی بہو بھی آ چکی تھی۔ اس کی بہو نے بھی ٹھیک شمسہ کی طرح گھر میں تبدیلیاں کرنی شروع کر دیں تھیں جیسا کہ اپنے وقت میں وہ کرتی تھی۔ وہ اپنی بہو کی حرکتوں کو برداشت کر رہی تھی کیونکہ ان تبدیلیوں میں اس کا بیٹا بھی اپنی بیوی کا ساتھ دیتا تھا۔ وہ خاموشی سے دیکھتی تھی اپنی ساس کی طرح منع نہیں کرتی تھی اور نہ ان کی طرح ڈانٹتی اور لڑتی تھی۔ کیونکہ اس کا بیٹا اپنے باپ کی طرح آئیڈیل نہیں تھا۔ اگر وہ کوئی بھی مخالفت کرتی تو وہ اپنی بیوی کے کہنے سے فوراً الگ ہو جاتا۔ وہ ان کو الگ نہیں کرنا چاہتی تھی کیونکہ اس کے ساتھ بھی وہی پرانا مسئلہ تھا۔ اس کے اور اپنے میاں کے اکیلے رہنے کا مسئلہ۔ اسی لئے وہ خاموش رہنا بہتر سمجھتی تھی۔ ان دونوں کو بھی اس کی ساس کی طرح گھر میں پرانی اور اینٹیک چیزیں رکھنے اور سجانے کا شوق پیدا ہو گیا تھا۔ ایک دن اس نے اور اس

کے بہو بیٹے نے سوچا کہ پرانے سامان سے بھرے اسٹور کی صفائی کردی جائے، اس صفائی کا خواب تو وہ برسوں سے دیکھ رہی تھی۔ فوراً تیار ہوگئی۔ ان تینوں نے بہت سا سامان ڈونیٹ کرنے کے لئے الگ رکھ دیا۔ اسی سامان میں اس کی ساس کی ایک ایک ڈالر میں خریدی وہ دونوں پینٹنگس بھی تھیں۔ ایک دم سے اس کی بہو کی نظر ان پر پڑگئی۔ اس نے ان کو الٹ پلٹ کر دیکھا تو حیران رہ گئی۔ وہ تو بہت پرانی پینٹنگز تھیں۔ پچاس پچپن سال سے تو ان کے گھر میں ہی موجود تھیں۔ اس حساب سے ان کی عمر سو سال سے اوپر تھی۔ ان کا خالق بڑا اور مشہور آرٹسٹ تھا جس کی پینٹنگز اب بھی لاکھوں میں بک رہی تھیں۔ وہ پینٹنگس بھی اوریجنل یا اصلی تھیں۔ جن پر اس کو بنانے والے مصور کے دستخط بھی تھے۔ اس نے جلدی سے ان پینٹنگس کو الگ رکھ دیا۔ شمسہ کچھ سمجھ نہیں پائی اور ڈر گئی کہ کہیں پھر وہ تصویریں اس کے لوینگ روم کی زینت تو نہیں بننے والی ہیں۔ اس کو یہی آثار نظر آرہے تھے۔ اس نے جلدی سے اپنی بہو سے کہا "ان تصویروں کو الگ کہاں رکھ رہی ہو؟ پھینکنے کے سامان میں رکھ دو"۔ اس کی بہو نے حیرت سے اس کی بات سنی مگر کچھ بولی نہیں۔ یہ انٹرنیٹ کا زمانہ تھا۔ اس نے ان تصویروں کی تحقیقات شروع کردیں۔ ان پر خوب ریسرچ کی۔ بڑے بڑے اسپیشلسٹ کو دکھایا۔ سب نے اس کی ویلیو لاکھوں ڈالر کی بتائی۔ اس نے ان کی ویلیو کا سرٹیفکٹ لے لیا اور انٹرنیٹ پر ان کا نیلام شروع کردیا۔ پچاس ہزار ڈالرز سے نیلام کی شروعات ہوئی۔ لاکھوں ڈالرز میں وہ دونوں پینٹنگس بک گئیں۔ ان تصویروں کی بدولت پوری فیملی کی بہت شہرت ہوئی۔ وہ لوگ اخباروں اور ٹی وی کی خاص خبر بن گئے۔ ہر زبان پر یہی خبر تھی "ایک ایک ڈالر میں ایک پرانی چیزوں کے اسٹور سے خریدی گئی پینٹنگز لاکھوں ڈالرز میں فروخت ہوئیں"۔ پورا خاندان خوشیاں منا رہا تھا۔ اس کے سسر اپنی مری ہوئی بیوی پر فخر کر رہے تھے۔ اتنی خوشی کے موقع پر شمسہ کو بھی اپنی ساس بہت یاد آئیں اور اس کا دل ان کی عظمت اور عقیدت سے بھر گیا۔ کیونکہ بعد مرنے کے ان کے گھر سے ایسی تصویر بتاں نکلیں جو ان کے اہل خانہ کو عزت، شہرت اور دولت سے مالا مال کر گئیں۔

فرزانہ اعجاز۔لکھنؤ (انڈیا)

آج کا شرون کمار

کہتے ہیں کہ شری رام چندر جی کے زمانے میں 'شرون کمار' نامی ایک غریب لڑکا تھا۔ ایسا سعادت منداور والدین سے بے انتہا محبت کرنے والا کہ آج بھی اس کی مثالیں دی جاتی ہیں۔ جو اپنے ضعیف اور نابینا والدین کوایک بڑی سی ترازو کے دونوں پلڑوں میں بٹھا کراور ترازو کو اپنے کاندھوں پر ٹانگ کر اپنے مذہبی مقامات مقدسہ کی تیرتھ یاترا کراتا تھا۔ جگہ جگہ گھماتا تھااور جب وہ پیاسے ماں باپ کے لئے کسی دریا کے کنارے اپنے چھاگل میں پانی بھر رہا تھا تو غلط فہمی کی بنا پر تیر ' سے زخمی ہو کر ختم ہو گیا تھا۔ وہ تو ختم ہو گیا لیکن اس کی سعادت مندی اور والدین سے محبت اور عقیدت کی باتیں 'امر' ہو گئیں اور زمانوں سے سفر کرتی ہوئی آج بھی بیان کی جاتی ہیں۔ 'اچھے بچوں' کی یہی پہچان بتائی جاتی ہے کہ وہ 'شرون کمار' بنیں۔ اپنے والدین کا خیال رکھیں۔ تمام مذہبی کتابوں میں بھی بار بار والدین کے ساتھ حسن سلوک کی ہدایت کی جاتی رہی ہے۔ خود رام چندر جی اپنے والد کا 'وعدہ' نبھانے کو تخت شاہی چھوڑ کر بن باس سدھارے تھے اور سعادت مندی کی بے نظیر مثال قائم کر دی تھی۔

سیکڑوں سال پہلے ایسا ہی سعادت مند بچہ 'عبدالقادر جیلانی' نام کا بھی تھا۔ جس نے اپنی والدہ کی نصیحت کو حکم جانا اور کبھی جھوٹ نہیں بولا اور ڈاکوؤں کو بتا دیا کہ اس کے پاس کچھ دینار ہیں جو اس کی والدہ نے اس کی صدری میں چھپا کر سی دیئے ہیں۔ ڈاکوؤں کے استفسار پر اس نے سچ بولا، کیونکہ اس کی والدہ کی ہدایت تھی کہ کبھی جھوٹ نہ بولنا۔ ننھے بچے کی اس ایک بات کا ڈاکوؤں کے گروہ پر معجزاتی اثر ہوا اور وہ سب توبہ کر کے نیک لوگ بن گئے۔

پچھلے سال ایک خبر اخباروں، ٹی وی اور میڈیا پر چھائی رہی۔ بار بار دکھائی اور سنائی جاتی رہی کہ 'ہندوستان کا ایک مشہور اداکار، اپنی بے پناہ مصروفیات میں سے وقت نکال کر اپنی

'ضعیف والدہ' کو خود حج کرانے ساتھ لے کر گیا۔ حج جو ایک مذہبی فریضہ ہے اور ہر مسلمان جو
صاحب استطاعت ہو اور اپنی گھریلو ذمہ داریاں پوری کر چکا ہو اُس پر اللہ کی طرف سے فرض
ہے۔ اسلام کے پانچ فرائض میں حج شامل ہے جو کہ حضرت ابرہیم علیہ السلام اور ان کی بی بی ہاجرہ
کی سنت ہے۔ ضعیف العمری میں حج کے ارکان ادا کرنا بہت مشکل ہوتا ہے۔ ایک مخصوص وقت
میں خانہ کعبہ کے چاروں طرف لاکھوں کا مجمع 'طواف' کر رہا ہوتا ہے۔ پھر مقامی زبان سے
ناواقفیت، ساتھ ہی پہاڑوں پر بار بار چڑھنا اترنا اور کھلے میدان میں خیموں میں قیام کرنا اور
عبادات کرنا اور وقت مقررہ پر تمام ارکان ادا کرنا، اگر وہ وقت نکل گیا تو سوائے افسوس کے کچھ
ہاتھ نہیں آتا ہے، سال کے تین سو پینسٹھ دنوں میں حج ایک بار ہوتا ہے۔ اکثر ضعیف یا بیمار لوگ
مقامی لوگوں کی مدد لیتے ہیں۔ جو چھوٹی سی پالکی کاندھوں پر اٹھائے جگہ جگہ موجود ہوتے ہیں۔ عامر
خان بھی ایسا ہی کوئی طریقہ اپنا سکتے تھے۔ لیکن تصویروں میں دکھایا گیا کہ ان کی والدہ حج کا مخصوص
لباس 'احرام' پہنے وہیل چیئر پر بیٹھی ہیں اور خود عامر خان بھی احرام پہنے اپنی والدہ کی وہیل چیئر چلا
رہے ہیں۔ حج کا احرام پہننے والے پر بہت سی پابندیاں ہوتی ہیں جن میں ذرا سی بھی کوتاہی ہونے
پر ایک جانور کی قربانی مزید ادا کرنا پڑتی ہے جو بہت مہنگی پڑ جاتی ہے۔ کیونکہ حاجی لوگ ایک مخصوص
رقم ہی اپنے ساتھ لے جا سکتے ہیں۔

عامر خان کے پاس پیسے کی کوئی کمی نہیں تھی۔ وہ چاہتے تو اپنی والدہ کے لئے درجن بھر
لوگ اس محنت طلب کام کرنے کے لئے اجرت دے کر رکھ سکتے تھے۔ لیکن یہ ان کی نیکی اور اپنی
والدہ سے محبت کہ انہوں نے خود اپنی والدہ کو تمام ارکان ادا کروائے۔ جو خوش قیمت لوگ حج
کر چکے ہیں وہ ان تمام دشواریوں اور محنت کا اندازہ کر سکتے ہیں۔ جو اجنبی ملک، اجنبی لوگ اور اجنبی
زبان میں لاکھوں کے مجمع میں درپیش ہوا کرتی ہیں۔ خصوصیت سے ان لوگوں کو جو عمر بھر
ایئر کنڈیشنڈ گھروں میں آرام سے رہے ہوں۔ موٹروں میں گھومے ہوں اور درجنوں خدمت
گاروں کی مدد سے زندگی آرام سے گزار رہے ہوں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ عامر خان اور ان کی

والدہ کو اللہ تعالیٰ نے وہ تمام نعمتیں عطا کی ہیں جن کی ہر انسان خواہش کرتا ہے۔ خود عامر خان کہ جن کی ایک جھلک دیکھنے کو لاکھوں کا مجمع رہتا اور لوگ ہزاروں کا ٹکٹ خرید کر ایسے پروگراموں میں جاتے کہ جہاں عامر خان کی ایک جھلک ہی نظر آجائے۔ بہترین لباس، بہترین خوشبوؤں سے معطر انڈین سینما کے جگمگاتے ستارے عامر خان، حج کے مخصوص لباس یعنی ایک سوتی سفید تہہ بند اور ایک سوتی سفید چادر جس سے ایک کاندھا ڈھکا اور دوسرا کھلا ہوا جسم پر ایک بھی سلا ہوا کپڑا نہیں۔ ذرا بھی خوشبو نہیں، ننگے سر، دھوپ میں بغیر میک اپ کے لاکھوں کے مجمع میں بغیر محافظوں کی فوج کے حج کے تمام ارکان عام مسلمانوں کی طرح ادا کرتے ہوئے اللہ کے حضور اپنی والدہ کے ساتھ ایک نعرہ مستانہ کہ 'اے رب تیرا غلام تیرے سامنے حاضر ہے' لگاتے ہوئے ننگے سر اور ننگے پیر، دیوانہ وار بیت اللہ، اللہ کے حضور اپنی والدہ کے ساتھ چکر پہ چکر لگاتے ہوئے، ایک پہاڑی سے دوسری پہاڑی پر اپنی والدہ کی وہیل چیئر چلاتے ہوئے ماں کی دعاؤں کے ساتھ ساتھ اللہ کی نوازشوں اور عنایتوں سے اپنے دامن کو بھرتے چلے جارہے تھے۔

ہر ماں سمجھ سکتی ہے کہ عامر خان کی والدہ اپنے بیٹے کو کیا کیا دعائیں دے رہی ہوں گی۔ ایسی دعائیں جو ایک ماں کے دل سے نکل کر سیدھی عرش اعظم پر اللہ کی بارگاہ میں مقبول ہو رہی ہوں گی۔

کہتے ہیں کہ ایک بار حضرت موسیٰ علیہ السلام بہت پریشان تھے اور بار بار اللہ سے اپنی پریشانی کا شکوہ کر رہے تھے کہ ایک بار اللہ تعالیٰ نے فرمایا 'اے موسیٰ! کیا تیری ماں نہیں ہے جو تیرے حق میں مجھ سے دعا کرے، اور اس طرح سے اللہ تعالیٰ نے ماں کی عظمت کا ذکر کر دیا۔ اور بتا دیا کہ اولاد کے حق میں ماں کی دعا اللہ کے دربار میں ضرور قبول ہوتی ہے۔

میڈیا نے تو ایک ننھی سی خبر سنا کر چھوڑ دی، لیکن عامر خان اپنی امی کو حج کرا کر دعاؤں اور رحمت خداوندی کے جو خزانے اپنے دامن میں بھر بھر کر عامر سے امیر ہو گئے۔ اس کا اندازہ نہ میڈیا والے لگا سکتے ہیں نہ کوئی عام انسان۔ کاش تمام کی تمام اولاد عامر خان جیسی خوش قسمت ہو کہ

'ماں' کی دعائیں اس کے لئے ہمیشہ ڈھال کا کام کریں اور ہر ناگہانی پریشانی سے اسے بچاتی رہیں جیسے ننھا سا بچہ خوف زدہ ہو کر ماں کی گود میں چھپ جاتا ہے اور سمجھتا ہے کہ وہ دنیا کے ہر دکھ اور خوف سے خود کو بچا لایا ہے، ویسے ہی ماں کا آنچل سعادت مند اولاد کے لئے فولاد کا حصار بن سکتا ہے۔

عامر خان امیر ہیں، اپنی والدہ کو ہر راحت فراہم کر سکتے ہیں لیکن ایک ایسا غریب عامر خان، بھی ہے جس نے تمام عمر سخت محنت اور عسرت میں بسر کی۔ محض اپنی محنت اور لگن سے اپنی پڑھائی جاری رکھی۔ قرآن شریف حفظ کیا اور کتابت کا فن سیکھا۔ علوم مشرقیہ میں سند لی۔ کتابت کے مشکل فن میں مہارت حاصل کی اور اب کمپیوٹر کے دور میں اس کا بھی علم حاصل کیا۔ اپنے ایک دوست کے کمپیوٹر پر کام سیکھا کیونکہ اتنی استطاعت نہیں تھی کہ ہزاروں روپے کا کمپیوٹر خود خرید سکتا۔ شہر میں دوسرے کے گھر میں رہ کر کتابت کرتا اور رمضان میں قرآن شریف زبانی سناتا اور اپنے حق میں بہتری کی اللہ سے دعا کرتا رہا۔ زندگی میں سوائے محنت اور غربت کے اس نے کچھ دیکھا ہی نہیں۔ سال پر سال بیتتے رہے، اب وہ کسی گاؤں میں مدرسے کا معلم ہے اور تھوڑی سی آمدنی میں اماں اور بیوی بچوں کے ساتھ گزر کر رہا ہے۔ ساتھ ہی کمپیوٹر پر کتابت کا کام بھی جاری ہے۔ گاؤں میں بجلی کی آنکھ مچولی عام بات ہے سو کتاب بھی متاثر ہوتی ہے اور آمدنی بھی۔ پھر بھی ہر لمحہ اللہ کا شکر ادا کرتا جاتا ہے۔ اس کے دل میں برسوں سے ایک خواہش تھی کہ اپنی ماں کو حج یا عمرہ کرا دے۔ خدا معلوم وہ کب سے اپنی حلال کی کمائی ایک ایک پیسہ جمع کرتا جا رہا تھا۔ پیسہ تو جمع ہوتا جا رہا تھا ساتھ ہی اماں کی عمر بھی بڑھتی جا رہی تھی۔ اور اب تو وہ چھیاسی سال کی ہو گئی تھیں اور نوے ڈگری تک ان کی کمر بھی جھک گئی تھی۔ اپنی اماں کا لاڈلا سعادت مند بیٹا اماں کے لاڈ پیار کرتا، اپنے ہاتھ سے انہیں کھانا کھلاتا۔ نہ کھاتیں تو انہیں لالچ دیتا کہ اماں کھانا کھا لو، طاقت ور ہو جاؤ تو تمہیں عمرہ کرانے لے جاؤں۔ اماں کو ہر ممکن آرام پہنچانے میں لگا رہتا اور اب تو اماں اونچا بھی سننے لگی تھیں۔ اس لئے ان سے خوب چیخ چیخ کر بات کرنا پڑتی تھی۔

اماں کی ضعیفی کی وجہ سے ان کا حج کرنا تو ممکن ہی نہیں رہا تھا، ہاں عمرہ کر سکتی تھیں۔ کیونکہ عمرے میں اتنی بھیڑ نہیں ہوتی اور ارکان بھی کم ہوتے ہیں۔ عمرہ سال میں کبھی بھی کیا جا سکتا ہے۔

عمرے کا ویزہ ملنا شروع ہوا تو اس نے اپنی جمع پونجی کا حساب کتاب کیا اور خوب چیخ چیخ کر اماں سے کہا 'اماں، عمرہ کرنے چلوگی؟' ۔آدھے بدن سے مفلوج اماں نے بڑی مشکل سے اس کی بات سنی اور سمجھی۔ اپنی معذوری پر اماں کی آنکھوں سے بھل بھل آنسو بہنے لگے، اور بولیں: 'کیوں مذاق کرتا ہے؟ باؤلا ہوا ہے۔ بستر سے اٹھ سکتی نہیں اور تو ہزاروں کوس دور لے جانے کی بات کرتا ہے۔ کاہے کو بڑھیا اماں کا دل دکھاتا ہے۔ عجب بات تھی۔ ویسے تو اماں کو اب نظر بھی کم کم آتا تھا اور بات یاد نہیں رہتی تھی لیکن روز تلاوت قرآن پاک ایسے کرتی تھیں جیسے اچھی بھلی آنکھوں والے کرتے ہیں اور مسنون دعائیں تو خوب فرفر یاد تھیں۔ اشاروں اشاروں میں لیٹے لیٹے نماز پڑھ لیتی تھیں۔ اگر کوئی ٹوکتا تو معصومیت سے کہتیں: 'باؤلے ہو تم لوگ، اذان تک نہیں سن سکتے'۔ دراصل اذان تو وقت سے ہی ہوتی تھی۔ البتہ بڑھاپے میں اماں کے کان بجنے لگے تھے اور بار بار انہیں اذان سنائی دیتی تھی۔ بیٹے نے کہا: اماں، کاہے کو فکر کرتی ہو؟ ہم اور تم چلیں گے۔ اور پھر وہ سفر کے انتظامات میں لگ گیا۔ ہزاروں میل دور ایک اجنبی ملک میں جانا آسان کام نہیں ہے۔ پہلے اپنی جیب اور صحت دیکھنی پڑتی ہے۔ پھر ویزے کی دوڑ بھاگ اور مختلف انتظامات کے ساتھ ساتھ ہوائی جہاز کی مختلف کمپنیوں کی زیارت، جو ایک عام سیدھے سادے انسان کو چکرا کر رکھ دیتی ہے۔ پھر ایک دن اپنی اماں کو اپنی پیٹھ پر لاد کر وہ اپنے دور دراز گاؤں سے بڑے شہر کے ہوائی اڈے پہنچ گیا۔ اور قریب قریب پیٹھ پر لادے لادے جہاز میں چڑھا اور جدے کے شہر میں اتر گیا۔ اماں اب بھی اس کی پیٹھ پر سوار تھیں، وہ مجبور تھا، اتنے پیسے ہی نہیں تھے کہ وہ وہیل چیئر خرید سکتا اور ساتھ ہی اس کا یہ جذبہ کہ ہماری پیٹھ کاہے کو ہے؟ آہ، ماں کی محبت کا دیوانہ وہ دبلا پتلا انسان جو خود اپنا بوجھ اٹھا نہیں سکتا تھا، اماں کا بھاری بوجھ اٹھانے کی ہمت رکھتا تھا۔

چھیاسی سال کی معذور اماں جب اللہ کے دربار میں حاضر ہوئیں تب بھی بیٹے کی پیٹھ پر سوار تھیں۔اور دل سے سعادت مند بیٹے کے لئے کیا کیا دعائیں نکل رہی تھیں یہ تو اماں کو خود بھی نہیں یاد ہوگا کہ وہ جگہ ایسی ہی ہے جہاں انسان اپنی سُدھ بُدھ بھول جاتا ہے، جلال و جمال خداوندی ہر ہر لحہ اس کو اپنے نورانی حصار میں لئے رہتا ہے، بس اپنی خطاؤوں کی گٹھری بغل میں دبائے اللہ کے دربار میں نادم نادم سا سر جھکائے کھڑے رہنے ہی میں اپنی عافیت سمجھتا ہے، آج وہ خوب سمجھ رہا ہوتا ہے کہ دنیا میں آنے سے اب تک کی اس کی ویڈیو فلم اللہ میاں کے سامنے چل رہی ہوگی اور اب وہ فیصلہ سننے کا حوصلہ بھی نہیں رکھتا ہوگا۔اور خود کو دنیا کا سب سے بڑا خطاکار تصور کرتا ہے۔انسان، جب اپنے اندرون سفر کرتا ہے تو اسے سچ کے سوا کچھ بھی نظر نہیں آتا اور زندگی کی سب سے بڑی حقیقت یہی سچ ہے۔

اماں کو سعی اور طواف کعبہ ارکان عمرہ ادا کرا کے اس نے انہیں ایک نمایاں اور مخصوص جگہ بٹھا دیا اس ہدایت کے ساتھ کہ اماں دیکھو، یہاں سے ہٹنا نہیں۔اب وہ خود اپنی ذات کے لئے ارکان عمرہ ادا کرنے اور آب زمزم کے متبرک پانی سے خود کو بھگونے اور اپنے اور اماں کے 'کفن' کو آب زمزم سے تر کرنے کے لئے چلا گیا، یہ بھی عقیدہ ہے کہ آب زمزم سے بھیگے کفن میں لپٹی لاش پر منکر نکیر سوال جواب میں سختی نہیں کرتے۔سکرات کے عالم میں بھی لوگ مریض کے منہ میں آب زمزم ٹپکاتے ہیں۔

پھر وہی ہوا جس کا ڈر تھا۔وہ واپس آیا تو اماں وہاں نہیں تھیں جہاں وہ انہیں بٹھا کر گیا تھا۔وہ بیچارہ حواس باختہ ہو کر ہزاروں کے ہجوم میں اماں کو ڈھونڈھ رہا تھا، وہاں محشر کا سماں تھا۔کسی کو کسی کی خبر نہیں تھی۔ہر شخص اپنا اعمال نامہ اپنے دل میں چھپائے حاضر تھا اور دیوانہ وار دوڑ دوڑ کر طواف کعبہ کر رہا تھا کہ خدا اسے معاف کردے۔کسی کو کسی کی خبر نہیں تھی۔ایک وہ بیچارہ اپنے گناہ وثواب کا حساب کتاب بھول کر اپنی ضعیف اور مجبور اماں کو ڈھونڈھ رہا تھا۔بار بار نم آس کے ساتھ خانہ کعبہ کو دیکھتا اور کسی مسنون دعا کے بجائے اس کے لبوں پر ماں کی سلامتی کی دعائیں مچل رہی تھیں۔وہ حدود حرم سے باہر بھاگا۔آس پاس کا چپہ چپہ دیکھ ڈالا، ہر اجنبی سے ٹوٹی پھوٹی مقامی

زبان اور اشاروں کی عالمی زبان سے اماں کے بارے میں استفسار کیا لیکن اماں کا کچھ سراغ نہ ملا۔

اب اس نے گھبرا کر یہاں کام کرنے والے اپنے ملک کے ایک جاننے والے کو فون کیا اور مدد کی درخواست کی۔ وہ خود اس ملک کے اس شہر میں اجنبی تھا، یہاں کی زبان، قوانین اور لوگوں سے ناواقف تھا۔ اس کا شناسا آ گیا تو دونوں آس پاس کے پولیس اسٹیشن اور اسپتالوں کے بھی چکر لگا آئے۔ لیکن اب بھی خالی ہاتھ ہی تھے۔ دن رات میں ڈھل گیا اور پھر نئی صبح کی سفیدی، نئی رات کی سیاہی میں چھپ گئی۔ وہ بھوکا پیاسا کبھی حدودِ حرم میں آ بیٹھتا اور کبھی باہر بھاگتا۔ ہر لمحے اس کے کپکپاتے ہونٹوں پر یہی ایک دعا تھی کہ یا اللہ! میری اماں سے مجھے ملا دے۔ اس کی پریشانی اس حد تک تھی کہ وہ اسپتالوں کے مردہ خانے تک جھانک آیا۔ حرم شریف میں نمازِ جنازہ کے لئے آنے والے ہر جنازے پر اس کا دل دھڑک اٹھتا۔ اب اسے نہ احرام اتارنے کا ہوش نہ کچھ کھانے پینے کا، بس ایک ہی جملہ اسے یاد رہ گیا تھا۔ یا اللہ، میری اماں کو مجھ سے ملا دے۔

تین دن ہو گئے، وہ دیوانہ وار چکراتا پھر رہا تھا کہ دور سے اسے بہت ضعیف عورت، حرم شریف کے آنگن میں ننھے بچوں کی طرح گھٹنوں گھٹنوں رینگتی نظر آئی۔ وہ بے تحاشا دوڑا اور بوڑھی عورت کے وجود کو اپنی باہوں میں چھپا کر پھپھک پھپھک کر رونے لگا، وہ حیران بوڑھی عورت اتنی حواس باختہ تھی کہ اپنے پیارے بیٹے کو بھی نہیں پہچان پا رہی تھی۔ جب دونوں کے حواس بجا ہوئے تو اماں نے ٹوٹے پھوٹے جملوں میں بتایا کہ وہ پانی پینے گئی تھی اور واپس آتے راستہ بھٹک کر دوسری طرف نکل گئی۔ بس تین تک وہ حرم شریف کے اندر باہر آتی جاتی رہی، اگر کوئی کچھ دے دیتا تو کھا لیتی ورنہ بھوکی پڑی رہتی کبھی کہیں کبھی کہیں۔

اماں کے ملتے ہی وہ بے اختیار سجدے میں گر پڑا اور سجدۂ شکر بجا لایا جیسے اس کا قیمتی خزانہ اسے دوبارہ حاصل ہو گیا ہو۔ اماں کو صحیح سلامت گھر لا کر اس نے پھر سجدۂ شکر ادا کیا۔ اماں کے نازک سے وجود کو بستر پر لٹا کر 'آج کا غریب عامر خان' یا 'پرانا شرون کمار' پھر سرخ رُو ہو گیا۔ اب اسے کون بتائے کہ اس نے محض ایک عمرے کا نہیں، کئی حجِ اکبر کا ثواب کمایا ہے۔

ادارہ

سال ۲۰۱۵ء کے دوران 'الاقرباء' میں شائع ہونے والی بہترین نظم پر ''اعزازِ فضیلت'' ایوارڈ

سہ ماہی 'الاقرباء' کی مجلسِ استناد نے اپنے ایک فیصلے کے مطابق شمارہ جولائی۔ستمبر ۲۰۱۵ء میں شائع شدہ نظم بعنوان ''سراپا'' کو سال ۲۰۱۵ء کی متفقہ طور پر بہترین نظم قرار دیا ہے اور نظم کے خالق بین الاقوامی سطح کے معروف شاعر، ادیب، محقق اور معلم جناب محمد اویس جعفری کو اعزازِ فضیلت ایوارڈ اور سندِ اعتراف (Certificate of Excellence) کا مستحق ٹھہرایا ہے۔ مجلسِ استناد نے اپنے اجلاس میں جو زیرِ نظر شمارے (اکتوبر۔دسمبر ۲۰۱۵ء) کا مسودہ پریس بھیجے جانے سے قبل منعقد ہوا رواں شمارے میں شریک اشاعت تمام نظموں کا بھی جائزہ لیا اور محاسنِ سخن پر جامع اور مدلل گفتگو کے بعد مذکورہ بالا فیصلہ کیا۔

واضح رہے کہ نصف صدی سے بھی متجاوز مدت قبل مسلم یونیورسٹی علی گڑھ (انڈیا) کے عہد طالب علمی میں جناب جعفری کے شعری وادبی فکر و فن کا آغاز ہوا۔ انڈیا میں اور آزادی کے بعد پاکستان کے دورانِ قیام وہ ادبی حلقوں میں متعارف ہو چکے تھے لیکن بسلسلۂ ملازمت امریکہ منتقل ہونے کے بعد اُن کی بدیہہ گوئی اور قادرالکلامی کے سبب اُنھیں علمی، ادبی اور شعری حلقوں میں تیزی سے پذیرائی ملی۔ بالخصوص امریکہ میں منعقدہ بین الاقوامی مشاعروں میں اُن کی بدیہہ گوئی اور منظوم اندازِ نظامت نے اویس جعفری صاحب کی ہر دل عزیزی اور احترام کو چار چاند لگا دیئے۔

مجلسِ استناد کے اراکین نے نظم کے موضوع کو یعنی 'ایک بھائی کا بہن کو خراجِ عقیدت' شاعر کی 'تخلیقی انفرادیت' کا شاہکار قرار دیا اور شعری لفظیات کے تفصیلی جائزے اور زبان و بیان کے ساتھ اُسلوب کی دلپذیری پر شاعر کی پاکیزہ فکر کو خراجِ تحسین پیش کیا۔ مجلسِ استناد نے 'سراپا' کی لسانی و معنوی عکاسی کے ساتھ ساتھ باریک نگہی اور فکر و فن کی نادرہ کاری پر شاعر کی خلاقانہ گرفت کو بھی سراہا۔ ادارہ 'الاقرباء' جناب محمد اویس جعفری کو اس منفرد اعزاز پر تہنیت اور اُن کی رجحان ساز صلاحیتوں کو سلام پیش کرتا ہے۔

By Prof. Dr. Nasim A. Hines (America)

Impressions on Professor Dr. Owais Jafrey's Tribute to His Praise-Worthy and Most Deserving Older Sister

A myriad of thoughts and sentiments enfolded me as I sat speechless after reading Professor Dr. Jafrey's *nazm*. The half colosed journal was still in my hands, my eyes were closed and my heart was asking me. "What is the reason you are overcome with emotion? What did you just read that is making the tears flow down your cheeks?" My response was, "I read a very powerful and deeply touching poem."

The question, then is, what is a poem? How does one define poetry? Why does good poetry affect the reader's soul with such profound intensity? In response to such queries, some people find Coleridge's definition of prose and poetry to be quite profound. Coleridge said, *"...remember my definitions of prose and poetry; that is, prose is words in their best order; and poetry is the best words in the best order."*[1]

This *nazm*, begins with Professor Dr. Owais Jafrey's (heretofore referred to, as the Poet/Author) humble entreaties to obtain the blessings of Allah to give him the necessary descriptive assets to draw a verbal sketch of the appearance of this sister whose thoughts are prevailing upon his creativity to describe her. Even though, such invocation is an important feature of our literary poetic

tradition, nevertheless, by no means it is an easy part of the *nazm* composition.[2]

With the most delicately selected words the *nazm* describes the silver that has crept up, in the lovely locks of the Older Sister. The contours of her bright forehead bear witness that patience is the foremost feature of her persona; her demeanour exudes unfailing devotion, testimonial to her constant piety and chastity.

Her glances reassure one and all of her unconditional affection and love. Compassion and understanding pay her homage. An aura of pristine and unaffected beauty; a halo of holiness follow her wherever she goes. Her speech is hymn-like in all aspects, filled with devoutness and godliness. Her soothing words are salve to suffering souls.

In all her images, she appears to hold a rosary in her fingers on which she continually contemplates the praises of her Maker. Even when she gives one an impression of being engaged in the other-worldly ideas, she is absolutely aware of the state of her household's affairs and her role and obligations towards the smooth running of her home. Ordinarily, to be engaged with the Divine, is not incompatible with one's awareness of the secular responsibilities and duties, but somehow, in Older Sister's angelic persona, both these opposing characteristics find an easy co-existence.

I clearly recall, the poet says, her modesty in dress
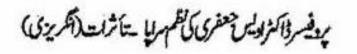
and wraps to be exemplary in what may be considered tastefulness and honourable in deportment. Untouched by hypocrisy or showmanship, she presents an excellent model of appropriate apparel. She, with her kindness and gentleness in conversation, be it face to face or on the phone, expresses her natural predispositions to decency and tenderness.[3]

Though her intonations are endowed with the musical flow of the tinkling waterfalls, she is no stranger to the unpredictability and prosaic nature of life itself. She understands and accepts that life happens to be a set of blessings tempered with trials and tribulations. Losses and gains are intertwined, she is aware of this. In this regards, she accepts the will of God and bends her head to His majesty.[4]

Now we approach the concluding verses that grip the reader, who, at this point, is in total resonance with the poet's feelings and identifies with his message completely without reservations. The powerful feelings encapsulated in the raised hands of the author; his emotions, and his good wishes, are experienced simultaneously, by his readers as well. Both, the composer and the readers are inseparably united in their prayers for the Older Sister. This is what good poetry is all about; when the poet is absolutely successful in evoking the same felling and emotions in his readers as he was experiencing at the time he was composing his poetry.[4]

References:

1. Samuel Taylor Coleridge was an English poet, literary critic and philosopher who, with his friend William Wordsworth, was a founder of the Romantic Movement in England and a member of the Lake Poets. He was born in 1772 and passed on 1834. Also see: http"//www.thisdayinquotes.com/2011/07/poetry-best-words-in-best-order.html

2. To examine the specific, formal or structural features of traditional compositions, see Hines, Naseem, *Maulna Daud's Chandayan: A Critical Study*. Manohar. New Delhi: 2009:63.

3. Wordsworth once said, "Poetry is emotion recollected in tranquility."

4. As I prepared this very humble writ-up on this *nazm*, I was struck by how difficult it is to paint one's impressions of heaven in words. The heaven that has come to a focal point in this wonderful lady – The Older Sister!

   I say, I found myself unfit to write my impressions upon reading this celestial *nazm* is for the following reason: Heaven, by its very nature is boundless, whereas words, that one needs to use to paint its picture, are by their very nature limited and confined by their definitions. As I read this *nazm* again and again, an intense desire to be in Big Sister's company, and to enjoy the aura of her generosity, which not only envelops her, but rather, embraces all those who come in her contact, came over me. It seemed to me that every feature of our Big Sister defies verbal description, and yet, in my mind, I could completely visualize her grandeur, I am sure, many of us can identify with a number of great ladies in our lives who have influenced them. The Older Sister of this *nazm*, to many of us, if we are fortunate, may personify a composite picture of several kind women we have come across in our lives. The most important feature of Professor Doctor Owais Jafrey's Oder Sister is, that so many angelic characteristics are an integral part of this single great lady who is very worthy of a younger brother's devotion and veneration. With apologies in advance, I present these few lines with most humbleness and with an awareness of my shortcomings to undertake such a great task.

سید مجاہد علی ☆

استنبول میں عالمی اردو کانفرنس

ترکی میں اردو تدریس کی ایک صدی مکمل ہونے پر استنبول یونیورسٹی کے شعبۂ ادبیات کے زیر اہتمام ۱۲ سے ۱۴ اکتوبر تک سہ روزہ عالمی اردو کانفرنس کا اہتمام کیا گیا۔ اس کانفرنس میں خاص طور سے ترکی اور برصغیر پاک وہند کے باہم مراسم وتعلقات کے حوالے سے مقالہ جات پیش کیے گئے اور دنیا بھر میں اردو زبان وادب کے فروغ اور ترویج کے موضوع پر بات کی گئی۔ اس سمپوزیم کا اہتمام استنبول یونیورسٹی میں شعبہ اردو کے سربراہ، دنیا بھر کے اردو دانوں میں ہردلعزیز شخصیت ڈاکٹر خلیل طوقار کی کوششوں کی وجہ سے ممکن ہوسکا تھا۔ اس طرح دنیا بھر کے اردو دانوں کو ایک جگہ اکٹھے ہو کر بات چیت کرنے، مختلف ملکوں میں اردو زبان کے حوالے سے ہونے والے کام کو جاننے اور روابط استوار کرنے کا موقع بھی حاصل ہوا۔ ڈاکٹر طوقار گزشتہ چھ ماہ سے اس سمپوزیم کے انعقاد کے لئے سرگرم تھے اور انہوں نے اس کانفرنس کو بامقصد بنانے کے لئے دنیا کے سترہ ممالک سے اردو ماہرین کو استنبول آنے کی دعوت دی تھی۔ اس طرح یہ کانفرنس حقیقی معنوں میں عالمگیر حیثیت اختیار کر گئی۔ کانفرنس کے شرکاء اگرچہ ترکی میں موجود تھے وہاں کی بول چال اور لکھنے پڑھنے کی زبان ترکی ہے لیکن اس موقع پر چونکہ سب لوگ اردو جاننے والے تھے اس لیے استنبول یونیورسٹی کے کانگریس ہال اور اس سے منسلک لابی پر تین روز تک اردو کا بول بالا رہا۔ سب اسی زبان میں ایک دوسرے سے بات چیت کرتے تھے اور تمام سیشن بھی اردو میں ہی منعقد ہوئے تھے۔

کانفرنس کے دوران ڈاکٹر خلیل طوقار کی طبیعت بھی ناساز ہوگئی تھی لیکن اس کے باوجود انہوں نے مختلف مواقع پر خود موجود رہ کر مندوبین کی حوصلہ افزائی کی اور اردو سے اپنی وابستگی کا

☆ (سید مجاہد علی ناروے سے شائع ہونے والے معروف اردو اخبار ''کاروان ڈاٹ این او'' کے بانی ومدیر ہیں)۔

اظہار کیا۔ سمپوزیم کے اختتامی اجلاس سے خطاب کرتے ہوئے انہوں نے اردو کو اپنی محبوبہ قرار دیا اور کہا کہ اہم اس محبوبہ اور ہر دلعزیز زبان کو مرتا ہوا نہیں دیکھ سکتے۔ اس کی بقا اور احیا کے لیے ہر سطح پر ہر ممکن کوشش کی جائے گی۔ ڈاکٹر طوقآر کے اس محبت بھرے اعلان اور عہد کا بھرپور تالیون سے خیر مقدم کیا گیا۔

اس بات کا انکشاف بھی ڈاکٹر خلیل طوقآر نے اپنی تحقیق کے دوران کیا کہ ترکی میں اردو زبان کم از کم سو برس سے متعارف ہے۔ بلکہ ۱۹۱۵ء میں ہی ہندوستان سے آئے ہوئے خیری برادران اور ان کی جدوجہد اور کوششوں سے اس زبان کی تدریس استنبول یونیورسٹی میں ہونے لگی تھی۔ اس سے قیاس کیا جاسکتا ہے کہ یہ زبان عام سطح پر بہت پہلے ترکی پہنچ چکی تھی۔ ڈاکٹر طوقآر نے نہ صرف تاریخی حوالوں سے ترکی میں اردو کی تدریس، صحافت اور اردو دانوں کی موجودگی کا سراغ لگایا ہے بلکہ دن رات انتھک محنت کے ذریعے استنبول یونیورسٹی میں اردو کو ایک مقبول مضمون کی حیثیت سے بھی متعارف کرایا ہے۔ کانفرنس کے دوران ڈاکٹر خلیل طوقآر کے ساتھی اور طالب علم یکساں طور سے سمپوزیم کو کامیاب بنانے اور مندوبین کو سہولتیں بہم پہنچانے کے لیے سرگرم رہے۔ اس طرح اردو اور اس کے ماہرین سے ترک طالب علموں کی محبت سب شرکاء کے لیے باعث طمانیت تھی۔

اس عالمی کانفرنس کے افتتاحی اجلاس سے استنبول یونیورسٹی کے وائس چانسلر، استنبول کے میئر اور استنبول میں بھارتی قونصل خانہ کے نگران کے علاوہ پاکستانی سفارتخانے کے نمائندہ نے شرکت کی۔ اس موقع پر مقررین نے اس سمپوزیم کو اردو زبان کے علاوہ ترکی اور پاک و بھارت تعلقات کے حوالے سے بھی اہم سنگ میل قرار دیا۔ بھارتی قونصل جنرل کے خطاب کے علاوہ دیگر مقررین نے بھی خاص طور سے تحریک خلافت کا ذکر کیا جو سلطنت عثمانیہ کی حمایت میں شروع کی گئی تھی اور ہندوستان کی مقبول اور طاقتور ترین تحریکوں میں شامل ہے۔ افتتاحی اجلاس میں سفارتی سطح پر پاکستان کی نمائندگی کی کمی محسوس کی گئی تاہم اختتامی اجلاس میں انقرہ میں متعین

پاکستانی سفیر سہیل محمود کی شرکت نے اس کمی کو پورا کر دیا۔

حکومت پاکستان نے ترکی میں اردو تدریس کے سو برس مکمل ہونے پر ایک یادگاری پوسٹل ٹکٹ بھی جاری کیا ہے۔ سفیر پاکستان نے پرزور تالیوں کے شور میں اس کا اعلان کیا اور اس ٹکٹ کی تصویر بھی حاضرین کو دکھائی۔ سفیر پاکستان نے اردو کے لیے ڈاکٹر خلیل طوقار کی خدمات کو زبردست خراج تحسین پیش کرتے ہوئے کہا کہ انہوں نے ۳۰ کتابیں اور ۲۰۰ تحقیقی مقالے لکھے ہیں جو ایک گراں پایہ علمی خدمت ہے۔ پاکستانی سفیر نے امید ظاہر کی کہ اس کانفرنس کے انعقاد سے اردو زبان کے فروغ کے علاوہ ترکی اور پاکستان کے تعلقات بھی مزید مضبوط اور گہرے ہوں گے۔ اس اجلاس میں لندن سے آئے ہوئے اردو کے ممتاز پاکستانی نژاد شاعر سلمان شاہد نے ایک قرارداد پیش کی جس میں حکومت پاکستان سے ڈاکٹر خلیل کی اردو کے فروغ اور مختلف ملکوں کے عوام کو قریب لانے کے لئے کوششوں کے صلے میں سول ایوارڈ دینے کی سفارش کی گئی تھی۔ یہ قرارداد اتفاق رائے سے منظور ہوگئی اور سفیر پاکستان کے ذریعے حکومت پاکستان کو بھجوادی گئی ہے۔

کانفرنس کے دوران برصغیر میں مسلمانوں کی تحریک آزادی میں خلافت عثمانیہ کا کردار، اردو کی ترویج کے نئے امکانات، جنوبی ایشیاء اور ترک، اردو، بطور شناخت، اردو تدریس کے مختلف پہلو، مختلف ممالک میں اردو زبان کی صورتحال اور دیگر اہم و دلچسپ موضوعات پر مقالے پیش کیے گئے۔

اس سمپوزیم میں دیگر لوگوں کے علاوہ امریکہ سے اردو کے شاعر اور انگریزی کے استاد ستیہ پال آنند، برطانیہ سے مشہور ادیب اور براڈ کاسٹر رضا علی عابدی، بھارت سے ناول نگار نند کشور وکرم، خواجہ اکرام الدین، نجمہ رحمانی اور ڈاکٹر سلیم محی الدین، پاکستان اورینٹل کالج لاہور کے پرنسپل ڈاکٹر عصمت اللہ زاہد، پروفیسر نگار سجاد ظہیر، فاطمہ حسن، اکیڈمی آف لیٹرز کے چیئرمین ڈاکٹر محمد قاسم بوگھیو اور محقق و اینکر فرخ سہیل گوئندی کے علاوہ متعدد مندوبین نے شرکت کی۔

رضا علی عابدی

''کانفرنس ختم ہو رہی ہے، محبتیں شروع ہو رہی ہیں''

اُس روز بالکل یوں لگا جیسے اردو نامی پرندوں نے دنیا کے مختلف ٹھکانوں سے اڑان بھری اور سارے کے سارے ترکی کے شہر استنبول میں اتر گئے۔ ہم پرانے شہر کی نیم تاریک گلیوں میں چلے جا رہے تھے جن سے گزرنے والے راہ گیر نظر نہیں آ رہے تھے لیکن ان کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ وہ سب اردو بول رہے تھے۔ یہ چہار جانب سے آئے ہوئے مندوب تھے۔ ہوا یہ کہ ترکی میں اردو زبان کی تعلیم کو ایک سو سال پورے ہو رہے تھے۔ اس موقع پر استنبول یونیورسٹی نے ایک بین الاقوامی مجلس مذاکرہ یا سمپوزیم کا اہتمام کیا اور اس میں شرکت کیلئے دنیا کے خدا جانے کون کون سے گوشوں سے اردو کے دانش وروں کو اپنے ہاں بلایا۔ کچھ ایسے تھے جن سے ایک دنیا واقف ہے، چند جانے پہچانے تھے، کئی شناسا چہرے اور کتنے ہی انجان تھے۔ وہ سارے یکجا ہوئے تو ایک اپنا گلدستہ بنا کہ خود منتظم کو بھی علم نہ ہوگا کہ وہ زبان اردو کے کیسے کیسے شگوفے آراستہ کرنے چلا ہے۔ کانفرنس کی پہلی صبح نمودار ہوئی تو کھلا کہ کون کون اور کہاں کہاں سے آیا ہے۔ چونکہ سارے مہمان ایک زبان کی لڑی میں پیوست تھے، تعارف، واقفیت اور بے تکلفی میں ذرا دیر نہ لگی۔ نئے نئے مراسم، نئی نئی دوستیاں اور سب سے بڑھ کر نئی پرانی قدر دانیاں، دیکھتے دیکھتے وہ ماحول قائم ہو گیا اور وہ سماں بن گیا جسے احباب کی کہکشاں کہیں تو عجب نہ ہو۔

نام بنام بات ذرا دیر بعد، پہلے اصل بات کہی جائے کہ یہ میلہ کیوں سجایا گیا۔ وہ صدی جو ہم گزار آئے، ابھی شروع ہی ہوئی تھی کہ مسلمانوں کو خصوصاً ہندوستان کی مسلم آبادی کو ترکی میں قائم خلافت کو بچانے کی فکر ہوئی جہاں یوں لگتا تھا کہ برطانیہ والے خلافت میں دراڑیں ڈالنے کی سوچ رہے ہیں اور وہاں وہ مسلمانوں کو مسلمانوں سے لڑانے کی تدبیر کر رہے ہیں۔ جس پر ہند میں ترکی کے مسلمانوں کے ساتھ اتحاد اور یکجہتی کی زبردست تحریک نے سر اٹھایا۔ اس مرحلے پر ملک

کے ہندو بھی تحریک کی آواز میں آواز ملانے لگے اور کتنے ہی سر کردہ ہندوستانی مسلمان ترکی جا پہنچے جہاں ترکوں نے اپنی مخصوص مہمان نوازی کا مظاہرہ کیا۔ استنبول پہنچتے ہی ہندوستانی مسلمان سرگرم ہو گئے اور وہاں ایک کام یہ ہوا کہ زبان اردو میں تحریک کا لٹریچر لکھا گیا، رسالے لکھے گئے، اخبار نکالے گئے اور اردو کی تعلیم بھی شروع ہوئی۔ ہم یہاں اسی تعلیم کے سو سال پورے ہونے کا جشن منانے جمع تھے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ تحریک تو کبھی کی چپ سادھ کر رہ گئی، اس دوران ترکی پر کتنے ہی وقت پڑے اور گزر گئے مگر حیرت ہوتی ہے کہ ملک ترکی اور زبان اردو کا وہ تعلق کبھی نہ ٹوٹا اور وہاں اردو کی تعلیم آج تک جاری ہے۔ چنانچہ ہم نے ایک بار پھر ترکوں کی مہمان نوازی دیکھی۔ استنبول یونیورسٹی کے استاد پروفیسر ڈاکٹر خلیل طوقار اس اجتماع کے اہتمام میں پیش پیش تھے۔ انہوں نے کتنے کشٹ اٹھا کر اتنی بڑی کانفرنس بلائی اور ان حالات میں جب کہ دنیا میں ہر طرف وسائل کی قلت اور پیسے کی کمی کا رونا رویا جا رہا ہے، انہوں نے دنیا کے ایک سو سے زیادہ دانش وروں کو اکٹھا کیا، ان کے رہنے سہنے اور کھانے پینے کے سارے انتظامات کیے اور کانفرنس اس شان سے شروع ہوئی جیسے کوئی بہت بڑا طیارہ فضا میں بلند ہوتا ہے۔ ایک دو نہیں پورے تین دن، صبح سے شام تک ترکی میں اردو سے لے کر دنیا میں اردو تک کون سا موضوع تھا جس کی بات نہیں ہوئی۔ یہی نہیں، اس بنیادی عنوان سے لگے لگے معاملات بھی اٹھائے گئے۔ لوگ دور دور سے آئے تھے، اس لئے مسائل بھی دور دور کے سننے کو ملے۔ بات چھڑی تو ایسے ایسے پہلو اُجاگر ہوئے جو ہمارے لئے اجنبی تھے۔ یوں سمجھئے کہ سولہ سترہ ملکوں سے آئے ہوئے مندوبین کے انداز بھی کچھ کم، کچھ زیادہ سولہ سترہ ہی تھے۔ کچھ تو وہ جن کی تقریر کی لذت ایک عالم میں مشہور ہے۔ کینیڈا کے ڈاکٹر تقی عابدی جب بولنے پر آ جائیں تو اس شخص کی گھڑی رُک جاتی ہے جس کا کام یہ ہوتا ہے کہ آپ کا وقت پورا ہوا۔ اس روز ڈاکٹر صاحب اپنے مقالے کا پلندہ اٹھائے اسٹیج پر گئے اور اب جو اپنی تقریر کی تمہید باندھی تو سارا وقت زورِ خطابت کی نذر ہو گیا، اس غریب مقالے کے پڑھے جانے کی نوبت ہی نہیں آئی۔ کچھ ہو، داد بہت پائی، ایک دلچسپ بات یہ بھی ہوئی کہ جتنے بھی

استاد تھے، کیا مرد کیا خواتین، خوب خوب بولے کیونکہ بولنا ہی ان کا کام ہے۔ڈاکٹر سعادت سعید نہ صرف استاد ہیں بلکہ بہت عرصے تک ترک طالب علموں کو پڑھاتے رہے ہیں، انہیں اپنے موضوع کا پابند رہنے اور حاضرین کی توجہ اپنی طرف رکھنے کا ہنر خوب آتا ہے۔روس کی پروفیسر لڈ میلاوسی لیوا تمام عمر ریڈیو ماسکو سے اردو بولیں، انہیں بولنے میں مہارت حاصل ہے۔ پروفیسر ڈاکٹر ستیہ پال آنند بولتے ہیں تو محسوس ہوتا ہے کہ محفل میں کہیں سے علم نازل ہو رہا ہے۔ پروفیسر ڈاکٹر نجیب جمال کی تقریر دیکھنے میں سادہ لیکن اندر سے نہایت ٹھوس ہوتی ہے۔خواتین میں ڈاکٹر فاطمہ حسن اور ڈنمارک کی صدف مرزا حاضرین کو اپنی جانب متوجہ رکھنے میں مہارت رکھتی ہیں۔ خواتین کا ذکر آیا تو استنبول کی جلسہ گاہ میں ایک جوہر ہمارے ہاتھ لگا وہ کینیڈا سے آئی ہوئی عروج روشنی تھیں جو اپنے ملک میں اردو کا ریڈیو پروگرام نشر کرتی ہیں اور آواز جن کی مائیکروفون کیلئے بنی ہے۔شاعر بھی ہیں اور جدید نظم کہتی ہیں۔ بزرگوں میں برطانیہ کے مقصود الٰہی شیخ کی رواں گفتگو لطف دیتی ہے جن کے پندرہ روزہ راوی کا وہ صفحہ مجھے یاد ہے جس کا عنوان ہوا کرتا تھا ''دل میں نہ رکھیئے، راوی میں لکھیے''۔ صفحے پر لکھنے والے بھی یہی تھے۔اور آخر میں ایک اور نہایت محترم بزرگ پروفیسر ڈاکٹر نند کشور وکرم جن کی بات ذرا دیر بعد۔یہ تمام نام جو میں نے لئے ہیں مجھے اتنے ہی عزیز اور محترم ہیں جتنے وہ سارے نام جو اس محدود تحریر میں نہیں سما سکے۔ان سے ملاقاتیں ہوئیں، کانفرنس کی سب سے بڑی سعادت وہاں قائم ہونے والے انسانی رشتے تھے جن کا کوئی بدل نہیں۔یہ بھی اس کانفرنس کا بڑا صلہ تھا کہ اصل ملاقاتیں ہوٹل میں ہوتی تھیں جہاں سب کا قیام تھا۔نئی دوستیاں، نئے رشتے، نئی گرم جوشیاں اور تعلق کا نیا پن۔سمیٹنے والوں نے خوب سمیٹا۔

دن بھر کی کارروائی کے بعد شام کو ہوٹل میں محفل جمتی، مشاعرے ہوتے اور ایک مشاعرہ تو ایسا ہوا کہ کب ہوا ہوگا۔صدارت کی کرسی پر جناب ستیہ پال آنند بیٹھے تھے۔شاعری کی باریکیوں کو جیسا وہ جانتے ہیں، کم ہی لوگ جانتے ہوں گے۔اس شام ہر شاعر جب اپنا کلام سنا چکتا تو ستیہ پال جی اس کی شاعرانہ باریکیوں پر روشنی ڈالتے۔ہم نے شعر کو ہر انداز میں سنا تھا، اس

ڈھب سے کبھی نہیں سنا تھا۔لطف آ گیا۔میرا بہت سا وقت تین بزرگوں، آنند جی، وکرم جی اور مقصودالٰہی شیخ صاحب کے ساتھ گزرا۔اس دوران عجب انکشاف ہوا۔ڈاکٹر نند کشور وکرم صاحب کے ہندو ہونے کی بات ہوئی تو انہوں نے بتایا کہ وہ حسینی برہمن ہیں۔بڑے فخر سے بولے کہ ہم لوگوں نے یزید کی فوج سے جنگ کی تھی۔کسی حسینی برہمن سے یہ میری پہلی ملاقات تھی۔وہیں ہوٹل کی آرام گاہ میں شیخ صاحب کی فرمائش پر شیخ پال آنند جی نے اپنی کہی ہوئی نعت سنائی۔ان کی آنکھیں بھیگ گئیں، ہم نے بھی آنسو ہتھیلیوں میں جذب کر لئے۔

اگلے روز کانفرنس کا آخری دن تھا۔مجھ سے کہا گیا کہ الوداعی کلمات کہوں۔بس یہی فقرہ میرے ہونٹوں پر آیا کہ ’’خواتین وحضرات۔کانفرنس ختم ہو رہی ہے محبتیں شروع ہو رہی ہیں۔‘‘

شفق ہاشمی

حمد

مولا، میرے خواب سہانے سارے آپؐ نے بخشے ہیں
زندہ رہنے کے یہ بہانے سارے آپ نے بخشے ہیں
میں تو اک ننھا سا ذرّہ آپ کی انمٹ راہوں کا
میری حقیقت کو افسانے سارے آپ نے بخشے ہیں
بھوک اُگی ہے، کھیت کھِلے ہیں، پھول ہیں، پھل ہیں، پت جھڑ ہے
موسم موسم کے یارانے سارے آپ نے بخشے ہیں
روٹھ کے من مندر میں بیٹھا ہے جو پجاری آپ کا ہے
نجد کے صحرا کو دیوانے سارے آپ نے بخشے ہیں
میرے عشق کو مر مٹنے کے سو سو گر کس نے سکھلائے
حسن کو جانوں کے نذرانے سارے آپ نے بخشے ہیں
میری رکھوالی کو جگائے دل میں خوف کے پرَ تو بھی
اور امید کے خیر خزانے سارے آپ نے بخشے ہیں
میرے بچوں کو جو ملی ہے حسن و جوانی کس کی ہے
عمر رواں کو بن ویرانے سارے آپ نے بخشے ہیں
بارش کی بوندوں سے ٹپکی ہے جو خوشبو آپ کی ہے
امرت رس ہے اور پیمانے سارے آپ نے بخشے ہیں
بزمِ شفق میں تارے بھی ہیں اور شمعِ خورشید بھی ہے
شمعِ نور کو پھر پروانے سارے آپ نے بخشے ہیں

صابر عظیم آبادی

حمد

فقط انسان ہی کرتا نہیں ہے تذکرہ تیرا
فرشتوں میں بھی ذکر خیر ہوتا ہے سدا تیرا
نوازش سے عنایت سے خزانہ ہے بھرا تیرا
لگا رکھا ہے بندوں نے جہاں میں آسرا تیرا
کرم کا تیرے چرچا ہے پرندوں میں چرندوں میں
ادب سے صحن گل میں نام لیتی ہے صبا تیرا
ہوا ہوں جب سے تیرے حسن کا یارب میں شیدائی
مرے قلب و نظر میں جلوہ رہتا ہے بسا تیرا
میں تیری حاکمیت پر نہ کیوں ایمان لے آؤں
جہاں میں حکمت و فن میں بھی تو ہے سب سے جدا تیرا
کبھی محروم تو رکھتا نہیں ہے اپنے سائل کو
ہر اک بندے پہ ہوتا ہے کرم صبح و مسا تیرا
اُدھر توصیف میں تیری مغنّی گنگناتا ہے
اِدھر نغمہ سرا ہے شاعرِ رنگیں نوا تیرا
ترے ہونے کا چلتا ہے پتہ ہر چیز سے یارب
ازل سے اس لئے انسان گن گاتا رہا تیرا
اُسی کے نقش پا پر چل رہِ ہستی میں تو صابر
وہی ہے رہبر کامل وہی ہے رہ نما تیرا

راشدہ شعیب

حمد

اِک تیرا نام ہی بس نوکِ قلم رکھا ہے
وادیٔ عشق میں یوں پہلا قدم رکھا ہے
میرے مولا میں ترا شکر ادا کیسے کروں
تو نے پھر میری دعاؤں کا بھرم رکھا ہے
میں طلب گار رہی سر کو جھکا کر اپنے
تو نے ہر بار وہی دستِ کرم رکھا ہے
سنگِ اسود کو مرے ہونٹ کبھی مس ہوں گے
دل میں اک شوق یہی تیری قسم رکھا ہے
جانے کس وقت ترے گھر سے بلاوا آ جائے
نذر کرنے کے لئے دیدۂ نم رکھا ہے

ریاض ندیم نیازی

نعت

رحمتِ عالم کی بارش، کس کے آنگن میں نہیں
اُن کی اُلفت کے خزانے، کس کے دامن میں نہیں

یہ تو سوچو جاؤ گے، کس منہ سے اُنؐ کے سامنے
چاہتوں کے خال و خد جب دِل کے درپن میں نہیں

میں ہوں دِیوانہ نبیؐ کا، اے زمانے کی ہوس
کوئی گنجائش تری، میرے نشیمن میں نہیں

جب چھلک اُٹھیں مری آنکھیں تو یہ دل نے کہا
دل کشی جو ان کی رِم جِھم میں ہے ساون میں نہیں

پتّیوں میں جس کی تیرےؐ پیار کی خوشبو نہ ہو
کوئی ایسا پھول آقاؐ میرے گلشن میں نہیں

تیریؐ یادوں نے مرا باطن اُجالا اِس طرح
اب اُجالوں کے سوا کچھ بھی مرے من میں نہیں

کب بلائیں گے ندیمِ خستہ کو محبوبِؐ رب
دیر سے کوئی کرن کیوں میرے روزن میں نہیں

نعت

بنا کر اُنؐ کو پیغمبر جہانِ بزمِ اِمکاں کا
بڑھایا مرتبہ خالق نے اِس عالم میں اِنساں کا

سکھاتا ہے ہمیں کردار یہ شاہِؐ رسولاں کا
کہ بڑھ جاتا ہے رُتبہ عاجزی سے اور اِنساں کا

گزر ہو جب ترا بادِ صبا دربارِ عالی سے
تو پھر قصہ سنا دینا مرے حالِ پریشاں کا

کوئی چشمِ بصیرت سے جو دیکھے تو نظر آئے
کہ ہے شمس و قمر میں حُسن سارا دیں کے سلطاں کا

بصیرت کی نظر سے جس نے مدحِ مصطفیٰؐ لکھی
کمالِ فن نظر آیا اُسے احمد رضا خاں کا

ندیمِ دل گرفتہ کو بچالیں کرب سے آقاؐ
کہ نعتوں سے ہُوا ہے رنگ ظاہر چشمِ گریاں کا

مضطر اکبر آبادی

○

مجھے تھا دوستنوازی پہ جن کی ناز بہت
مرے وہ دوست ہی نکلے زمانہ ساز بہت

ازل سے تا ابد جابجا ہیں پھیلے ہوئے
محبتوں کے بھی ہیں سلسلے دراز بہت

طلب یہ کچھ بھی کسی غیر سے نہیں کرتے
نیاز مند تمہارے ہیں بے نیاز بہت

نہ گرد گرد بھی ہو سکے یہ آئینے
حقیقتوں سے الجھتا رہا مجاز بہت

جو ہو تو کیسے ہو باہم گر ہم آہنگی
کہیں نشیب بہت ہے کہیں فراز بہت

ہے غم گساروں کی ہمدردیوں سے ناک میں دم
یہاں مریض ہیں کم اور چارہ ساز بہت

یہ کاش ہوتا قناعت پسند بھی مضطر
ہے آدمی کی طبیعت میں حرص و آز بہت

○

خود کو اپنی سرکشی کی یہ سزا دیتا ہوں میں
عاجزی سے اس کے آگے سر جھکا دیتا ہوں میں

اس سے بڑھ کر حرمتِ غم اور ہو سکتی ہے کیا
چوٹ جب لگتی ہے دل پر مسکرا دیتا ہوں میں

روشنی جب ڈسنے لگتی ہے مرے احساس کو
دفعتاً جلتے چراغوں کو بجھا دیتا ہوں میں

میں نہیں کرتا کسی کے حق میں کوئی بد دعا
جو دغا دیتے ہیں ان کو بھی دُعا دیتا ہوں میں

خواہشیں ہوتی ہیں جب حد سے زیادہ موجزن
تھپکیاں دے کر انہیں دل میں سلا دیتا ہوں میں

یوں بھی مل جاتی ہے درماں کے تکلف سے نجات
زندگی کو درد کا خوگر بنا دیتا ہوں میں

میں کیا کرتا ہوں مضطر آپ اپنا احتساب
ہو خطا سرزد تو خود کو بھی سزا دیتا ہوں میں

صابر عظیم آبادی

O

اس میں دریاؤں کی روانی ہے
یہ لہو ہے کہ سرخ پانی ہے

کاٹتا ہوں میں فصلِ تنہائی
زندگی تیری مہربانی ہے

اپنا چولا وہ کیسے بدلے گا
اس کی تہذیب تو پرانی ہے

اپنے اندر شعور پیدا کر
علم کی فصل گر اُگانی ہے

جلتے صحرا میں سیر کرتا ہوں
درد کی رُت بھی کیا سہانی ہے

خون آنکھوں میں آگیا شاید
رنگ اشکوں کا ارغوانی ہے

لے کے کشکول پھر رہے ہیں لوگ
شہر میں کس کی حکمرانی ہے

اس حویلی میں رہ کے دیکھو تو
اس کے در پردہ اک کہانی ہے

اِس کو رکھنا سنبھال کر صابر
یہ کسی کی نشانی ہے

محمد طارق غازی۔ اونٹاریو (کینیڈا)

O

کیا پوچھیے طارق حال ان کا جو دہر میں پیہم جلتے ہیں
گیلی لکڑی کی طرح کیسے ساون میں کم کم جلتے ہیں

اک آگ ہے ذہن کی اس میں صنم کچھ زیادہ کچھ کم جلتے ہیں
تم دم سادھے بیٹھے ہو یہاں، ہم مدھم مدھم جلتے ہیں

انسانوں کے یہ شہر ہیں یا نمرود کے آتش خانے ہیں
شعلوں کی لپٹ میں لپٹے ہوئے سب دھُودھُو دھم دھم جلتے ہیں

یہ کیسی عداوت ہے جس میں نفرت کی آگ دہکتی ہے
سنولائے ہوئے مٹی کے بدن بس برہم برہم جلتے ہیں

آنکھوں میں راتیں کٹتی ہیں، دن دھوپ میں تپتے ہیں کیا کیا
کچھ خوشیاں سلگی سلگی سی، سینے میں کچھ غم جلتے ہیں

ماتھے پہ پسینہ کی بوندیں، آنکھوں میں نشہ، بالوں میں نمی
کچھ سوکھے ساحل جلتے ہیں، کچھ ندی کے نم جلتے ہیں

سینے میں بھڑکتے ہیں شعلے اس بھیگے بھیگے موسم میں
اس رم جھم رم جھم برکھا میں دل جھم جھم جھم جھم جلتے ہیں

کیا جانے ہونٹوں کی لرزش کیا بھید چھپاتی رہتی ہے
خاموش فصیلوں کے اوپر ارمانوں کے پرچم جلتے ہیں

پرتو روہیلہ

O

رہ نما راستے میں خود بھی تو کھو سکتا ہے
حادثہ کوئی کسی وقت بھی ہو سکتا ہے

داغ کیسے بھی ہوں کتنے بھی کسی دامن پر
وقت دریا ہے انہیں چاہے تو دھو سکتا ہے

حق ادا کر کے مسرت سے کسی کا ہر شخص
چند لمحوں کے لئے چین سے سو سکتا ہے

اشک اک قطرہ سہی اس کو حقارت سے نہ دیکھ
سیل بن جائے تو بستی کو ڈبو سکتا ہے

دستِ مجبور گریباں سے بہت دور نہیں
دیدہ نمناک ہو دامن تو بھگو سکتا ہے

رات تاریک سہی پھر بھی سحر کا سورج
تخمِ اُمید دلِ زار میں بو سکتا ہے

O

ترے دورِ عاشقی میں یہی روزگار ہو گا
کبھی جان فگار ہو گی کبھی دل فگار ہو گا

نہیں مل سکے گی مجھ کو کبھی روشنی سحر کی
میرا آسماں ہمیشہ یونہی تیر و تار ہو گا

مری چاہتوں کے پیکر یونہی مضطرب رہیں گے
نہ انہیں قرار ہو گا نہ مجھے قرار ہو گا

تو ہزار حلف اٹھا لے تو ہزار عہد کر لے
ترے قول اور قسم پر کسے اعتبار ہو گا

ہمیں قسمتوں کا مطلب تو بتا دیا ہے تو نے
جو ہُوا کرے تھا پہلے وہی بار بار ہو گا

انور جہاں برنی (امریکہ)

O

کبھی موجِ نرم رو سے مرا چھن گیا کنارا
کبھی سیلِ تند رو نے مجھے دیدیا سہارا

کبھی بحرِ غم میں مجھ کو نہ ملا کوئی کنارا
کبھی حسرتوں نے بڑھ کر مجھے دیدیا سہارا

یہ حوادثات پیہم، یہ کشاکش مسلسل
یہ گُہر ہیں جن سے ہم نے رخِ زندگی سنوارا

مری حسرتوں نے آخر مجھے زندگی عطا کی
مری حسرتوں کو یارب نہ ملے کوئی کنارا

وہ اک حرفِ آرزو تھا جو نہ آسکا زباں پر
ہے وگرنہ یوں بہت کچھ مجھے گفتگو کا یارا

کبھی بحرِ غم کی زد پر رہا ذات کا سفینہ
کبھی موجِ تند خو ہی مجھے ہو گئی کنارا

اسے کیا کہوں کہ کیا ہے، مجھے کچھ خبر نہیں ہے
کوئی یاد بن رہی ہے مری زیست کا سہارا

شب غم کی ظلمتوں کو وہ شکست دے رہا ہے
مری زیست کے اُفق پر تری یاد کا ستارا

تری یاد تیرا تحفہ مجھے اور چاہئے کیا
کہ اسی شریکِ غم نے مری زیست کو سنوارا

رہِ زندگی میں انور میں کبھی جو ڈگمگائی
مری منزلوں نے خود ہی مجھے دور سے پکارا

O

مری زندگی کا حاصل مرا کرب جاودانہ
یہی اک مری کہانی یہی سرخی فسانہ

میری زندگی کی راہیں ہوئیں نہ تیرہ تار لیکن
نہ مجھے گلہ ہے تجھ سے نہ شکایت زمانہ

وہ جو آئیں بھی تو احساں، جو نہ آئیں بھی تو احساں
زہے قسمتِ محبت یہ نزاکت بہانہ

نہ ڈرا مآلِ گُل سے اے فریب خوردہ ناصح
یہی لمحۂ تبسم میری زیست کا بہانہ

تیری یاد کے بہانے گنے آسماں پہ تارے
مجھے راس آگئی ہے یہ عبادت شبانہ

مرے جذبہ دروں نے وہ نگہ مجھے عطا کی
وہ جدھر بھی اٹھ گئی ہے وہیں جھک گیا زمانہ

یہی غم کی آبرو ہے، یہی میری آرزو ہے
وہ سنیں تو سچ نہ سمجھیں میرے درد کا فسانہ

غم مہ وشاں بھی مجھ کو، غم دو جہاں بھی مجھ کو
میرا درد بیکرانہ، میرا ظرف بیکرانہ

تری تنہا ملکیت ہے، اسے فاش کر نہ انور
جو سنے وہ سچ نہ سمجھے تیرے درد کا فسانہ

پروفیسر زہیر کنجاہی

O

پرندہ ایک اُڑا تھا جو کل ہواؤں میں
وہ کھو گیا ہے خدا جانے کن فضاؤں میں

جھلس کے رہ گئی کیوں فصل آرزوؤں کی
بھری ہوئی ہے یہ کیا آگ سی گھٹاؤں میں

دُکھوں کے خار اُگائے ہیں تم نے پھولوں میں
ملیں گے زخم بھی اب ریشمی رداؤں میں

فلک سے اُن کا جواب آئے بھی تو کیا آئے
خلوصِ دل ہی نہ شامل ہو جن دعاؤں میں

غمِ جہاں ہی کا پَرتو نہیں مرے اشعار
ہے کربِ روح بھی شامل مری نواؤں میں

مرا ہے ذکر جہاں میں ترے حوالے سے
کبھی تو آکے مجھے مل وفا کی چھاؤں میں

کتابِ دل میں تھے محفوظ جو زہیر کبھی
بکھر گئے ہیں فسانے وہ اب فضاؤں میں

شفق ہاشمی

O

اپنی شکستگی کے مظاہر جدا جدا
آنکھوں میں پھر رہے ہیں مناظر جدا جدا

ٹوٹی ہے کیا فصیل مرے شہرِ درد کی
اپنے وجود کے ہیں عناصر جدا جدا

کس سمت بڑھ رہے ہیں قدم کچھ خبر نہیں
راہیں الگ الگ ہیں، مسافر جدا جدا

کیوں ہیں یہ ایک جادہ و منزل کے ہمسفر
تنہا روی کے شوق میں آخر جدا جدا

مٹی یہیں کی، خون اسی گلستاں کا ہے
ہر پھول کا ہے رنگ بظاہر جدا جدا

مدت ہوئی شفق کہ ہیں اپنی تلاش میں
بکھرے اِدھر اُدھر ہیں نوادر جدا جدا

ریاض ندیم نیازی

O

خلافِ جبر مجبوری کا پُتلا بول سکتا ہے
ستم سہتے ہوئے مظلوم بندہ بول سکتا ہے

جو منصف ہو اگر منصف تو پھر صحنِ عدالت میں
کفِ قاتل پہ دھبہ بھی لہو کا بول سکتا ہے

قضا کے خوف سے خاموش بیٹھے ہیں سبھی لیکن
اچانک کوئی بچہ بے ارادہ بول سکتا ہے

بگولے بھی ہماری بات کی تائید کرتے ہیں
زبانِ حال سے خاموش صحرا بول سکتا ہے

کہیں سے جرأتِ اظہار مل جائے اگر اس کو
تو لشکر کے مقابل کوئی تنہا بول سکتا ہے

سنا ہے ہم نے خاموشی کبھی اچھی نہیں ہوتی
وہی اچھا ہے محفل میں جو اچھا بول سکتا ہے

خموشی کی زباں سمجھو تو سمجھو، ورنہ سچ یہ ہے
نہ دریا بول سکتا ہے نہ صحرا بول سکتا ہے

مرا مولا اگر چاہے، ثبوتِ بے گناہی میں
پنگھوڑے میں پڑا معصوم بچہ بول سکتا ہے

فضائیں چیخ پڑتی ہیں یہ دیکھا ہے ندیم اکثر
تشدد حد سے بڑھ جائے تو گونگا بول سکتا ہے

O

کچھ اُس سے گفتگو کرنے کی تیاری نہیں کرنی
کہ دانستہ کوئی بھی کیفیت طاری نہیں کرنی

"محبت کی کہانی میں اداکاری نہیں کرنی"
کہ ہرگز بات کوئی غیر معیاری نہیں کرنی

تماشا دیکھنے کو آئے ہیں ہم تو دکانوں کا
ہمیں بازار سے کوئی خریداری نہیں کرنی

جہاں تک ہو سکے محفوظ رکھنا ہے بھرم اپنا
کہ اپنے ہاتھ سے پامال خودداری نہیں کرنی

محبت کے سبھی اسباق ازبر ہیں ہمیں یارو
برائے امتحاں کوئی بھی تیاری نہیں کرنی

زبان و لفظ پر رکھنا بہر صورت گرفت اپنی
کہ محفل میں کسی کی بھی دل آزاری نہیں کرنی

نہیں کچھ فائدہ بے فیض لوگوں سے محبت کا
ہمیں بنجر زمینوں میں شجرکاری نہیں کرنی

ندیم اس طرح آ جاتی ہے منزل موت کی اکثر
کبھی حد سے زیادہ تیز رفتاری نہیں کرنی

کرامت بخاری

O

تصور میں وہ آج آئے تو ہیں
ذرا زخمِ دل مسکرائے تو ہیں
نقوشِ تمنا دلِ زار نے
بنائے بنا کر مٹائے تو ہیں
جو آباد رکھتے تھے خلوت مری
وہ گائے ہوئے گیت گائے تو ہیں
دلِ مضطرب یہ بھی کچھ کم نہیں
ترے پاس یادوں کے سائے تو ہیں
مسافر اسے تُو غنیمت سمجھ
یہ رستے کسی نے بنائے تو ہیں
محبت نہیں ہے تو نفرت سہی
نہیں ہیں جو اپنے پرائے تو ہیں
اُفق پہ ہیں یا میری پلکوں پہ ہیں
ستارے کہیں جھلملائے تو ہیں
کرامتؔ بنالوں گا تصویر بھی
نگاہوں میں وہ نقش آئے تو ہیں

O

غم کے سائے روح پر چھانے لگے
پھر بہاروں کے قدم آنے لگے
ہو گئیں آنکھوں میں کچھ آبادیاں
آنسوؤں کے قافلے آنے لگے
پھر کسی کی یاد کی انگڑائیاں
پھر کسی کے زخم تڑپانے لگے
پیار کے پنچھی کسی کی یاد میں
نغمہ ہائے درد دہرانے لگے
فصل گُل آئی جب اپنے زور پر
پھر مجھے کچھ لوگ سمجھانے لگے
وقت مشکل اور مشکل آ پڑی
رفتگاں رہ رہ کے یاد آنے لگے
رندِ میخانہ کرامت ہی نہیں
شیخ جی بھی شوق فرمانے لگے

ڈاکٹر سید قاسم جلال

O

بصد توقیر بلوایا گیا ہوں
بصد تحقیر ٹھکرایا گیا ہوں

ہزاروں بار بھولا ہے زمانہ
ہزاروں بار دہرایا گیا ہوں

خود اپنی ذات اب میرا ہدف ہے
خود اپنے خوں میں نہلایا گیا ہوں

تمنائے مسرت میں مسلسل
صلیبِ غم پہ لٹکایا گیا ہوں

مجھے کن منزلوں کی جستجو تھی
میں کن راہوں میں بھٹکایا گیا ہوں

تھا کل، آنکھوں کا سُرمہ، اب مگر کیوں
بشکلِ اشک، ٹپکایا گیا ہوں

خود اپنی ذات میں کھویا ہوا تھا
خود اپنی ذات میں پایا گیا ہوں

جلال آغاز کیا تھا، کیا ہے انجام
کہاں تھا میں، کہاں لایا گیا ہوں

O

دل مصائب سے ڈر نہ جائے کہیں
چڑھتا دریا، اُتر نہ جائے کہیں

مت اُلجھ، کثرتِ مشاغل میں
ذات تیری، بکھر نہ جائے کہیں

صحبت اہلِ مال و زر سے، تری
عزتِ نفس، مر نہ جائے کہیں

یاس کی کب رُکے گی، سنگ زنی
آس جاں سے گزر نہ جائے کہیں

قوم پھر گُم ہے، خوابِ غفلت میں
پھر عُدو وار کر نہ جائے کہیں

پھر ہلائی ہے عدل کی زنجیر
آہ پھر بے اثر نہ جائے کہیں

آفتابِ عروجِ قوم جلال
بن چراغِ سحر نہ جائے کہیں

سلیم زاہد صدیقی

O

ناراضگی ہے آپ کی اتنی شدید کیا ملنے نہ ہم سے آئیں گے امسال عید کیا

لو انگلیاں تراش لیں مثلِ زنانِ مصر اب اور چاہتے ہیں وہ ہم سے مزید کیا

کیسے یقین کرلوں مرا خط انہیں ملا لایا ہے ڈاکیا، مرے خط کی رسید کیا

اُجڑی ہے جب سے محفلِ یارانِ ہم سخن پھر جشن ماہتاب کیا، شبرات و عید کیا

اب ہم کو اعتبار کسی کا نہیں رہا کل تم بھی چھوڑ جاؤ گے تم سے بعید کیا

اک معجزہ ہی تھا کہ مرے گھر وہ آ گیا اس معجزہ کی تم کو نہیں تھی امید کیا

ناراض ہو کے ہم سے گیا وہ ضرور ہے پچھتا کے لوٹ آئے گا۔ اُس سے بعید کیا

قاضی ترا، وکیل ترا، شہر بھی ترا ایسے میں مجھ غریب کی ہو گی شنید کیا

کیا تم بھی انتظار میں اس بے وفا کے ہو؟ اس نے کئے ہیں تم سے بھی وعدے وعید کیا

کیا اب نہیں ہے کوئی ضرورت حسینؓ کی باقی نہیں رہا ہے کوئی بھی یزید کیا

تم نے بھی آنا ترک کیا شب کو میکدے
زاہدؔ کی طرح تم بھی ہوئے زن مرید کیا

اویس الحسن

O

کبھی روبرو کبھی چار سو کبھی یم بہ یم ترا عشق ہے
ہے نفس نفس، ہے گلو گلو، کبھی دم بدم ترا عشق ہے

مجھے میکدوں کی خبر نہیں، نہ ہی جام و مینا کا علم تھا
جو سرورِ جاں کا سبب بنا وہی ایک غم تیرا عشق ہے

وہ جو دل گرفتہ سی شام تھی میرے پاس آ کے چہک اٹھی
ہے نظر نظر میں جو سرخوشی وہی دم بدم ترا عشق ہے

کہیں اوس بن کے ٹپک پڑا، کہیں بارشوں میں وہ ڈھل گیا
کہیں آہ بن کے مچل اُٹھا، کہیں چشمِ نم ترا عشق ہے

میں سراپا سجدۂ شکر بن کے جھکا رہوں تیرے سامنے
یہ تقاضا ہوش نے کر دیا جو ہُوا بہم ترا عشق ہے

میں اکیلا کیسے وہ کاٹتا جو اندھیری شب تھی حیات کی
مرے دل میں تھا جو بھڑک اُٹھا وہ چراغِ غم ترا عشق ہے

کبھی اشک بن کے جو بہہ گیا وہ اویس کو یہی کہہ گیا
جو پلک پلک پہ چمک اُٹھا وہ الم الم ترا عشق ہے

نازیہ خلیل عباسی

O

دل پہ گزر گئی جو قیامت غضب کی تھی
کہنے لگا تھا غم کہ محبت غضب کی تھی

شکوہ لبوں پہ میرے جو آیا نہ آج تک
میرے دلِ حزیں کی ہدایت غضب کی تھی

سانسوں میں غم کی آگ جلی ہے تمام عمر
اس جاں گداز دل کی عنایت غضب کی تھی

شامِ فراق دل کی صداؤں کی خیر ہو
پتھر جو ہو گئی ہوں، سماعت غضب کی تھی

پہلو میں میرے کرب مسلسل بنا رہا
نادان دل کو مجھ سے عداوت غضب کی تھی

علی احمد قمر

نفاذِ اُردو

لکھ رہا ہوں میں بیانِ اُردو
برملا اور بزبانِ اُردو

لطف و تسکین دلبراں اُردو
شعر و احوالِ دل کی جاں اُردو

شرحِ قرآں لکھی گئی اس میں
ہمیں تفہیم دیں ملی اس میں

حمد باری کہی گئی اس میں
رب کی تمجید کی گئی اس میں

اس میں لکھا گیا خدا ہے کون
مالک اُس کے سوا بھلا ہے کون

نعتِ پیغمبرؐ خدا اس میں
وصف اُنؐ کے جدا جدا اس میں

اُن کی عظمت بیاں ہوئی اس میں
اُن کی توصیف عیاں ہوئی اس میں

باب عرفاں کے وا ہوئے اس میں
فرض حق کے ادا ہوئے اس میں

غالب و میر و مومن و اکبر
دل و جاں سے فریفتہ اس پہ

فکرِ اقبال کی زباں اُردو
فیض کی ساری داستاں اُردو

اس میں لکھی جہان کی تاریخ
فکر و ذکر و زبان کی تاریخ

ہم نے تعلیم اس میں حاصل کی
خوئے تسلیم اس میں حاصل کی

بات قائد کی یہ سنہری ہے
اُردو قومی زبان ٹھہری ہے

لیکن اربابِ اختیار ایسے
ملک و ملت کا سوچتے کیسے

مصلحت کا شکار ہیں یہ لوگ
دشمنوں میں شمار ہیں یہ لوگ

سیکھتے ہیں زبان غیروں کی
بولتے ہیں زبان غیروں کی

افسری کی زبان انگریزی
برتری کا نشان انگریزی

کشمکش ہے یہ دو فریقوں کی — جنگ دو مختلف رویوں کی
راس ان کو نہیں گداز اس کا — اِن کے حق میں نہیں نفاذ اس کا
چاہتے ہیں ہو برتری اِن کی — کم ذرا ہو نہ قیصری اِن کی
دُہرا معیارِ زندگی ان کا — نہیں انداز بھی کوئی ان کا
دُہرے تعلیم کے ذریعے ہیں — ایک شہر اور کئی قبیلے ہیں
ان کو خطرہ نفاذِ اُردو سے — ان کو گلشن میں خوف خوشبو سے
لوگ طبقات کے پجاری ہیں — حسنِ انسانیت سے عاری ہیں
ایک احساسِ برتری اِن میں — اک تصنع کی زندگی اِن میں
حکمرانی کریں یہ لوگوں پر — بند لوگوں پہ زندگی کے در
کیا کمی ہے زبان اُردو میں — کیا کجی ہے زبانِ اُردو میں
سارے مضموں سما سکیں اس میں — رازِ ہستی بتا سکیں اس میں
کوئی حیلہ نہیں چلے گا اب — اس سکہ یہیں چلے گا اب
کھیل آگے یہ چل نہیں سکتا — کوئی سچ کو بدل نہیں سکتا
اب یہ طبقات ہمیں قبول نہیں — کوئی جینے کے یہ اصول نہیں
ایک سا ہو گا زندگی کا طریق — فوقیت میں نہیں کوئی بھی فریق
اپنا لہجہ زبانِ اُردو ہے — ترجمانِ دلِ من و تو ہے
ہو رہا ہے نفاذ اُردو کا — یہ سفر ہے تمام خوشبو کا

نظم

محمد طارق غازی۔ اونٹاریو (کینیڈا)

سنو تو سہی

سنو تو سہی، راستہ اپنا بدلو
سنو ان کہی، راستہ اپنا بدلو

یہ راہیں غلط سمت میں جا رہی ہیں
ببولوں کے سایوں میں الجھا رہی ہیں
یہ پگڈنڈیاں تم کو بھٹکا رہی ہیں

یہ آتی کہیں ہیں نہ جاتی کہیں ہیں
کہیں بھی کہیں بھی پہنچتی نہیں ہیں

یہاں ظلم و ظلمت کے دھندے بہت ہیں
یہاں خود فریبی کے پھندے بہت ہیں
یہاں شیطنت بُردہ بندے بہت ہیں

بہت خون ہے آگے خطرہ بہت ہے
جو ٹپکے لہو قطرہ قطرہ بہت ہے

سنو تو سہی ، راستہ اپنا بدلو
سنو تو سہی، تم سنو تو سہی

شفق ہاشمی

شاد باد و زندہ باد

مرے لہو کے درخشاں ایاغ زندہ رہیں
مرے خدا، مرے گھر کے چراغ زندہ رہیں

اِنہی سے آبروئے موسم بہار بھی ہے
مرے یہ پھول، یہ خوشبو، یہ باغ زندہ رہیں

میں جن کے نام سے ہوں معتبر زمانے میں
مری شناخت، وہ میرے سراغ زندہ رہیں

میں عہدِ رفتہ کا حاضر، یہ میرا مستقبل
یہ جان و جسم، یہ میرے دماغ زندہ رہیں

شفق یہ ماتھے کا جھومر نہیں تو پھر کیا ہیں
جبینِ شوق پہ روشن یہ داغ زندہ رہیں

پروین شیر۔ نیو جرسی (امریکہ)

سبھی رستے معطل ہیں

دریچے بند ہیں سارے
کہ شہرِ جاں کے دروازے مقفل ہیں
کہیں اس شہرِ جاں کے اندروں مخفی
مرے غم کے خزانے ہیں
جہاں محفوظ ہیں اشکوں کے گوہر بھی
مری آہوں کے ہیرے اور زُمرد بھی
یہاں یادوں کی قندیلیں
جو رہ رہ کر بھڑکتی ہیں
وفورِ درد سے اکثر
دھواں دیتی ہی۔۔۔جیسے بجھ ہی جائیں گی
فصیلِ شہر اونچی ہے
وہاں تک کیا رسائی ہو؟
مری آہیں
کسی بابِ اثر تک کوئی رستہ بھی نہیں پاتیں
کہ شہرِ جاں کے دروازے مقفل ہیں
سبھی رستے معطل ہیں

تابوت

گہرے بادل کی پھٹی چادر میں
سو گیا ہے ابھی سورج تھک کر
ایک چڑیا ہے سرِ شاخِ شجر
سوچ میں گم نڈھال بیٹھی ہے
ہچکیاں لیتی ہیں یخ بستہ ہوائیں باہر
بند کمرے کی گھٹن، جیسے ہو تابوت کوئی
جس کی اک کھڑکی یہ احساس دلاتی ہے
کہ میں زندہ ہوں
پا بہ زنجیر شب و روز کے غم خانے میں
تک رہی ہوں میں خلاؤں میں نہ جانے کب سے
بے کراں سوچ کی اک دھند ہے چاروں جانب
آہ بھرتے ہوئے لمحوں کی تڑپ
شیشۂ دل پہ برستے ہوئے پتھر آنسو
کوئی تو مجھ کو نکالے مرے تابوت سے آج

استقبالیہ نظم

محمد اویس جعفری، سیاٹل۔ (امریکہ)

علی سردار جعفری

نوے کی دہائی میں علیگڑھ اولڈ بوائز کے منعقد کردہ عالمی مشاعرہ میں بہ حیثیت ناظم میں نے ان اشعار سے صدر محفل جناب علی سردار جعفری کو دعوتِ سخن دی۔ مرحوم نے امریکہ میں منعقدہ دوسرے مشاعروں کے مقابلہ میں منظوم نظامت کے حوالہ سے سیاٹل کے اس مشاعرہ کو امتیازی قرار دیا۔

اوجِ گماں سے بلند، تیری نظر کی کمند — تیری زباں فتح مند، تیرا کلام ارجمند

جس کی روانی میں ہے سندھ اور جہلم کا زور — گنگ و جمن کی ادا، ستلج و راوی کا شور

لہجۂ کیفیؔ کبھی اور کبھی اندازِ جوشؔ — تو کبھی طوفاں بہ لب، تو کبھی مینا بدوش

فیضؔ کے نغموں کا ہو جیسے سرور و خمار * — گاہ ہے شورِ نشور، گاہ سکون و قرار

درد و الم پیچ و تاب، جیسے ادائے مجازؔ — تیری صدا میں ہے سوز، تیری نوا میں گداز

کعبۂ علم و ادب، خانقہہ فکر و فن — درس گہہ ذی وقار، روحِ سیّد کا چمن

عارضِ مہتاب دام، کاکلِ خورشید گیر — تو بھی اُسی کا اسیر، میں بھی اُسی کا اسیر

بندۂ مزدور کا تو ہے سدا سے حلیف — تو ہے کسانوں کا دوست، بندۂ زر کا حریف

رنگ کا شہکار بھی، پھول کی مہکار بھی
تو ہے سر دار بھی اور ہے سردار بھی

☆ یہاں 'سرور و خمار' کے الفاظ کی ذو معنویت بھی قابل تحسین ہے کہ ان سے مراد اردو غزل کے دو معروف و مقبول شعراء یعنی خمار بارہ بنکوی اور سُرور بارہ بنکوی کی طرف ذہن منتقل ہوتا ہے (ادارہ)

رشید آفرین

ملاقات

آج دیکھا ہے بڑی مدت کے بعد
میری آنکھوں نے تجھے پھر ایک بار
دیکھتے ہی پھر نظر میں پھر گیا
عہد ماضی کا وہ نقشہ شاندار

مثلِ آئینہ وہ میرے رو برو
خواب تھا گویا کہ تعبیر آشنا
میرے فکر و فن کی یا تخلیق تھی
جس میں خونِ دل تھا گویا بھر دیا

پھر وہی احساس کے اُٹھتے قدم
وقت کے دھارے کے رُخ کو موڑ کر
فاصلہ برسوں کا طے کرنے لگے
پردۂ وقت و مکاں کو پھاند کر

اس طرح فرحان و شاداں دل رہا
جیسے مجھ کو مل گئی ہو زندگی
شمع تھی احساس کی روشن وہاں
اور غالب تیرگی پر روشنی

اس سے پہلے بھی تو دیکھا ہے تمہیں
ہو کے رسمِ بندگی سے بے نیاز
تم تصور میں رہی ہو جلوہ گر
بن گئی ہو سر بسر تصویرِ ناز

کس کو لیکن یہ خبر تھی ہم نشیں
چھین لے گی گردشِ لیل و نہار
قہقہے، وہ زمزمے، وہ شوخیاں
اور لٹ جائے گی پھر فصلِ بہار

کتنا دل آویز تھا میرے لئے
وہ ترا حسنِ تبسم اور ادا
گوہرِ لب اور چشمِ نیلگوں
مرمریں پیکر پہ وہ زلفِ رُسا

ناگہاں آئی ہوائے روز گار
دیپ سارے آرزو کے بجھ گئے
کھو دیا میں نے تمہیں جیسے کوئی
خود ہی دامن زندگی کا چھوڑ دے

وہ سماں وہ موسمِ گل وہ چمن
وہ فراغت اور وہ تنہائیاں
وہ تکلم، وہ تبسّم، وہ نگہ
الاماں وہ حسن کی انگڑائیاں

اور پھر مثلِ ہوائے راہگذر
گم ہوا میں گردشِ دوراں کے ساتھ
گاہ مجھ کو زندگی کی جستجو
گاہ میری جستجو میں تھی حیات

ہو شب تیرہ مقدر میں اگر
زندگی کی پھر سحر ہوتی نہیں
خود بدل ڈالے مقدر کی روش
اس قدر تاب بشر ہوتی نہیں

تم ہو گیا اک چمن کی تیتری
ہر چمکتے رنگ سے ہے تم کو پیار
تم نے یہ بستی دلوں کی چھوڑ کر
چن لیا ہے پتھروں کا اک دیار

گو کہ میں بازیچۂ حالات تھا
یاد سے تیری نہ غافل رہ سکا
دل کی دھڑکن سب کو ہی معلوم ہے
ہو نہیں سکتی کبھی دل سے جدا

آج پھر اس طرح میرے سامنے
تم کھڑی ہو سوگوار و شرمسار
تم رہی ہو پیار سے نا آشنا
اب وفا بھی بن گئی ہے تم پہ بار

ایک تم ہو مجھ کو بھولے سے کبھی
کیسے ممکن ہے کیا ہو یاد بھی
زندگی پر ہو ازل سے تم فدا
تم پہ مرتی ہے ازل سے زندگی

تم کو اتنی بھی خبر ہے کس لئے
پھر اسی در پر چلا آیا ہوں میں
دل لٹا کر اپنے ہاتھوں آج پھر
جانے اپنے ساتھ کیا لایا ہوں میں

یا سمجھ لو آگیا ہوں آج میں
زخمِ دل کو تازہ کرنے کے لئے
ذہن کی مٹتی ہوئی تصویر میں
تم سے لے کر رنگ بھرنے کے لئے

اویس الحسن

مرا وطن

جو پھول بن کر کھلا ہوا ہے
مرا وطن ہے، مرا وطن ہے

نظر کسی کی لگے نہ اس کو
جہاں سے پیارا مرا چمن ہے
نظیر اس کی نہیں کہیں بھی
زمین اس کی مرا گگن ہے!

ستارے اس کے چمک رہے ہیں
زمین اس کی ہری بھری ہے
بہار اس کی گلی گلی ہے
عظیم اس کی گھڑی گھڑی ہے

اٹھا رہا ہے نقاب سورج
طلوع کا وقت آگیا ہے
ہر ایک دن میں ہزار لمحے
ہر ایک لمحہ وفا ہوا ہے

یہ میری مٹی کے سب جیالے
عظیم اس کو بنا رہے ہیں
فلک سے اُترے ہوئے ہیں قدسی
جبیں وطن کی سجا رہے ہیں

محبتوں کے چمن کھلے ہیں
اخوتوں کی صبا چلی ہے
خدا نے ہم کو عطا کیا ہے
سو پاک اس کی کلی کلی ہے

نہیں تعصب کی بُو ذرا بھی
ہر ایک دل میں وفا بھری ہے
مرے وطن کی عظیم مٹی
ہر ایک جھولی ہری بھری ہے

خدا کی روشن دلیل ہے یہ
زمانے بھر میں جلیل ہے یہ

اویس الحسن

پاک فوج کے بہادر جوانوں کے نام!

مرحبا مرحبا، میرے فوجی جواں
ہو وطن کی امانت کے تم پاسباں

میرے غازی جواں، عظمتوں کے نشاں
ہے شہیدوں کے خوں سے بہارِ وطن
کہکشاں کہکشاں ہیں نشانِ قدم
ان کی خوشبو بسی ہے چمن در چمن

مرحبا مرحبا، میرے فوجی جواں
ہو وطن کی امانت کے تم پاسباں
میرے فوجی، وطن کے محافظ، تجھے
نذر کرتا ہوں دل کی سبھی دھڑکنیں

عزم وہمت کا پرچم سنبھالے ہوئے
اور کمندیں ستاروں پہ ڈالے چلیں
مرحبا مرحبا، میرے فوجی جواں
ہو وطن کی امانت کے تم پاسباں

پیارا پیارا وطن، میرا پیارا وطن
جگمگاتا رہے نورِ ایمان سے
منزلوں کے سفر پر ہوئے گامزن
میرے اہلِ وطن پورے ایقان سے

مرحبا مرحبا، میرے فوجی جواں
ہو وطن کی امانت کے تم پاسباں

سنسناہٹ نہ ہو گولیوں کی کوئی
اور نہ بارود کا اب یہاں ہو دھواں
ہر طرف باغِ ہستی مہکتا رہے
خوشبو پھیلی رہے اب یہاں سے وہاں

مرحبا مرحبا، میرے فوجی جواں
ہو وطن کی امانت کے تم پاسباں

گیت گاتی رہے امن کی فاختہ
پھول کھلتے رہیں دل کی تسکین کے
پھر ترقی کی خوشبو سے مہکے فضا
اور جوبن پہ اپنا چمن یہ رہے

مرحبا مرحبا، میرے فوجی جواں
ہو وطن کی امانت کے تم پاسباں

بے گھروں کے سروں پر ہو تم سائباں
بے کسوں کے دکھوں کا سہارا ہو تم
جن کی آواز میں کوئی دم خم نہیں
ان کی فریاد کا بھی مداوا ہو تم

مرحبا مرحبا، میرے فوجی جواں
ہو وطن کی امانت کے تم پاسباں

اے بہادر جوانو! تمہاری قسم
رشک کرتی ہے اس سرزمیں پہ گگن
تارے اُگتے ہیں دیکھو چمن در چمن
چاند بن کر دمکتا ہے نامِ وطن

مرحبا مرحبا، میرے فوجی جواں
ہو وطن کی امانت کے تم پاسباں

صابر عظیم آبادی

رباعیات

پتھر ہی نہیں لعلِ گراں ملتا ہے
بازارِ جہاں میں یہ جہاں ملتا ہے
کیا چیز نہیں ملتی ہے اس دنیا میں
ہر نوع کا سامان یہاں ملتا ہے

☆☆☆

آفاق سے مربوط ہے جن کا رشتہ
آسان نہیں توڑنا ایسا رشتہ
اک دوسرے سے اس کو الگ مت سمجھو
گردوں سے زمین کا ہے گہرا رشتہ

☆☆☆

کہتے ہیں جسے حرفِ وفا یاد نہیں
کیا چیز ہے تسلیم ورضا یاد نہیں
اُس شخص کو انسان کہوں میں کیسے
آسودگی میں جس کو خدا یاد نہیں

☆☆☆

اپنوں سے عداوت نہیں اچھی لگتی
غیروں سے شکایت نہیں اچھی لگتی
مِل جُل کے ہی رہنے میں بھلا ہے سب کا
دنیا سے بغاوت نہیں اچھی لگتی

☆☆☆

بدلی نہ کبھی رسم پرانی اپنی
عشرت میں لٹا ڈالی جوانی اپنی
آنکھوں میں ندامت کے تھے آنسو اتنے
لکھی نہ گئی مجھ سے کہانی اپنی

☆☆☆

اب حسن کا جادو نہیں چلنے والا
حالات کا منظر ہے بدلنے والا
کیوں شب کی سیاہی کا ہے ماتم گھر گھر
کچھ دیر میں ہے چاند نکلنے والا

☆☆☆

دشمن مرے پہلو میں رہا کرتے ہیں
ہر وقت اذیت وہ دیا کرتے ہیں
جو بات بھی کہنی ہے کہو آہستہ
دیواروں کے بھی کان ہوا کرتے ہیں

☆☆☆

ہر کام کا اک وقت مقرر کر لو
پھر اپنے ارادوں کو مؤثر کرلو
گر چھوڑنا ہے نقش کوئی پیچھے تو
اس عالمِ فانی کو مسخر کرلو

☆☆☆

نقد و نظر

کتاب سچ سمندر (آپ بیتی)

مصنف ایڈمرل افتخار احمد سروہی

مترجم مجاہد لاہوری

فلیپ نگار مظفر محمد علی

تبصرہ سید منصور عاقل

ناشر میر شکیل الرحمٰن (جنگ پبلشرز) سر آغا خان روڈ، لاہور

قیمت ۴۵۰ روپے

زیر نظر کتاب (انگریزی متن) کے مصنف ایڈمرل افتخار احمد سروہی کا نام پاکستان کی عسکری تاریخ کے اُن اسمائے گرامی میں شامل ہے جنھیں ہمیشہ عزت و تکریم سے دیکھا گیا۔ اُن کا انفرادی اختصاص یہ ہے کہ اُن کے مشاہدات و تجربات اُنکی بیش بہا صداقت و بصیرت کا مُرقع ہیں اُن کے فاضل مترجم مجاہد لاہوری نے اِنھیں صفات کے پیشِ نظر حکیم الامت حضرت علامہ اقبالؒ کا درج ذیل شعر نذر کر کے خراجِ تحسین پیش کیا ہے:

وہ سحر جس سے لرزتا ہے شبستانِ وجود ہوتی ہے بندۂ مومن کی اذاں سے پیدا

کتاب کا زیرِ نظر اُردو ترجمہ جو اپنی روانی سلاست اور برجستگی کے اعتبار سے یقیناً ایک شاہکار ہے وہ فاضل مترجم کی انگریزی داُردو زبانوں پر قابلِ تحسین گرفت اور قادر الکلامی کا آئینہ دار ہے جبکہ انگریزی اور اُردو نام یعنی ''TRUTH NEVER RETIRES'' اور ''سچ سمندر'' فلیپ نگار جناب مظفر محمد علی کے تجویز کردہ ہیں جو پانچ سو سے متجاوز صفحات پر مشتمل کتاب کی برملا اور ایمان افروز سچائیوں کے امین ہیں۔ محترم فلیپ نگار نے اپنی مختصر تحریر میں گویا

سمندر کو کوزہ میں اس طرح بند کردیا ہے کہ مصنف کی خودساختہ (self-made) زندگی کے تمام نشیب وفراز اور قابلِ ذکر واقعات کا نہایت سادہ وقابلِ فہم الفاظ میں احاطہ کرلیا گیا ہے۔ جن کی تفصیلات کا مطالعہ جناب سروہی کی دل ودماغ کی صلاحیتوں، نظم ونسق پر دسترس، مشکل حالات میں دانشمندانہ فیصلے اور دوررس مثبت نتائج پر مشتمل اقدامات کرنے کے علاوہ اُنکی فرض شناسی، قوتِ ایمانی نیز وطن سے لازوال محبت پر مُہر تصدیق ثبت کردیتا ہے۔ وہ خودنگاشتہ وپیش لفظ میں فرماتے ہیں:

"کم گوئی ہمیشہ سے میرا شیوہ رہا ہے۔ میں نے اپنے مشاہدات وتجربات کو ایک قومی امانت سمجھتے ہوئے دوسروں تک پہنچانا ضروری سمجھا تاکہ آئندہ نسلیں اُن سے استفادہ کرسکیں۔ مجھے آرام وآسائش اور دولت وثروت سے بے نیازی باپ کی طرف سے اور مستقل مزاجی وثابت قدمی ماں کی طرف سے ورثہ میں ملی"

خودنوشت سوانح کو پانچ حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے جو تیس ابواب کا احاطہ کرتے ہیں اور کم وبیش نصف صدی کی قومی وبین الاقوامی تاریخ کی جھلکیاں بھی لیے ہوئے ہیں اور نسل آئندہ کے لئے ایک سبق آموز دستاویز بھی ہے مزید یہ کہ کتاب کے مجموعی تاثر کو اگر اور بھی اختصار سے بیان کیا جائے تو پاکستان کے عظیم آرٹسٹ، مفکر اور شاعر صادقین مرحوم کا درج ذیل شعر صاحبِ کتاب کی مرکزی فکر کا ترجماں کہا جاسکتا ہے۔

میں کیا ہوں، کون ہوں، انسانِ عہد حاضر ہوں ترقی کی حدِ آخر پہ خودکو دیکھتا ہوں

کتاب کے 'انتساب' کو اگر حرفِ اول قرار دیا جائے تو اسے مصنف کی حُب الوطنی کا 'محضرنامہ' اور کتاب کے حرف آخر کو 'مُہر تصدیق' کہا جاسکتا ہے۔ ملاحظہ ہو:

حرفِ اوّل۔ "میں اپنی اس اولین علمی کاوش کو اُن سب کے نام منسوب کرتا ہوں۔

جنہوں نے اس کی تخلیق کے دوران جام شہادت نوش کیا اور جو اُس کے قیام کے وقت سے اُس کے دفاع کا مقدس فریضہ ادا کررہے ہیں۔"

حرفِ آخر۔ ''افواجِ پاکستان زندہ باد، پاکستان پائندہ باد''

کتاب کا مطالعہ قاری کو یہ بھی باور کرا دیتا ہے کہ مصنف نہ صرف کثیر الجہت شخصیت رکھتے ہیں بلکہ ہر جہت ان کے کامل و اکمل ہونے کے برملا شواہد بھی مہیا کرتی ہے۔ مجھے سب سے زیادہ تحقیق و جستجو پر مصنف کی دسترس نے متاثر کیا ہے جس کا آغاز یوں ہوا کہ اُنھوں نے اپنے سب سے چھوٹے بیٹے کی زبان سے درجہ چہارم کی تاریخ کی کتاب میں درج ذیل جملہ سنا اور ''ماضی کے دریچوں میں'' کھو گئے۔

''راجپوت لڑاکا، بڑے فخر کرنے والے اور خود پسند ہوتے ہیں''

چنانچہ آباء و اجداد کے 'راجپوت' ہونے کے حوالے سے حسب نسب کے سلسلوں کی تلاش و جستجو اور اُن کی صفات و خصوصیات پر تحقیق شروع کر دی جس کے ہر مرحلے کی تائید و توثیق مصدقہ دستاویزات یا معتبر شہادتوں سے ہوتی ہے جن کے مطابق ''پنجاب کے سروہی راجپوتوں کی ابتداء ہندوستان کے صوبہ راجستھان میں واقع ریاست 'سروہی' سے ہوئی۔ راجپوتوں نے مفتوحہ علاقوں میں کئی ریاستوں اور شہروں کی بنیاد رکھی۔ چنانچہ شہر دہلی کی بنیاد ایک 'طومار' راجپوت کے ہاتھوں 'دھلیکا' کے نام سے رکھی گئی۔ کم و بیش پانچ سو سال پیشتر ریاست سروہی کے دو شہزادوں نے اسلام قبول کیا۔ موجودہ نسل راجہ سروہی کے بڑے بیٹے کی اولاد کا تسلسل ہے'' بعد از آں فاضل مصنف سے دورانِ ملازمت خیر پور (سندھ) سے ایک وفد ان سے ملنے آیا جس نے خود کو 'سروہی' ظاہر کیا۔ اور اُنھیں اپنے گوٹھ 'سروہی' آنے کی دعوت دی جہاں اُنھوں نے مصنف کی روایتی دستار بندی کر کے اپنے قبیلے میں شامل کر لیا۔ ۱۹۹۱ء میں مصنف دوسرے بار بھی اپنے فرزند اسد کے ہمراہ گوٹھ 'سروہی' گئے۔ انھوں نے اپنی اس تحقیق کے ضمن میں ''پنجاب و سرحد کے قبائل کی فرہنگ'' مرتبہ سرڈینیل ایبٹ سن (۱۸۸۸ء) سے درج ذیل اقتباس پیش کر کے اپنی وسیع النظری اور عالی ظرفی کا ثبوت ان الفاظ میں تاریخ کے حوالے کر دیا کہ ''ایبٹ سن کی رائے مثالی۔ انتہائی وسعتِ نظری پر مبنی اور ہر لحاظ سے جامع ہے۔'' ملاحظہ ہو اقتباس:

''پنجاب کے راجپوت بڑے بہادر ہیں۔ اپنے خون کی پاکیزگی پر فخر کرنا اُن کی سب سے بڑی خصوصیت ہے وہ کاشتکاری میں نکمّے۔ کاہل اور کمزور ہوتے ہیں زراعت کے مقابلہ میں گلہ بانی سے متعلق سرگرمیوں کو ترجیح دیتے ہیں۔ ہاتھ سے کام کرنے کو عار اور باعث شرم سمجھتے ہیں۔ ہل چلانا اُن کے نزدیک کسرِ شاں اور ہتک آمیز کام ہے۔ پنجاب کے اکثر علاقوں میں وہ آبائی پیشے کے لحاظ سے مویشی چور ہیں۔ تاہم اس بُرے پیشے کو انتہائی شریفانہ انداز میں انجام دیتے ہیں اور راجپوت چوروں میں یقیناً ایک بانکپن پایا جاتا ہے۔''

کتاب کے پانچویں باب تک سروہی صاحب نے اپنے بچپن۔ اوائل عمری۔ ابتدائی تعلیم و تربیت اور ۱۹۴۷ء کے پُر آشوب حالات کا ذکر نہایت جامعیت سے کیا ہے اُن کے والدِ محترم کی ضلع کرنال کے ایک گاؤں میں جو دریائے جمنا کے نزدیک پنجاب اور یو پی کی سرحد پر واقع تھا۔ ولادت۔ مسلم ہائی سکول پانی پت میں ابتدائی رسمی تعلیم کے آغاز (۱۹۴۳ء) انگریزی زبان کی تدریس۔ ۱۹۴۷ء میں آٹھویں جماعت کے وظیفے کے امتحان میں کامیابی اور اس سے قبل ۱۹۴۶ء کے عام انتخابات میں سکول کے طلباء کے ساتھ تحریک پاکستان میں بھرپور شرکت، نصابی سرگرمیوں میں آٹھویں اور اوپر کی جماعتوں میں قرآن حکیم کی تعل[illegible] یز، مسجد میں باقاعدہ نماز کی ادائیگی جہاں طلباء کی حاضری لگائی جاتی تھی، نیز دیگر واقعات کا احا[illegible] کیا ہے جن میں مسلمان آبادیوں پر ہندوؤں کے حملے اور مسلمانوں کا بے دریغ قتل عام، پاکستان کے لئے روانگی۔ میرٹھ (یو۔ پی) سے بذریعہ ٹرین براستہ سہارنپور، انبالہ، لدھیانہ، جالندھر اور امرتسر کے بعد ۳۱ اکتوبر ۱۹۴۷ء کو داتا کی نگری لاہور کے والٹن کیمپ پہنچنا اور یہاں بھی ہندوستان سے آنے والے ستم رسیدہ مہاجرین کی آبادکاری میں جنھیں والٹن ٹریننگ سکول میں ٹھہرایا گیا تھا نوعمر افتخار احمد سروہی کی بحیثیت رضا کار شب و روز کی بھاگ دوڑ کے ساتھ قابلِ مطالعہ دیگر تفصیلات بھی شامل ہیں جن کا نئی نسل کو ادراک ہونا نہایت ضروری ہے۔

کتاب کے مزید پانچ ابواب مصنف کی آزمائشوں میں حوصلہ مندانہ سرخروئی اور مستقبل کے ایک عظیم کردار کی تشکیل و تعمیر کے احوال پر مشتمل ہیں جو کچھ اس طرح ہیں کہ پاکستان آمد کے بعد بے کس انسانوں کے مناظر نے نوعمر سروہی کو احساسِ محرومی کے بجائے ایک 'ولولۂ تازہ' عطا کیا۔ چنانچہ اخبار میں اشتہار دیکھ کر مارچ ۱۹۵۱ء میں بحریہ میں ملازمت کی درخواست اور اگلے ماہ اپریل میں ایف۔ ایس۔ سی کا امتحان بھی دے دیا۔ انٹرویو کیلئے کوئٹہ پہنچنے کا حکم ملا اور کوئٹہ ہی میں بحریہ کی پری انجینئرنگ برانچ کے لئے جوائنٹ سروسز پری کیڈٹ ٹریننگ سکول کوئٹہ میں داخلے کے ساتھ ہی بحریہ میں ایک طویل اور من پسند کیریئر کی ابتداء ہوئی۔ بحرِ روم میں چار ماہ کے سخت ترین تربیت کے مراحل سے گزر کر پاکستان واپسی پر اگست ۱۹۵۵ء میں 'ایکٹنگ سب لیفٹیننٹ' کے عہدہ پر ترقی حاصل کی۔ تربیت کا عمل جاری رہا اور ۱۹۵۶ء میں مختلف کورسوں کے لئے برطانیہ روانگی اور وطن واپسی پر ۱۹۵۷ء میں تربیت مکمل ہونے پر سمندر میں نگرانی کا اہل ہونے کے سرٹیفکیٹ کے حصول کا اعزاز حاصل کیا۔

اس کے بعد ایک نئے دور کا آغاز ہوتا ہے اور تربیتی عمل کے تیز رفتار سفر میں کامرانیوں کے بعد ۱۴ ستمبر ۱۹۶۴ء سے ازدواجی زندگی شروع ہوتی ہے اور مسٹر اور مسز زرینہ سروہی برطانیہ کے سفر پر جسے 'ہنی مون' بھی کہا جا سکتا ہے روانہ ہوتے ہیں اور مختلف ممالک کی سیر و سیاحت کے بعد ۲ مئی ۱۹۶۵ء کو وطن عزیز واپس پہنچتے ہیں لیکن ۶ ستمبر کی صبح بھارتی حملے کے ساتھ ہی جنگ کا بگل بج جاتا ہے۔ اس دوران 'غازی آب دوز' پر خدمات اور تاریخی واقعات کا ذکر ملتا ہے جن میں جنرل یحییٰ خاں کے ہاتھوں ۱۹۶۲ء کے دستور کی منسوخی اور دسمبر ۱۹۶۷ء میں ملک میں عام انتخابات کا انعقاد نیز ۱۹۶۷ء کی عرب اسرائیل جنگ کا تجزیہ۔ ۱۹۷۱ء میں دوسری پاک بھارت جنگ۔ مشرقی پاکستان میں قابلِ فخر خدمات۔ اعلانِ تاشقند کے مابعد کے حالات کے منظر و پس منظر کا احوال نیز مصر سے واپسی پر بحیثیت 'ڈائریکٹر نیول آپریشنز' اور ۱۹۸۰ء میں 'ڈائریکٹر جنرل نیول ٹریننگ' مقرر ہونے تک قومی اور بین الاقوامی منظر نامہ میں ایک نہایت متحرک کردار کی ادائیگی۔

'بیچ سمندر' جہاں ایک محبِ وطن سپاہی۔ صاحب بصیرت شہری اور ملک میں اعلیٰ عسکری مناصب پر فائز ہمہ جہت شخصیت کی داستانِ حیات ہے بلکہ پاکستان کے نصف صدی سے زیادہ سیاسی۔ سماجی۔ معاشی مدوجزر پر مشتمل صداقت نامہ ہے اور آئندہ نسلوں کو کردار سازی کا درس بھی ہے۔ ایڈمرل سروہی نے ۱۹۸۰ء میں بحیثیت 'ڈائریکٹر نیول ٹریننگ' مقرر ہونے اور ۱۹۸۱ء میں 'ریئر ایڈمرل' کا منصب سنبھالنے سے ۱۹۸۷ء میں 'نیول چیف' کے مرکزی مقام تک اپنی مثالی کارکردگی کے جو نقوش ثبت کئے ہیں ان کا مطالعہ قاری کے ذہن میں ان کا مرتبہ اور بھی بلند کر دیتا ہے۔ بحیثیت نیول چیف ۱۹۸۷ء میں ان کا دورۂ سیاچن بظاہر اُن کے منصب سے غیر متعلق دکھائی دیتا ہے مگر حقیقت میں ملک کے مجموعی دفاعی منظر نامے میں اُن کی ناگزیر اہمیت کی بھی نشان دہی کرتا ہے جس کا ثبوت تینوں افواج کی مشترکہ منصوبہ بندی کرنے اور اُن کے عملی انعقاد کی صورت میں اُن کے کیریئر کی اہم سمت سے ملتا ہے۔

مصنف نے اپنے عہد ملازمت کے دوران کرپشن کو بیخ و بُن سے اکھاڑ پھینکنے کے جرأت مندانہ اقدامات نہایت برملا انداز میں کئے چنانچہ شپ یارڈ اور ایک بیرونِ ملک ایجنسی کے درمیان پندرہ لاکھ ڈالر کی ایک ڈیل کا قبلہ درست کرنے کا سہرا بھی مصنف کے سر ہے۔ موصوف نے نیول ہیڈکوارٹرز میں ایجنٹوں کے داخلے پر پابندی عائد کر دی۔ صدر مملکت اُن کے اعلیٰ کردار سے بیحد متاثر ہوئے اور اس طرح سروہی صاحب ۱۰ اپریل ۱۹۸۶ء کو چیئرمین جوائنٹ چیفس آف سٹاف کمیٹی کے منصب پر فائز ہو کر اپنے کیریئر کے نقطۂ عروج کو پہنچے۔ جولائی ۱۹۸۶ء میں امریکہ، فرانس اور چین کا دورہ کیا اور یہ سب فیضان تھا خود اپنے ہی مقرر کردہ 'معیار' کا جو ان کے بعد آنیوالوں کے لئے 'رہنما اصولوں' کا درجہ رکھتے ہیں۔ وہ اپنی کتاب کے صفحہ ۳۰۲ اور ۳۰۳ پر لکھتے ہیں:

''ایک سروس، تنظیم بلکہ ملک کے سربراہ کو ایسے ہی مسائل درپیش ہوتے ہیں۔ محض ان کی جسامت میں فرق ہوتا ہے۔ آدمی اور فیصلہ سازی دو اہم معاملات ہیں جن سے ہمیں ہر روز واسطہ پڑتا ہے ان تقاضوں سے عہدہ برآ ہونے کے لئے تعلیم، تربیت،

تجربہ، تاریخ اور مطلوبہ کام کو انجام دینے کا عزم وہ چند لازمی صفات ہیں جن کا ہونا ضروری ہے۔۔۔لیڈر کو اقتدار کے ہر پائیدان پر غیر مرئی اضافی بوجھ اُٹھانا پڑتا ہے اس میں وزن تو ہوتا ہے۔لیکن اس وزن کو تولا نہیں جاسکتا۔اختیارات کی شہ نشین تک پہنچتے ہوئے اس بوجھ میں اضافہ ہوتا جاتا ہے اس بوجھ کو برداشت کرنے کے لئے لیڈر کو جسمانی لحاظ سے مضبوط اور ذہنی طور پر ہوشیار و بیدار ہونا چاہیے۔''

۱۱ اکتوبر ۱۹۸۸ء کو ریٹائرمنٹ سے پہلے مصنف نے وفد کے سربراہ کی حیثیت سے انڈونیشیا کا اہم دورہ کیا اور چین کا دس روزہ دورہ ۲۷ مارچ تا ۷ اپریل ۱۹۸۸ء جن تاثرات کا حامل رہا اُس کی 'الہامی' پیش گوئی کی عملی صداقت آج ہمارے سامنے ہے۔ صفحہ ۳۳۳ سے اقتباس ملاحظہ ہو:

''چینی ہمارے بہی خواہ اور مخلص دوست ہونے کے ساتھ ساتھ ہم نے ماضی میں جو اُن کے ملک کی مدد کی تھی۔اُس کے لئے اب بھی ممنون و شکر گزار ہیں۔ان کو علم حاصل کرنے اور خود کو غریب سمجھنے میں کوئی عار نہیں۔وہ بڑی تیز رفتاری سے سائنس اور ٹیکنالوجی میں آگے بڑھ رہے ہیں۔آئندہ صدی ان کی ہوگی۔ ہمارے لئے چین کے ساتھ طویل المعیاد تعاون کرنا ضروری ہے۔''

مصنف کے کیریئر میں متعدد ممالک کے سرکاری دوروں کی اہمیت و افادیت خاص طور پر نمایاں ہے۔ان دوروں میں ایک اہم دورہ جنوبی کوریا کا تھا جو مکمل نہ ہو سکا کیونکہ دورانِ سفر ہی جنرل ضیاء الحق کے طیارہ کو حادثہ پیش آنے کی خبر ہانگ کانگ میں آدھی رات کو ملی اور درمیان ہی سے واپس اسلام آباد پہنچنا پڑا۔ (صفحہ ۳۴۳)۔مصنف اس حادثہ کو سازش کا نتیجہ قرار دیتے ہیں۔ وہ رقمطراز ہیں (صفحہ ۳۴۷)

''یہ حادثہ ایک بین الاقوامی سازش تھی۔جس کی اچھی طرح منصوبہ بندی کی گئی تھی۔اسے مقامی لوگوں نے طویل المعیاد پلاننگ کے ذریعہ پایۂ تکمیل تک پہنچایا۔۔۔ایک وزیرِ مملکت

نے حادثہ کے سوال پر جواب دیا کہ اللہ سے رابطہ کریں۔ اس کا سبب وہی بتائے گا"

کتاب کا بیسواں باب بعنوان 'سروہی افیئر' خصوصی اہمیت کا حامل ہے جو ملک میں سیاسی ریشہ دوانیوں کے حوالے سے تاریخی اہمیت کے انکشافات پر مشتمل ہے۔ چند جھلکیاں:

"چیف آف سٹاف کمیٹی کا باقاعدہ اجلاس ۲۰ دسمبر ۱۹۸۸ء کو ہونے والا تھا۔ آرمی چیف نے مجھ سے آدھ گھنٹہ پہلے آنے کی اجازت چاہی تاکہ تنہائی میں بعض مسائل پر تبادلۂ خیال کیا جاسکے۔ وہ خاصے برہم اور خفا لگ رہے تھے۔۔۔ اُنھوں نے مجھے بتایا کہ حکومت مجھے اوپر کی طرف چلتا کر کے میری جگہ اُنھیں لانے کا منصوبہ بنا رہی ہے۔۔۔ وہ اپنی پسند کا آرمی چیف لانا چاہتے ہیں،۔۔۔ آرمی چیف سنجیدہ تھے اور وہ۔۔۔۔ چیئرمینی کے عوض اپنا عہدہ چھوڑنے پر آمادہ نہیں تھے۔۔۔ آرمی چیف کے اس انکشاف کے بعد کہ حکومت اُنھیں میری جگہ لانے کی اور مجھے کسی اور عہدے پر لگانے یا گھر بھیجنے کا منصوبہ بنا رہی تھی میں نے ۲۳ جنوری ۸۹ء کو صدر سے ملاقات کے دوران اس کا ذکر کیا۔۔۔ صدر نے اسے کسی منطق اور اتھارٹی کے بغیر قرار دے کر مسترد کر دیا۔۔۔"

بہرحال صدر نے ۶ اگست ۱۹۹۰ء کو حکومت کو برطرف کر دیا اور ملک و قوم کو مشکلات سے بچالیا۔

زیرِ تبصرہ تاریخی انکشافات پر مبنی کتاب جہاں مصنف کے صاحبِ کردار، دیندار اور عظیم محبِ وطن ہونے کے شواہد مہیا کرتی ہے وہیں ملکِ عزیز میں اخلاقی انحطاط، سیاست کا پستی کی بدترین حدوں تک گر جانا اور امن و امان کا لاوارث ہو جانا بھی ایک اندوہ ناک حقیقت ہے جس سے صرف مصنف ہی نہیں بلکہ ہر محبِ وطن شہری کا دل پارہ پارہ نظر آتا ہے۔

مصنف کی ملک و قوم کے لئے خدمات محتاجِ بیان نہیں اُنہیں نہ صرف وطنِ عزیز کے اعلیٰ ترین اعزازات کا شرف حاصل ہے جن میں ہلالِ امتیاز، نشانِ امتیاز اور ستارۂ بصالت شامل ہیں بلکہ اُن کی شخصیت اور اعلیٰ خدمات کے اعتراف میں متعدد اہم ممالک کے ایوارڈز بشمول

سعودی عرب کا شاہ عبدالعزیز میڈل، فرانس کی جانب سے ''ایوارڈ آف گرینڈ آفیسر''، انڈونیشیا سے ''جالا سینا اتامہ'' امریکہ سے ''لیجن آف میرٹ'' کوریا سے '' آرڈر آف نیشنل سیکورٹی میرٹ ایوارڈ'' اور تھائی لینڈ سے ''نائٹ گرینڈ کراس'' نمایاں ہیں۔ کتاب میں مسئلہ کشمیر سمیت دیگر اہم ملکی معاملات و مسائل پر کافی مواد موجود ہے جو کتاب کے بغور مطالعہ کا متقاضی ہے تاہم اختتام سے قبل صدر مملکت کے مصنف کے ریٹائرمنٹ کے موقع پر اُن کے چند تاثرات کا حوالہ دینا از بس ضروری ہے۔ اقتباسات ملاحظہ ہوں۔

''ایڈمرل افتخار احمد سروہی ملک اور قوم کی قابلِ ستائش اور نا قابلِ فراموش خدمت کے بعد ایسے منصب سے ریٹائر ہو رہے ہیں جو اعلیٰ ترین پیشہ ورانہ مہارت کے ساتھ ساتھ دل و دماغ کی ارفع ترین خوبیوں کا تقاضا کرتا ہے۔۔۔ مجھے یہ کہنے میں قطعی باک نہیں کہ ایڈمرل سروہی ان اہم ذمہ داریوں کو انتہائی مستعدی کے ساتھ پورا کرنے کی اس قدر اعلیٰ مثال پیچھے چھوڑے جا رہے ہیں کہ اُن کے بعد عرصۂ دراز تک اُن کے نقشِ قدم پر چلنا کامیابی کی ضمانت سمجھا جائے گا۔۔۔ اُنھوں نے ایسی نمایاں خدمات انجام دیں کہ ان کی چھاتی فوجی اور غیر ملکی تمغوں اور اعزازات سے بھر گئی۔۔۔ میں ان کی فطری صلاحیتوں کا مداح رہا ہوں اور میں نے انھیں اپنا بہت قیمتی ساتھی سمجھا ہے اور آئندہ بھی سمجھتا رہوں گا۔''

کتاب : تاریخ ادبیاتِ اردو

مصنف : گارسیں دتاسی

ترجمہ : لیلیان سیکتین نازرو

مرتب : ڈاکٹر معین الدین عقیل

مبصر : ڈاکٹر جاوید احمد خورشید

ناشر : پاکستان اسٹڈی سینٹر۔جامعہ کراچی

قیمت : ۱۰۰۰ روپے

دتاسی کی 'تاریخ ادب اردو' تحقیق کے ضمن میں اس کی سب سے اہم تصنیف ہے جو اولاً ۱۸۳۹ء میں پیرس سے مجلس تراجم شرقیہ برطانیہ عظمیٰ و آئرلینڈ (Oriental Translation Committee, Great Britain and Ireland) کے زیر اہتمام شائع ہوئی۔اس کی پہلی جلد کا ذیلی عنوان 'سوانحات اور کتابیات' (Biographie et Bibliographie) سرورق پر درج تھا جس سے اس جلد کے موضوع اور مندرجات کی وضاحت ہوتی ہے۔دتاسی نے اس کا انتساب ملکہ برطانیہ کے نام کیا تھا۔پہلی جلد کے اختتام تک دتاسی اس حد تک اس کے لیے مواد جمع کر چکا تھا کہ وہ سارا دستیاب شدہ مواد اس جلد مین سمیٹ نہ سکا۔چنانچہ اس نے جب اس کتاب کو اشاعت کے لئے دیا تو اسے جلد اول قرار دینا مناسب سمجھا اور پھر مزید مواد کی فراہمی و ترتیب میں مصروف رہا۔حاصل شدہ مواد کو ترتیب دے کر اس نے دوسری جلد کے طور پر ۱۸۴۷ء میں شائع کر دیا۔لیکن یہ سلسلہ یہیں ختم نہیں ہوا۔وہ مسلسل مواد جمع کرتا رہا اور اسے اپنے خطبات کی صورت میں ہر سال مرتب اور پیش کرتا رہا۔پھر اس نے اپنی تاریخ کو اگلی جلدوں کی اشاعت سے بہتر یہی مناسب سمجھا کہ کل دستیاب مواد کو اب ایک مزید تاریخ کے طور پر مرتب کیا جائے۔اس طرح اس کی یہ تاریخ ۲۳ سال کے بعد تین جلدوں میں بہت قیمتی و تازہ اضافہ کے ساتھ ۱۸۷۰ء اور ۱۸۷۱ء میں فرانسیسی زبان میں شائع ہوئی۔

دتاسی ۲۰ جنوری ۱۷۹۴ء کو مارسیلز کے مقام پر پیدا ہوا۔وہیں ابتدائی تعلیم حاصل کی۔مارسیلز اس وقت آزاد بندرگاہ تھا اور مشرق کی توجہ کا مرکز بنا ہوا تھا۔جب دتاسی کو مشرقی زبانوں کے مطالعے کا شوق پیدا ہوا تو وہ ۱۸۱۷ء میں پیرس گیا تا کہ مشہور فرانسیسی مستشرق ایس دی ساسی کے خطبات میں شریک ہو سکے۔پیرس میں دتاسی نے عربی، فارسی اور ترکی زبانوں کی تعلیم حاصل کی۔

۱۸۲۴ء سے ایس دی ساسی ادارۂ علوم مشرقیہ کے ناظم مقرر ہوئے اور ان کی حوصلہ افزائی پر دتاسی کو ہندوستانی زبانوں کے مطالعے کی غرض سے انگلستان جانے موقع ملا۔ ایس دی ساسی اپنے ادارے میں ہندوستانی کا شعبہ قائم کرنے کے خواہاں تھے اور انھوں نے اس مقصد کے حصول کے لئے دتاسی کا انتخاب کیا تھا۔ دتاسی اپنے عہد کا پہلا کم عمر فرانسیسی مستشرق تھا جس نے فرانس میں علوم مشرقیہ کے مطالعے کی از سر نو تنظیم کی۔ دتاسی صحیح معنوں میں ایک اسکالر تھا، اس کی نگارشات سیاسی اور مادی مفادات سے پاک اور بے لاگ ہیں۔ اس کے دوستوں اور عزیزوں کے خاندان میں ایسی روایات اب بھی سننے میں آتی ہیں کہ وہ ایک خلوت پسند اور سنجیدہ شخصیت کا مالک تھا اور کتابوں کے علاوہ کسی چیز سے شغف نہ رکھتا تھا۔ اس کے دوست نامہ نگار دوسرے ملکوں سے اس کے پاس علمی وادبی معلومات، فہرست کتب، اخبارات، کتابیں اور رسالے بھیجتے رہتے تھے جن کی مدد سے دتاسی اپنے مضامین تیار کرتا تھا۔ ادارہ علم مشرقیہ پیرس کے کتب خانے میں دتاسی کی ایسی ذاتی کتابیں موجود ہیں جن کے حاشیوں پر اس کے ہاتھ کے لکھے ہوئے نوٹ موجود ہیں جس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ اپنی کتابوں میں نئی معلومات سمونے اور دوسرے ایڈیشن کو زیادہ مکمل بنانے کا خیال تھا۔ ہندوستان کے ادب، زبان، تمدن، ثقافت اور تاریخ سے ان کو دلچسپی تھی۔ دتاسی نے کبھی مشرق ملکوں کا سفر نہ کیا تھا اور دو تین مرتبہ انگلستان جانے کے سوا کبھی فرانس کے باہر قدم نہ رکھا۔ اس کے باوجود جب کبھی ہندوستانی پیرس سے گزرتے تو وہ ان سے ضرور ملتے تھے۔ اس کا انتقال ۲ ستمبر ۱۸۷۸ء کو ہوا۔ دتاسی کی ان تصانیف پر جن کا تعلق اردو زبان وادب سے ہے۔ مفصل معلومات ثریا حسین نے اپنے مبسوط مقالے بہ عنوان ''گارسین دتاسی: اردو خدمات، علمی کارنامے'' (۱۹۸۴) میں یک جا کر دی ہیں۔ ثریا سلطانہ نے اس کی تمام تصانیف وتالیفات کی ایک بہت جامع فہرست بھی اپنے، مقالے کے آخر میں شامل کردی ہے جن کی مجموعی تعداد ۱۵۵ ہے۔

دتاسی کی اس ضخیم تاریخ کو کئی حوالوں سے اہمیت حاصل ہے اردو کے ۲۸۶۰ مسلمان، عیسائی اور ہندو مصنفین اور شاعروں کے حالات زندگی اہم شاعرات کے تذکرے، انیسویں صدی کی صحافتی تاریخ، اردو اور ہندی کی اصناف شاعری پر بحث، علم بدیع وعروض کی اصطلاحات کی

وضاحت، اردو اور دیوناگری رسم الخط کی بحثیں، سنسکرت، عربی، فارسی اور انگریزی سے مترجمہ کتابوں کے تذکرے، عام ذہنی رجحانات اور دلچسپیوں کی صورت حال، مدرسوں اور کالجوں کے نصابات کی تفصیل اور ان سے وابستہ مقاصد کا احاطہ، کلکتہ، بمبئی اور مدارس کے اہم کالج ہی نہیں بلکہ معمولی معمولی اسکولوں کی صورتِ حال مستشرقین کی ضروریات کا احاطہ، دتاسی کے مآخذ کی تفصیلات یعنی تذکرے، دواوین، کلیات، قلمی نسخوں، مضامین، اخبارات، مراسلات اور ان پر مستزاد اس مترجم کا تعارف جس کے آخر میں دتاسی کے ان سالانہ خطابات کی مدد سے تیار کردہ کتب کی فراہمی جو اس نے ۱۸۵۰ سے ۱۸۷۷ کے درمیان دیے تھے اور مرتب کے معلوماتی اور مفید حاشیے اور تعلیقے کتاب میں شامل ہیں۔

دتاسی کی ان ضخیم جلدوں کا ترجمہ فرانسیسی مترجم لیلیان سکستین نازو نے پی ایچ ڈی کی سند کے حصول کے مقصد کے تحت ۱۹۶۰ء میں کیا جسے جامعہ کراچی نے اپنی ۱۹۶۰ء کی قرارداد نمبر ۱۰ کے تحت پی ایچ ڈی کی سند تفویض کرنے کی منظوری دی۔ نامور محقق اور عالم ڈاکٹر محمد حمید اللہ (۱۹۱۲۔۲۰۰۲) کی وجہ سے ان میں اردو زبان سے رغبت پیدا ہوئی اور انھوں نے اردو سیکھی اور پیرس کی سوربون یونیورسٹی اور ادارۂ السنہ شرقیہ سے فارغ التحصیل ہوئیں۔ نازو 'تعارف' کے ذیل میں لکھتی ہیں کہ 'ڈاکٹر حمید اللہ بھی میرے شکروسپاس کے مستحق ہیں، اس لیے اول اول موصوف ہی نے پیرس میں مجھے اردو پڑھائی اور انھیں کے خطبات کے ترجمے سے مجھے اردو زبان کا شوق پیدا ہوا۔ اس ترجمے کے سلسلے میں بھی انھوں نے دتاسی کی زندگی کے متعلق بعض ضروری معلومات فراہم کیں اور یہ بڑی مفید ثابت ہوئیں۔ مترجم نے کراچی یونیورسٹی کے شعبہ اردو سے بہ غرض حصول سند پی ایچ ڈی منسلک ہوکر یہ ترجمہ کیا، جس کے نگران ڈاکٹر ابواللیث صدیقی (۱۹۱۶۔۱۹۹۴) تھے۔ 'معروضات' کے ذیل میں پروفیسر ڈاکٹر معین الدین عقیل نے لکھا ہے کہ "بہ ظاہر کسی کتاب کا ترجمہ اس سند (پی ایچ ڈی) کے لیے قابل قبول نہ ہوسکتا تھا، اس لیے مترجم نے مصنف یعنی دتاسی کے بیانات کی تصدیق و توثیق کے لیے ہم عصر مآخذ سے اسناد پیش کرنے کی کوشش کی ہے اور مصنف نے جن مقامات پر معلومات تشنہ چھوڑ دی تھیں، کہیں کہیں وہاں متعلقہ

معلومات کو حواشی میں تحریر کیا ہے یا جن شاعروں کے اشعار کا حوالہ مصنف نے دیا تھا یا ان کے ترجمے فرانسیسی میں کیے تھے، لیکن اشعار نقل نہیں کیے تھے، مترجم نے متعلقہ مآخذ سے ایسے متعدد اشعار کو اخذ کر کے متن ہی میں انھیں شامل کر دیا ہے یا اگر وہ اشعار دست یاب نہ ہوئے تو وہاں معذوری ظاہر کر دی ہے۔ جہاں کہیں ضروری محسوس ہوا وہاں نثری عبارتیں بھی نقل کی ہیں۔ یہ سب مترجم کے کیے ہوئے ایسے اضافے ہیں جو اصل فرانسیسی متن میں موجود ہیں''۔

ناز رو نے لکھا ہے کہ دتاسی کا تحریر کردہ تفصیلی دیباچہ (ص ۴۷ تا ۸۸) ان خصوصیات کا حامل ہے جس پر درست طور پر تاریخ نویسی کا اطلاق ممکن ہے۔ 'اس میں دتاسی نے ہندوستانی زبان کے آغاز و ارتقا اور اردو دیوناگری رسم الخط پر بحث کی ہے۔ اس تاریخ کو لکھنے کا دتاسی کے سامنے ایک مقصد یورپ کو☆ ہندوستانی زبان سے آگاہ کرنا بھی تھا۔ اس کے خیال میں ہندوستانی زبان مذہبی، فلسفیانہ اور ادبی نقطہ نظر سے اہل یورپ کے لیے دل چسپ و مفید ہے۔ ہندوستانی ایک ایسی زبان ہے جسے ہندوستان کے بڑے رہنماؤں اور روحانی پیشواؤں نے اپنے خیالات کی تبلیغ و اشاعت کے لیے استعمال کیا ہے۔ اہم تاریخی کتابیں، تذکرے اور سوانح عمریاں بھی اسی زبان میں لکھی گئی ہیں'۔ ناز رو مزید لکھتی ہیں کہ 'کتاب دراصل تذکروں کے انداز پر تالیف کی گئی ہے۔ اس میں ہر مصنف پر الگ الگ مضمون لکھا گیا ہے اور اس کی تالیف یا تصنیف کا انتخاب بہ طور نمونہ کر دیا گیا ہے۔ یہ ایک قسم کی قاموس ہے جس میں مصنفین کے حالات درج کیے گئے ہیں۔ دتاسی نے اپنے دیباچے میں بتایا ہے کہ اگر مصنفین کا تذکرہ تاریخی ترتیب کے ساتھ کیا جاتا تو بہتر ہوتا لیکن بہت سے ایسے مصنفین تھے جنھیں تاریخی نقطہ نظر سے ترتیب دینا مشکل تھا اس لیے ان کا ذکر حروفِ تہجی کے اعتبار سے کیا گیا ہے'۔ اس میں مسعود سعد سلمان سے لے کر غالب کی وفات تک کے زمانے یعنی قریباً آٹھ صدیوں کا احاطہ کیا گیا ہے۔ عام طور پر اردو تذکرے

☆ 'ہندوستانی' نام کی کوئی زبان دنیا کے کسی ملک میں رائج نہیں رہی۔ ہندوستان میں منجملہ دیگر علاقائی زبانوں، اردو اور ہندی دو بڑی زبانیں تھیں۔ ہندی آج بھی ہندوستان کی قومی زبان اور اردو پاکستان کی قومی زبان۔ اس لئے 'ہندوستانی' کے لفظ کا استعمال درست نہیں۔ موجودہ سیاق و سباق میں 'اردو' لکھنا درست ہوگا۔ (ادارہ)

اپنے عہد کے ترجمان ہوتے ہیں۔ دتاسی نے مصنفین کے متعلق ایک اسکالر کی طرح اپنی ذاتی اور غیر جانب دارانہ رائے دی ہے یہ چیز اس کتاب کو دوسرے تذکروں سے ممتاز کرتی ہے۔ دتاسی کے نزدیک صرف میر تقی میر کے تذکرے 'نکات الشعرا' میں بے لاگ اظہار خیال کی مثالیں ملتی ہیں۔ لیکن میر نے بھی بعض شاعروں کے ساتھ انصاف نہیں کیا اور اسی لیے فتح علی حسینی نے اپنے تذکرے میں ان پر چوٹیں کی ہیں'۔

دتاسی نے اپنے دیباچے میں ان ٦٦ تذکروں کا بہ طور مآخذ ذکر کیا جس سے اس نے تاریخ میں معلومات جمع کی ہیں۔ اخبارات، رسالے، مکتوبات، مخطوطات اور قلمی نسخے اس کے علاوہ ہیں۔ ان میں اردو اور ہندی کے چند نایاب یا کم تذکروں کے نام بھی ملاحظہ کیے جا سکتے ہیں جن کے بارے میں دتاسی نے بھرپور معلومات فراہم کی ہیں۔ دتاسی نے اپنے انگریزی مآخذ کا ذکر بھی کر دیا ہے۔ دتاسی نے اردو تذکروں پر عدم اطمینان کا اظہار کیا ہے کیوں کہ ان تذکروں میں شاعر کے نام اور ان کے ایک دو شعر بہ طور نمونہ نقل کر دیے جاتے ہیں۔ طویل سے طویل تبصرے میں بھی مصنف کی تاریخ پیدائش، تاریخ وفات اور تفصیلی حالات زندگی کا پتا نہیں چلتا۔ عام طور پر مصنفین کے کاموں کے عنوانات کا بھی ذکر نہیں ملتا۔ ان کے یہاں یہ بات اہم ہے شاعر نے اپنا دیوان مرتب کیا ہے یا نہیں'۔ اس کے برعکس دتاسی نے مصنف کے ذکر میں 'اختصار، جامعیت اور تاریخی ترتیب کو برقرار رکھنے کا التزام کیا ہے۔ دتاسی جب کسی مصنف پر روشنی ڈالتا ہے تو حالات زندگی کی تاریخ ترتیب، اس کے کلام کا بہ تدریج اشاعت، مطبع، ایڈیشن، ناشر، ضخامت اور صفحات کی صراحت کر دیتا ہے'۔ اسی لیے ڈاکٹر عقیل نے لکھا ہے کہ 'دتاسی بلاشبہ انیسویں صدی کے مستشرقین میں اس اعتبار سے سب سے نمایاں اور ممتاز ہے کہ اردو تحقیق اور مطالعہ اسلام کے ضمن میں اس کے تحقیقی مطالعات نے اپنے موضوعات پر ایسا ذخیرہ مآخذ فراہم کر دیا ہے جن سے استفادے کے بغیر اردو زبان و ادب اور ہندوستانی مسلمانوں کی تاریخ و تہذیب کا کوئی مطالعہ، خصوصاً انیسویں صدی کے تعلق سے، جامع اور مستند نہیں ہو سکتا۔

مراسلات

"یا وارث یا وارث"
۱۴۳۶ ہجری

"ابتدا ٹھیک تیس ستمبر"
۲۰۱۵ عیسوی

"محترم معنوی، برادر جناب منصور عاقل صاحب" ۲۰۱۵ عیسوی "اَلسَّلَامُ عَلَیْکُمْ وَ رَحْمَۃُ اللہِ وَ مُطَہَّرَۃٌ وَ بَرَکَاتُ اللہ" ۲۰۱۵ عیسوی

"مُنوّر ماہ، تازہ بہ تازہ الاقرباء ملا" ۱۴۳۶ ہجری — "جولائی ستمبر کے دس حکمت مآب شمارے ہیں" ۲۰۱۵ عیسوی — "نادرہ شبیہ کا ٹائیٹل سے سرورق خوب سجا ہے" ۲۰۱۵ عیسوی —

"اصول فرمان قائد: پاکستان کی سرکاری زبان اردو ہوگی — ڈھاکہ" ۱۴۳۶ ہجری / ۲۰۱۵ عیسوی "نفاذِ اردو پر مشتمل اداریہ" ۲۰۱۵ عیسوی "محمد طارق غازی کا طویل مقالہ عمدہ و با اسلوب ہے" ۲۰۱۵ عیسوی

"بجا و قصور منقبت بھرا ایک جائزہ" ۱۴۳۶ ہجری "علی گڑھ کے محمد شہاب الدین کا حج کے سفرنامے پر مقالہ مُوافق" ۲۰۱۵ عیسوی — "نوریں تحریم کی تحقیق معجز بیان" ۲۰۱۵ عیسوی

"گل ناز بانو سے اردو ادب میں خاکہ نگاری پر اچھا مدلل مقالہ لکھا ہے" ۲۰۱۵ عیسوی "محمد طارق کا افسانہ کلین بولڈ رنگ افروز" ۱۴۳۶ ہجری

"محبت موم کی صورت اور چواری بابو اچھے و دلچسپ ادبی افسانے ہیں" ۲۰۱۵ عیسوی "غزلیات تمام بلند" ۲۰۱۵ عیسوی — "نعت عرشی ہاشمی کا معجز کلام" ۲۰۱۵ عیسوی

"رباعیات صابر عظیم آبادی" ۲۰۱۵ عیسوی "خوب حسین سخن" ۱۴۳۶ ہجری —

حساس واقعات مواصل
۱۴۳۶ ہجری

"نشاط دل نفاذ اردو" ۱۴۳۶ ہجری "انبساط! پاکستان میں باقاعدہ اردو کا نفاذ ہوا" ۲۰۱۵ عیسوی "اداروں نے تاثیر اردو کو دفتری زبان بنانے میں جد و جہد کی" ۲۰۱۵ عیسوی

"اردو ہماری اصل ثقافت کا آئینہ دار ہے" ۲۰۱۵ عیسوی "کھلا و اردو دفتر اور عدالت میں بھی" ۲۰۱۵ عیسوی

"پُر آشوب حادثات حج" ۱۴۳۶ ہجری "پہلا سانحہ، حلیم طبع حاجیوں پر طواف کے دوران کرین (Crane) گری" ۱۴۳۶ ہجری

"حرم شریف میں بجلی و تیز ہواؤں سے سانحۂ اجل ہوا" ۲۰۱۵ عیسوی "دوسرا جاں گداز قیامتی حادثہ" ۱۴۳۶ ہجری "سانحۂ منیٰ میں نہایتی پاکستانی حجاج شہید ہو گئے" ۱۴۳۶ ہجری

"شہید پاکستانی حجاج کی چشم نما تعداد ایک سو پانچ ہو گئی" ۲۰۱۵ عیسوی

"اَلْغَائِبُ الْمُحِبُّ وَ الْمَوْلَی ذُو الْمَعَارِج"
۱۴۳۷ ہجری

"مودب! آغاز ماہِ محرم ہو گیا" ۱۴۳۷ ہجری "تمام عالم اسلامی کو مشہود نیا اسلامی سال مبارک" ۱۴۳۷ ہجری "بہرحال نیا ہجری سال سنہ چودہ سو سینتیس آگیا" ۱۴۳۷ ہجری

"ماشاء اللہ! سالِ محرم الحرام" ۱۴۳۷ ہجری

"مخلص انتخاب علی کمال"
۲۰۱۵ عیسوی

[دستخط]
۳/ اکتوبر ۲۰۱۵ء

"ساکنہ مکان نمبر ... زمان آباد، لانڈھی نمبر چار - کراچی"
۱۴۳۷ ہجری

بیرسٹر سلیم قریشی۔لندن (برطانیہ)

جولائی ستمبر کا شمارہ ہمدست ہوا۔ سالنامہ ۲۰۱۵ بھی میری میز پر رکھا ہوا ہے کہ ضخیم ہونے کی وجہ سے قسط وار پڑھ رہا ہوں ایک دو قسطیں باقی ہیں۔ 'الاقربا' بھی کوہِ ندا کی طرح قارئین کو اپنی طرف کھینچتا ہے۔ فرق یہ ہے کہ ''یا اخی'' کی آواز پر جو مسافر کوہِ ندا کی طرف جاتا ہے پھر واپس نہیں آتا لیکن یہاں قاری 'الاقربا' میں ڈوب کر صورتِ خورشید نکل آتا ہے۔ روشن خیال، روشن دماغ۔

موجودہ شمارہ میں آپ نے نفاذِ اردو پر بھرپور اداریہ تحریر کیا ہے جس میں عدالت عظمیٰ کی دلچسپی اور حکومت کی مجرمانہ غفلت کا ذکر تفصیلی طور پر کیا ہے۔ جسٹس جواد ایس خواجہ اور ان کے رفقائے کار ''پاکستان کی تہذیبی و قومی شناخت کا ایک پُر عظمت اور تاریخ ساز باب رقم کر چکے ہیں''۔ آپ کے یہ الفاظ نفاذِ اردو کی تاریخ میں سنہری الفاظ میں لکھے جانے کے قابل ہیں۔ نفاذِ اُردو کیلئے میرے برادر بزرگ محمد اسمعیل قریشی ایڈوکیٹ نے ۱۹۹۱ء عدالت عالیہ میں اپنی درخواست دی تھی جس کا متن آپ نے 'الاقرباء' کے ۲۰۱۲ کے شمارے میں دیا تھا۔ اسی شمارہ میں آپ نے ''ایک یا آٹھ قومی زبانیں۔ عقل و تدبر کی آزمائش'' کے زیر عنوان مقالۂ افتتاحیہ تحریر کیا تھا۔ آپ کی یہ کاوشیں رنگ لائیں اور: 'آخر آخر اک مقامِ بے مقام آ ہی گیا'۔

موجودہ شمارہ میں آپ نے ادارۂ فروغ قومی زبان کی سفارشات بھی تحریر کی ہیں۔ اس کی کامیابیاں حکومت کے سرکردہ لوگوں کو بھجوائیں تو شاید ان لوگوں کے کان پر جوں رینگنا شروع ہو جائیں۔ ابھی کچھ دن ہوئے چیف جسٹس انور ظہیر جمالی نے پارلیمنٹ اور سینٹ سے اردو میں خطاب کیا جو خوش آیند ہے لیکن یہ جان کر افسوس ہوا کہ سینٹ کے چیئرمین رضا ربانی نے انگریزی میں تقریر کی۔ تعجب ہے کہ عوام کے نمائندہ ہو کر عوام کی زبان میں تقریر نہیں کر سکتے؟ تحریک پاکستان کے دوران غالباً بمبئی میں آل انڈیا مسلم لیگ کے جلسے میں فیروز خان نون نے انگریزی میں تقریر شروع کی تو سامعین میں سے آوازیں آئیں۔ ''اردو میں، اردو میں'' فیروز خان نون نے جھنجھلا کر مجلسِ انتظامیہ کے اجلاس میں کہا ''آخر مسٹر جناح بھی تو انگریزی میں تقریر کرتے ہیں''

اس پر قائداعظم جو جلسے کی صدارت کر رہے تھے فوراً مائیک پر آئے اور کہا ''نون نے میری پناہ لی ہے لیکن میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ پاکستان کی قومی زبان اردو اور صرف اردو ہوگی''۔

موجودہ شمارہ بھی اپنے دامن میں حسب سابق علم و دانش کے جواہر لئے ہوئے ہے۔

''سیاسیات مشرق و مغرب اور اقبال کے'' کے زیر عنوان پروفیسر سیدہ نغمہ زیدی نے اقبال کے سیاسی اور معاشی افکار پر روشنی ڈالی ہے۔ اقبال مغربی حکمرانوں کے مقابلہ میں کارل مارکس کیلئے نرم گوشہ رکھتے ہیں کہ یہ نچلے طبقے کی فلاح و بہبود کیلئے کام کرتے رہے ہیں۔ کارل مارکس کا معاشی نظام اسلام کے معاشی نظام کے بہت قریب آتا ہے۔ کارل مارکس نے مذہب کو افیون کہا ہے اس لئے کہ اس کی نظر میں یہود و نصاریٰ ہی کا مذہب تھا جو معاشی اور طبقاتی طور پر نچلے طبقے کو exploit کرتے تھے۔ ان کی نظر میں خلفائے راشدین کا معاشی نظام نہیں ہوگا جو شرع پیغمبر پر مبنی تھا۔ ابلیس کی مجلس شوریٰ میں ابلیس اپنے مشیروں سے کہتا ہے کہ مجھے اشتراکی کوچہ گردوں سے کوئی خوف نہیں ہے لیکن۔

عصر حاضر کے خداؤں سے ہے البتہ یہ خوف　　ہو نہ جائے آشکارا شرع پیغمبر کہیں

جناب مسلم شمیم نے ''علامہ اقبال اور علمی نشاۃِ ثانیہ'' پر تحقیقی مضمون لکھا ہے۔ سرسید نے مرزا غالب سے رہنمائی لیتے ہوئے مسلم نشاۃِ ثانیہ کیلئے کام کیا حالی اور شبلی نعمانی بھی اسی ٹیم سے تھے اور یہ سلسلہ علامہ اقبال تک آیا۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ یہ نشاۃِ ثانیہ مسلم نشاۃِ ثانیہ تھی یا انڈین مسلم نشاۃِ ثانیہ تھی۔ کیونکہ اور مسلم ممالک میں مسلم نشاۃِ ثانیہ کے آثار نہیں دکھائی دیتے حال میں اس کی کوئی جھلک ہے تو وہ ایران اور ملیشیاء میں دکھائی دیتی ہے۔ جناب مسلم شمیم جس نشاۃِ ثانیہ کا ذکر کر رہے وہ علامہ اقبال اور قائداعظم کی قیادت میں پاکستان کے قیام تک تو آئی لیکن اس کے بعد کہیں دکھائی نہیں دیتی۔

ڈاکٹر محمد شباب الدین کی تحریر ''حج کے سفرناموں میں حجاز کی سماجی، تہذیبی اور ثقافتی زندگی کے نقوش'' حجازی زندگی کا دوسرا رخ دکھاتی ہے۔ عرب اپنے زمانہ کے سُپر پاور تھے۔ مورخین کے

نزدیک اور نپولین کے مطابق عرب افواج دنیا میں جہاں جہاں بھی گئی ہیں تہذیب و تمدن، علم و دانش کے پرچم لہراتے ہوئے گئی ہیں۔ شکر ہے کہ آج کا حجاز ڈاکٹر صاحب کے تحریری حجاز سے بہتر ہے۔

گوشۂ "یادرفتگان" میں پروفیسر انوار احمد زئی اور پروفیسر حسن عسکری کاظمی نے اپنی یادوں کے دریچے کھولے ہیں جس میں یوسف میمن اور اشفاق احمد خان کے خدوخال نمایاں نظر آئے۔

خدا رحمت کند ایں عاشقان پاک طینت را

محمد طارق غازی۔ اونٹاریو (کینیڈا)

الاقربا کا تازہ شمارہ (جولائی / ستمبر ۲۰۱۵) موصول ہوا میں اس مجلّہ کو ہمیشہ پارلیمانی قانون سازی کے انداز پر پڑھتا ہوں: یعنی تین خواندگیوں کے بعد ہی اطمینان ہوتا ہے قانون کی رو سے حق مطالعہ ادا ہو گیا۔

افتتاحیہ پڑھ کر ایک بار پھر یہ یقین حاصل ہوا کہ پاکستان ایک مملکت عجائبات ہے۔ یہ کچھ کم نہ تھا کہ فوج جیسے سنجیدہ مارشل لائی ادارہ میں بیٹھ کر حضرت ضمیر جعفری ظراف کے گلشن کھلایا کرتے تھے اور طرفہ تماشہ یہ کہ اس کار ثواب کے لئے انہیں شاعری کی صنف نازک کی زلفیں سنوارنا مرغوب تھا۔ دوسرے کرنل محمد خاں صاحب یہی کام قلم کی گل افشاں بندوق سے نثر میں فرماتے تھے، مگر ان پر بقول خوجی کسی جنڈیل کنڈیل کا زور نہ چلا۔ اِدھر آپ کے افتتاحیہ سے معلوم ہوا کہ قوم کی جو خدمت سرکار والا مدار کو تفویض کی گئی تھی اس کی تکمیل کارکنان قضا و قدر کی اجازت سے محکمہ قضاء یعنی عدالت عظمیٰ نے کردی ہے۔ بہر حال اردو کے حق میں مبارک فال ہے۔ آسان کام عدالت عظمیٰ نے کر دیا، اب مشکل کام باقی رہ گیا جس میں حکومت تو جو بھی سہولتیں عطا فرمائے وہ مدِ خسروی موجب تشکر و امتنان ہوں گی، لیکن حق یہ ہے کہ سہولتیں ملیں یا نہ ملیں جامعات اور ابلاغیہ کو اس کام میں دن رات ایک کرنا پڑے گا تب جا کر ریاست حیدر آباد کی روایت کو تازہ اور زندہ کیا جا سکے گا۔ اللہ آپ سب کی مدد کرے۔

آج دوسری خواندگی میں رشید اختر ندوی کی تاریخ نگاری پر ڈاکٹر نورینہ بابر کی تحریر غور

سے پڑھی مضمون بہت محنت سے لکھا گیا ہے اور اس میں رشید اختر ندوی کے بعض افکار کو اشارتاً یا کنایتاً قابل بحث بھی قرار دیا گیا ہے، اگر چہ ان پہلوؤں کو قلم کی مزید مدد درکار تھی۔ تاریخ کے تعارف میں مضمون کا ابتدائیہ مغرب نژاد ہے تاہم حقیقت یہ ہے کہ علم تاریخ خالص اسلامی ''ایجاد'' ہے جس کا اعتراف خود رشید اختر ندوی کو بھی تھا۔ حق یہ ہے کہ علم تاریخ کا سوتا قرآنِ حکیم ہے جہاں بار بار ماضی کی اقوام کے حالات اور ان کی عاقبت پر غور و مطالعہ کی غرض سے دنیا کے سفر کا حکم دیا گیا ہے۔ یہی حکم درجنوں افراد کو عرب سے نکل کر چین و ہند، عراق و شام، افریقہ و اندلس کے سواحل اور مرغزاروں تک لے کر گیا ہے اور ان مسافران دشت علم نے دنیا کی زندہ اور مردہ قوموں کی تاریخ پر مجلّات کے انبار لگا دیے گستاخی معاف، ہیگل اور سپلے، مارکس اور ڈیوراں کے نظریاتِ تاریخ پر کام نہیں ہوا یہ قرض باقی ہے لیکن اس سے زیادہ اہم کام خود اپنے بزرگوں کے علوم و افکار کی بازیافت کا ہے۔ فاضل مصنفہ کو اس کام کا ذوق ہے۔ امید ہے 'الاقربا' میں آئندہ بھی ان کے قلم سے ایسی تحریریں آتی رہیں گی۔

بہر حال فاضل مصنفہ کا منشاء توصیفی مضمون تھا اہل علم کی توصیف کوئی عیب نہیں بلکہ نہایت قابل قدر تمرین ہے، ہماری عصری تاریخ کے بہت سے بڑے نام ڈاکٹر نورینہ تحریم بابر جیسے باشعور اہل قلم کی توجہات کے مستحق ہیں علم و دانش کے اساطین کے تذکروں کو علمی مجلّات سے باہر عوامی ابلاغیہ میں بھی بار بار آتے رہنا چاہیے تاکہ بزرگوں کی ستائش سے نوخیز نسلوں میں قابل ذکر کام کرنے کا جذبہ اور حوصلہ پیدا ہوتا رہے یہاں کینیڈا میں میری چھ سالہ پوتی عفیفہ جس ابتدائی سکول میں جاتی ہے وہ ننھے بچوں کے لے کہانیاں لکھنے والے ایک جواں سال کینڈائی ادیب روبرٹ منچ (Robert Munsch) سے موسوم ہے اور وہ ادیب ابھی زندہ ہے اور بچوں کے لئے کہانیاں لکھ رہا ہے۔ ٹورانٹو میں ایک ہائی سکول کینڈا کے پہلے خلا باز فوجی افسر مارک گارنو (Marc Garneau) کے نام پر ہے جو ملک کے موجودہ وزیر مواصلات ہیں مجھے نہیں معلوم مولوی محمد اسمٰعیل میرٹھی، سعید الدین پراچہ، شفیع الدین نیر، یکتا امر ہوی، عذرا کاظمی، م۔م راجندر،

الیاس احمد مجتبیٰ، محمد حسین حسان، عبدالغفار مدھولی، اوپیندر ناتھ اشک، صوفی تبسم، حامد اللہ افسر، افتخار احمد اقبال، ابصار عبدالعلی، حسام حُر، جیسے بچوں کے ادیبوں اور شاعروں کے نام سے برصغیر میں کہیں بھی کوئی سکول، کالج، کوئی ادارہ، کوئی سڑک منسوب ہے یا کوئی دانشور میر و غالب و اقبال سے ہٹ کر ان انسان ساز شخصیات کو بھی علمی ادبی تحقیق کے قابل سمجھا ہو۔ اس دھندلے پس منظر میں ڈاکٹر نورینہ تحریم بابر کے مضمون کی عمرانی اہمیت روشن ہے۔

درست ہے کہ اس نوعیت کی تحریروں میں تنقید کا در آنا غیر مناسب ہوتا ہے اسی لئے فاضل مصنفہ نے نازک موضوعات کو بہت احتیاط سے یا تو سرسری طور پر بیان کرنا مناسب سمجھا ورنہ بلا تبصرہ خود رشید اختر ندوی کے بیانات نقل کر کے فیصلہ قارئین کے ذوق اور علم پر معلق کر دیا ان مقامات پر یہ مہذب پیرایۂ بیان ہی درست تھا بعض اہم مقامات پر فاضل مصنفہ نے زیرکی سے تاریخ نویسی کے بارے میں رشید اختر ندوی کے ''اعتقادات'' من و عن ان کے اپنے الفاظ میں نقل کر دیئے اور دوسری طرف ممدوح کے علم کے مثبت رخ کو بھی اسی انداز میں پیش کر دیا۔ طرز تحریر قارئین کو متحرک کرتا ہے۔ اس لئے میں اس مضمون کو ایک سے زائد بار پڑھنے کے حق میں ہوں مضموں میں ممدوح سے منسوب کچھ ایسی باتیں آئی ہیں جو علمی توجہ کا مطالبہ کرتی ہیں آئندہ کبھی فاضل مصنفہ اس سمت میں کچھ تنقیدی کام کریں تو یہ بھی موضوع کا حق ہے۔

تاریخ کے ایک ادنیٰ طالب علم کی حیثیت سے میرے نزدیک رشید اختر ندوی کے افکار میں چند امور محل نظر ہیں پہلی بات تو حضرت معاویہؓ کے بارے میں ان کا جارحانہ لہجہ ہے جو ان جیسے دانشور کی سطح سے فروتر ہے، اور پھر ان کا یہ قول سامنے آتا ہے کہ مسلمانون کا خود اپنے لئے ''باعث شرم'' بن جانے کا عمل'' خلافت راشدہ کے خاتمہ کے بعد ہی شروع ہو گیا تھا'' تاریخ سے تو ان باتوں کی تائید نہیں ہوتی ہاں یہ ہے کہ استعماریت کے سیلاب کے سامنے مسلمانوں کے سیاسی اضمحلال سے پریشان لوگوں کے ایک طبقہ میں اپنی تاریخ کی مذمت کا یہ انداز بیسویں صدی میں پیدا ہوا تھا، اور اس فکری اُفتاد کی جڑیں انیسویں صدی کے اس ذہن میں پیوست تھیں جو مسلم

تہذیب کی مذمت، اس کے رد، اور اس کے علی الرغم یورپی مشینی تہذیب اور منہ زور سیاست کی برملا ستائش و تائید نے مرتب کیا تھا۔

یہاں اس زوالی نفسیات کی تحلیل کا تو محل نہیں ہے لیکن مسلمان اہل علم کو یہ سوال ضرور اٹھانا چاہیے کہ اگر خلافت راشدہ کے خاتمہ (شہادت سیدنا علی رضی اللہ عنہ ۲۱ رمضان ۴۰ھ / ۲۷ جنوری ۶۶۱) کے بعد مسلم تاریخ کا ''شرمناک دور'' شروع ہو گیا تھا تو ان صحابہ کے بارے میں کیا فرمایا جائے گا جو اس واقعہ کے ۶۰ سال بعد تک بھی اللہ کی زمین پر موجود تھے، جو اسی زمانہ میں انسانوں کی تربیت کر رہے تھے اور جن کے حجروں سے تابعین کے جیوش نکل رہے تھے جنھوں نے جمع حدیث، تدوین فقہ، سیرت نگاری، تفسیر قرآن اور ایک مثبت عالمی اسلامی تہذیب سازی کے میدانوں میں وہ کام کر دکھایا جو پہلے نہ بعد میں کوئی اور قوم و امت کر سکی اور نہ کبھی کر سکے گی۔

ابن عساکر نے تاریخ دمشق میں بیان کیا ہے کہ تمام اصحاب النبیؐ میں سب سے آخر میں رحلت کرنے والے صحابی حضرت ابوطفیل عمرو ابن واثلہ اللیثی تھے جن کا انتقال ۱۱۰/ ۷۲۸ء میں ہوا تھا مصر میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خادم خاص حضرت انس ابن مالک انصاری ۹۱ھ ۹۳ھ /۷۱۱ء تک حیات تھے اسی زمانہ میں مدینہ منورہ میں راوئ حدیث حضرت سہل ابن سعد الساعدی کا انتقال ۱۰۰ سال کی عمر میں ۹۶ھ / ۷۱۴ء میں اور واقدی اور الذہبی کے قول کے مطابق ۹۱ھ /۷۰۹ء میں ہوا تھا۔ دوسرے ممتاز راوئ حدیث حضرت جابر ابن عبداللہ ابن عمرو ابن حزام انصاری کا انتقال ابن سعد کی روایت کے مطابق ۷۷ھ میں ۸۴ سال کی عمر مبارک میں ہوا، الذہبی کا قول ہے کہ عمر مبارک ۹۴ سال تھی۔ کوفہ میں ایک اور راوئ حدیث حضرت عبداللہ ابن ابی اوفی کا انتقال ۱۰۰ سال کی عمر میں ۸۸ھ یا ۶۸ھ / ۷۰۶ء میں ہوا تھا اسی سال مصر میں وفات پانے والے آخری صحابی حضرت عبداللہ ابن الحارث تھے جو ۷اھ / ۶۳۶ء میں حضرت عمرؓ کے دور خلافت میں فتح مصر کی مہم میں شریک تھے۔

ان بزرگوں کے علاوہ ابن عساکر نے تاریخ دمشق میں امام عبدالرحمٰن اوزاعی کے حوالہ سے لکھا ہے کہ جو بے شمار صحابہ (خلافت راشدہ کے بعد) اس زمانہ میں حیات تھے ان میں حضرت سعد ابن ابی وقاص، حضرت اسامہ ابن زید، حضرت عبداللہ ابن عمر، حضرت زید ابن ثابت انصاری، حضرت ابوسعید الخدری، حضرت رافع ابن خدیج، حضرت مسلمہ ابن مخلد، حضرت ابوامامہ باہلی مقیم شام شامل تھے ممتاز تابعین کی کثیر تعداد ان کے سوا تھی جن میں مسور ابن مخرمہ، سعید ابن میسب، عروہ ابن الزبیر ابن العوام، عبداللہ ابن الاسود، عمرہ بنت عبدالرحمٰن، حفصہ ابن سیرین، محمد ابن سیرین، حسن بصری، محمد ابن کعب قرظی، یزید ابن رومان القاری، یحیٰی ابن سعید انصاری، محمد ابن ابی لیلیٰ نمایاں تھے اس دور کے دیگر صحابہ میں ام المومنین حضرت عائشہ، ام المومنین حضرت ام سلمہ، ام المومنین حضرت صفیہ، حضرت محمد ابن مسلمہ، حضرت کعب ابن مالک، حضرت ابوطلحہ، حضرت کعب ابن عجرہ، حضرت حسان ابن ثابت، حضرت ابوقتادہ، حضرت سمرہ ابن جندب، حضرت قیس ابن سعد ابن عبادہ، حضرت نعمان ابن بشیر، حضرت مغیرہ ابن شعبہ، حضرت زید ابن ارقم، حضرت اسماء بنت سکن، حضرت براء ابن عازب جیسے راویان حدیث اور مجاہدین فی سبیل اللہ کے نام آتے ہیں۔

ان میں سے تو کسی نے خلافت راشدہ کے بعد کے دور کے بارے میں وہ سب کچھ نہیں کہا تھا جو عہد نو کے بعض اہل قلم بڑی بے تکلفی سے کہہ جاتے ہیں، یہ سوچے بغیر کہ یہی تو وہ نسلیں تھیں جنہوں نے یورپ کو تاریک زمانوں سے نکال کر روشن خیالی کے اجالوں میں پہنچایا تھا وہ نہیں تو پھر دنیا میں مدح کے قابل کون ٹھہرے گا؟

رشید اختر ندوی نے امام مالک (۷۱۱۔۷۹۷ء) اور (ابن اسحٰق) (۷۰۴۔۷۶۸ء) کو اور پھر ابن ہشام (م: ۸۳۳ء) اور ابن سعد (۷۸۴۔۸۴۵ء) کو "علم تاریخ کا بانی" کہا ہے ان چاروں شخصیات کی پیدائش اور زمانہ کارکردگی خلافت راشدہ کے بعد کا ہے۔

اس تفصیل کا اجمال یہ ہے کہ ان بزرگوں کی موجودگی میں تاریخ کے ایک روشن دور کو شرمناک قرار دینا بڑی جسارت کی بات ہے، خصوصاً جبکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسلام کی پہلی

تین نسلوں کو دنیا کے بہترین انسان اور ان کے زمانہ کو خیر القرون شمار فرمایا ہے، جس میں تابعین اور تبع تابعین شامل ہیں۔

بیسویں صدی میں بعض اہل قلم نے ملوکیت کو گویا کفر کا ہم معنی بنا کر پیش کیا ہے۔ رشید اختر ندوی نے بھی یہی رخ اختیار کر لیا جو اُن جیسے ذی علم شخص کے مناسب نہ تھا پھر اگر یہ بات اس قدر بُری تھی تو اس طرز حکومت کو صدہا سال علماء اسلام نے کیوں گوارہ کر لیا، جن میں رشید اختر ندوی خود بھی شامل ہیں۔ انہوں نے تاریخ وسوانح نگاری میں جن کرداروں کو خصوصی توجہ کا مستحق اور امت کے لئے قابل تقلید سمجھا ہے ان میں صلاح الدین ایوبی، اورنگ زیب اور حیدر علی ملوک ہی تھے، جمہوری یا شوروی حکمران نہیں تھے۔

نیز اندلس کی تاریخ تمام تر ملوک کی تاریخ ہے سوائے اک ابو محمد ابنِ جمہور نامی قرطبی تاجر کہ جنھیں نا اہلی کی وجہ سے عام بے اطمینانی کے نتیجہ میں آخری اندلسی اموی حاکم ہشام ثالث کے فرار ہونے کے بعد اہلِ قرطبہ نے اتفاقِ رائے سے ابو محمد جمہور کو نیا امیرِ قرطبہ چنا تھا، وہ قصر شاہی میں منتقل نہ ہوئے اور شہر کے ایک کوچہ میں اپنے معمولی مکان ہی میں بیٹھ کر اہلیان شہر کے مشورہ سے آدھا دن امور مملکت سرانجام دیتے تھے اور ظہر کے بعد اپنے کاروبار میں مصروف ہوتے تھے دلچسپ بات یہ ہے کہ احیاء خلافت کے امیدواروں کو اپنی تاریخ کے اس شخص کا بالکل علم نہیں۔

میں ذاتی طور پر بہ طرز خلافت راشدہ امیر کے انتخاب کا حامی ہوں، لیکن جہاں ممکنہ طریقہء انتخاب اجتہادی سیاسی صلاحیت کا متقاضی ہے وہاں قابل غور نکتہ یہ ہے کہ عبدالملک ابن مروان، عمر ابن عبدالعزیز، الحکم ثانی، ہارون الرشید، المتوکل، بیبرس، صلاح الدین ایوبی، شمس الدین التمش، ناصر الدین محمود، محمد الفاتح، شاہ جہاں، سلیمان قانونی، اورنگ زیب اور احمد شاہ ابدالی وغیرہ وغیرہ کا قصور اس کے سوا کیا تھا کہ امت نے کسی نظام کے ماتحت ان کا ''انتخاب'' نہیں کیا تھا فیصلہ کن امراں کا طریقہ سریر آرائی نہیں طرز حکمرانی تھا جسے ان کے زمانہ کے عوام کی تائید اور اہل علم کے سند حاصل تھی، یعنی بادشاہوں کے خلاف عوامی بغاوتیں ہوئیں اور نہ کسی عالم یا

صوفی بزرگ نے ان کا تختہ الٹنے کا اشارہ دیا، اکبر کے دین الٰہی کے رد میں کسی بڑے سے بڑے عالم دین نے بادشاہ کے خلاف بغاوت کا فتویٰ نہیں دیا تھا، البتہ حضرت مجدد الف ثانی نے اصلاح کا علم بلند کیا تھا جس کے نتیجہ میں اسی اکبر کا پوتا شاہ جہاں وہ شخص تھا جس کی فرض نمازیں ہی نہیں تہجد بھی قضا نہ ہوتی تھی اور جس کے دور حکومت میں ایک ہندستانی تنکہ (روپیہ) میں پچاس پچپن برطانوی پاؤنڈ آیا کرتے تھے۔

خلافت راشدہ کے دوران مدینہ منورہ کی چھوٹی سی بستی ہی ریاست اسلامیہ کا الیکٹورل کالج تھی جبکہ مکہ مکرمہ، رابغ، طائف تہامہ، عمان، یمن اور تبوک وغیرہ کے لوگ اہل مدینہ کے فیصلہ کو بلا اکراہ تسلیم کر لیتے اور مقامی حاکم کے ہاتھ پر نئے امیر کی بیعت کر لیتے تھے۔ بنی امیہ اور بنی عباس کے دور میں بھی امیر یا بادشاہ کے انتخاب اور بیعت کی کم وبیش یہی صورت حال تھی مصر کے مملوک حکمرانوں کا ''انتخاب'' چرکسی ممالیک البحر کی ایک ۲۴ رکنی مجلس قائمہ کرتی تھی اور اس کے فیصلہ پر عام لوگ بیعت کر لیتے تھے، دوسری طرف ان ممالک میں اسلامی قانون کی عملداری تھی اور امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا مؤثر نظام رائج تھا، دار الحکومت اور صوبوں میں محکمہ قضاء مروجہ فقہی مذہب کے ماتحت فصل نزاعات کرتا تھا، امور سلطنت بڑی حد تک اسلام کی تعلیمات کے مطابق انجام پاتے رہتے تھے، خواہ خلافت راشدہ کے اعلیٰ معیار ہدایت پر ہونہ ہوں۔

ملوکیت کے سلسلہ میں ہمارے عہد کے اسلامی سیاسیات کے امام، مولانا حامد الانصاری غازی (مؤلف اسلام کا نظام حکومت) کا ایک تقریری قول رہنما ہے آزادی کے موقعہ پر تبادلۂ آبادی کا سوال اٹھا تو مولانا غازی نے اس سلسلہ میں نواب اسمٰعیل خان کی معرفت قائد اعظم محمد علی جناح کے پاس ایک تجویز روانہ کی تھی جسے انہوں نے تکوین مملکت اور سیاست مدن کے اصول پر مرتب کیا تھا ان کا قائم کردہ اصول یہ تھا کہ ریاست کی اساس مِلک (مالکانہ اختیار) ہے جو کسی قطعۂ زمین پر مکان یا کھیت پر ایک انفرادی حق ہے۔ مِلک سے ملکیت بنی ہے بہت سے ملکیتوں سے ملک بنتا ہے ملک سے مملکت وجود میں آتی ہے اس شرح سے واضح ہوتا ہے کہ ملک

اور مملکت ہوگی تو اس پر سیاسی اختیار رکھنے والا ملک ہی ہوگا تو اسلامی نقطہ نظر سے بس یہی پہلو نا گوار ہے کیونکہ عام طور سے مُلک پر مَلِک کا مالکانہ اختیار تسلیم کیا جاتا ہے۔ عہد رسالت اور خلافت راشدہ میں یہ امت کا اختیار تھا، کسی خاندان یا فرد کا نہیں جن بادشاہوں نے اس اصول کا اکرام کیا وہ امت میں قابل عزت ہیں، جو جمہوری سربراہ اس قانون کو ٹھکراتے ہیں ان کو فقط جمہوری انتخاب کی بناء پر عزت کا مستحق نہیں گردانا جائے گا تو محض طرز انتخاب پر اصرار بے علمی کی بات ہے اصل شے خلافت راشدہ کے امراء اور دیگر حکام کا کردار تھا دوا کی پیکنگ سے علاج نہیں ہوتا دوا سے ہوتا ہے۔

مارکسیت کے بارے میں بھی رشید اختر ندوی کا یہ خیال ان کے فہم کا قصور تھا کہ اسلام کی کمزوری کی وجہ سے مارکس کا فلسفہ وجود میں آیا تھا، مارکس کا فلسفہ دنیاوی امور میں کلیسا کی ناکامی اور صنعتی انقلاب کے ذیل میں سرمایہ دارانہ ظلم (oppressive capitalsim) کا شاخسانہ تھا کلیسا کے خلاف اس جنگ میں مارکس تنہا نہیں تھا چارلس ڈارون، جان لیوک، جیمس بالڈون، فریڈرک نطشے بھی اسی صف میں کھڑے تھے طرفہ تماشا یہ کہ کلیسا کی مخالف قوتوں کے متعلق مجدد مسلمانوں نے باور کیا کہ ان کی یہ مہم فی الجملہ تمام مذاہب، بشمول اسلام کے خلاف بھی ہے تو جو لوگ جواب مہیا کرنے کے اہل تھے وہ ڈارون اور مارکس کی ہمنوائی میں خود اپنا وجود کھو بیٹھے ہاں یہ کہا جا سکتا تھا کہ اسلامی نظام معیشت میں کیونزم کا جواب اور رد موجود تھا لیکن مارکس کے زمانہ میں ساری مسلم دنیا پر یورپی سرمایہ داری کا شیطان بچہ استعمار مسلط تھا تو کمونزم کے جواب میں اسلامی نظام معیشت کون پیش کرتا متبادل تو آج تک پیش نہیں کیا جا سکا حالانکہ اب تو مسلم دنیا کا قابل لحاظ رقبہ ملوکیت کے پیر تسمہ پا کی گرفت سے آزاد ہے۔ یہ بحث طول طلب اور ایک مستقل موضوع ہے جسے جذبات، سرسری مطالعہ اور ذاتی رائے سے بلند ہو کر علمی سطح پر تحقیق کی ضرورت ہے۔

زیر نظر شمارہ کے افسانے ابھی نہیں دیکھ سکا۔ دیگر مضامین پر بھی ایک سرسری نظر ڈالی ہے۔ تاہم حج کے سفرناموں پر ڈاکٹر شہاب الدین کی تحقیق حجازی ثقافت کا ایک پہلو روشنی میں

لائق ہے ان کی محنت قابلِ تحسین ہے وہ مقدس خطہ ارض تو ہماری دینیات میں بھی موہوم ہو گیا ہے۔

تعمیرات ڈاکٹر سامی عنقاوی کی کوئی کتاب تو میرے علم میں نہیں ہے البتہ حجاز، بالخصوص مکہ مکرمہ اور مدینہ منورہ کے، ان بے شمار تاریخی آثار کے پچاس ہزار سے زیادہ نقشے اور تصاویر انہوں نے ضرور یکجا کر دی ہیں جن کو ایک منظم منصوبہ کے تحت مسلسل نیست و نابود کیا جا رہا ہے تا کہ اسلام کا کوئی حسی تاریخی ثبوت سینۂ گیتی پر باقی نہ رہے ان نقشوں اور تصاویر کی اشاعت کا اہتمام ہو جائے تو سبحان اللہ اس تاریخ کی صوری بقا کے سلسلہ میں کچھ اہم کام سعودی مملکت کے سابق وزیر شیخ احمد زکی یمانی نے بھی کیا ہے سچ یہ ہے کہ یہ خطۂ مبارکہ محمد شہاب الدین صاحب جیسے اہل علم کی مزید توجہات کا منتظر ہے۔

جی تو چاہتا ہے کہ 'الاقربا' کے ہر شمارہ کے مضامین پر تفصیلی بات کی جائے اور اہم مندرجات پر علمی مباحث کی صورت ہو، مجلس الاقربا میں کئی خطوط اس نوعیت کے ہوتے ہیں جن سے رائے، تبصرہ میں تنوع پیدا ہو جاتا ہے۔ یہ آپ کا کمال ہے کہ مضامین کی بوقلمونی بھی ہے اور ان پر علمی تبصرے چمن در چمن کا ماحول پیدا کر دیتے ہیں۔

حمد و نعت میں محترمہ نورین طلعت عروبہ کا اپنا مقام ہے خوش نصیب ہیں کہ اللہ نے انہیں اس بابرکت کام کے لئے چن لیا ہے۔ اللہ تعالیٰ دارین میں ان کو بہترین جزا عطا فرمائے منظومات میں محترم اویس جعفری نے 'سراپا' کو ایک بالکل نئی جہت دی ہے۔ حسنِ عقیدت کے یہ جواہرات جس بہن کی نذر کئے ہیں وہ بہن بے شک اس محبت اور اس قصیدہ کی مستحق ہیں۔

حصہ غزلیات محترم امین راحت چغتائی، انو جہاں برنی، ضامن جعفری، انو شعور، حسن عسکری کاظمی وغیرہ کی تخلیقات سے بڑا وقیع ہے۔ صوفیہ انجم تاج کی غزل میں دردِ مراجعت کی نمود ہے۔ مغربی ملکوں میں موسم بہار گھروں سے باہر پائیں چمن اور عقبی چمن تزئین گل و لالہ سے عبارت ہوتا ہے مگر طاق، چھت، محرابیں، انگنائی، بیلے جوہی کی خوشبو، نیم کا چھتنار درخت کسی اور دنیا کی باتیں ہیں۔ یہ لفظیات یادوں کے بل کھاتے گلیاروں میں بہت دور تک لے جاتی ہیں۔ البتہ اس غزل کے پانچویں شعر میں کچھ سہو کتابت ہوا ہے۔ مصرہ اولیٰ میں "اک" کے بجائے "ایک" اور سبزہ

کا امالہ لطف شعر میں مانع ہے۔ دیگر غزلوں کے چند اشعار جن پر جی سے داد نکلی یہ ہیں:

اپنی مٹی میں اب نم نہیں صاحبو یہ سزا بھی کوئی کم نہیں صاحبو
کیوں دکھائی نہ دیں ان کو ہم صاحبو روشنی اتنی بھی کم نہیں صاحبو

یوں سر عام جو کہنا ہے وہ کہئے، کہئے پھر ہتھیلی پہ اٹھائے ہوئے سر کو چلئے
مل ہی جائے گا نشاں اپنی گلی کا راحت جس طرف کوئی نہ جاتا ہو ادھر کو چلئے

(امین راحت چغتائی)

سحر وہ کونسی ہے جس کے انتظار میں ہوں اسی خیال میں راتیں گزار دیں میں نے

(انور جہاں برنی)

بے وضو رہنا کسی طور گوارا ہی نہیں دیدہ و دل کو اگر صحن حرم کرنا ہے
کم حوصلہ ہے سوہنی اس دور کی حسن پایاب دیکھ کر بھی تو ندی نہ پار کی

(حسن عسکری کاظمی)

وہ مسئلہ تو دیر ہوئی حل بھی ہو چکا الجھے ہوئے ہم آج بھی جس مسئلے پہ ہیں

(نسیم سحر)

سرور عالم راز سرور۔ امریکہ

''ہاتھ اپنے دونوں نکلے کام کے! یقین کیجئے کہ آج اس مصرع کے صحیح معنی سمجھ میں آئے ہیں جب برادرم محمد اویس جعفری صاحب کی عنایات بیکراں کے طفیل 'الاقرباء' کے دو شمارے (جولائی۔ستمبر ۲۰۱۵ء اور سالنامہ ۲۰۱۵ء) بہ یک وقت ہاتھوں میں آئے! واللہ رسائل دیکھ کر میرا دِل بقول شخصے 'باغ باغ'' ہو گیا۔

اردو کا سنجیدہ ادبی اور تنقیدی منظر نامہ کافی مدت سے اضمحلال کا شکار ہے۔ انٹرنیٹ کی یورش نے رہی سہی کسر پوری کر دی اور فی زمانہ سنجیدہ اور تنقیدی ادب پر عالم سکرات طاری ہو جاتا ہے شاذ و نادر ہی کہیں کوئی قابل اعتنا تنقیدی یا تحقیقی کام دکھائی دیتا ہے، یہاں تک کہ یونیورسٹیوں میں بھی تحقیق نام کی چیز ''بقدر بادام'' رہ گئی ہے۔ یہ صورت حال بہت تشویش ناک ہے۔ اگر کسی زبان کے ادب میں تنقید اور تحقیق زوال پذیر ہو جائیں تو وہ جلد ہی تاریخ کے ملبے میں شامل ہو سکتی

ہے۔ اُردو میں تنقید اور تحقیق کی روایت کبھی بھی بہت جاندار اور توانا نہیں رہی ہے اور اب تو یہ روایت آخری سانس لیتی ہوئی نظر آتی ہے۔ ایسے میں کہیں کہیں سے روشنی کی مدھم شعاع دکھائی دے جاتی ہے الاقربا ایسی ہی شعاعوں کی آماجگاہ ہے۔ جس استقلال اور ذمہ داری سے وہ اس ضمن میں سرگرم عمل ہے وہ بہت ہمت افزا ہے۔ خدا معلوم آپ کہاں سے اور کیسے اچھے لکھنے والوں کو ڈھونڈ نکالتے ہیں اور پھر ان سے اتنی معیاری تخلیقات حاصل کر لیتے ہیں۔ اُردو زبان وادب پر یہ آپ کا بہت بڑا احسان ہے۔ جس کے لیے آپ کے لیے دعائے خیر فرض ہے۔

سہ ماہی شمارہ میں محمد طارق غازی کا مضمون ''تصورِ ملت پر ایک نظر'' اُس روایت کی نہایت اچھی مثال ہے جو الاقربا نے قائم کی ہے طارق غازی صاحب نے بڑی عرق ریزی سے ملت کا تصور واضح کیا ہے اور اس کے مختلف پہلوؤں پر نامور علما کے خیالات کا لب لباب پیش کیا ہے۔ تصور بظاہر سیدھی بات ہے لیکن مضمون دیکھیے تو اس کے جزدیات و رموز کی وسعت کا اندازہ ہوتا ہے۔ طارق صاحب کی محنت لائق صد تحسین ہے۔ مضمون میں جہاں ایک کثیر تعداد میں علما اور ائما کا ذکر ہے وہیں یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ طارق صاحب نے پاکستان کے صفِ اول کے عالم اور مفسر مولانا ابوالاعلیٰ مودودی کا کہیں ذکر نہیں کیا ہے۔ موصوف سے علمی اختلاف کیا جا سکتا ہے لیکن ان کی خدمات کو نظر انداز کرنا ممکن نہیں ہے۔

طارق غازی صاحب کی قدیم تہذیبوں پر زیرِ تحریر کتاب کا ایک باب ''عاد، تہذیب وتباہی'' سالنامہ میں بھی شامل ہے۔ ایسا مضمون جیسی مشقت کا متقاضی ہے وہ اہل نظر پر ظاہر ہے۔ طارق صاحب نے بہت اچھا کیا کہ اپنی کتاب کو اہل اُردو کے سامنے پیش کرنے کے لیے 'الاقرباء' کا تعاون حاصل کیا ہے۔ اُن کی محنت اور محبت کی جتنی تعریف کی جائے کم ہے۔ اتنے مشکل اور پیچیدہ مضامین کو اس خوبی سے نبھانا آسان نہیں ہے۔ امید ہے کہ یہ سلسلہ جاری رہے گا اور لوگ ان کی ادبی کاوشوں سے مستفید ہوتے رہیں گے۔

سہ ماہی شمارے میں حامد رضا صدیقی صاحب کا ممتاز مفتی کی افسانہ نگاری پر مضمون نہایت علم افروز ہے۔ انہوں نے ممتاز مفتی کے فن کا ماہرانہ تجزیہ کیا ہے اور اس سے جو نتائج اخذ کیے ہیں وہ موصوف کے اندازِ فکر و نظر کو سمجھنے میں بہت معاون ہیں۔ ایک بات کہنا ضروری ہے کہ

حامد رضا صاحب نے ممتاز مفتی کے افسانوں پر صرف مرد اور عورت کی نفسیات، رومانی تعلقات اور جنسی حسیات کے تناظر میں گفتگو کی ہے۔ ان کے افسانوں کی دیگر خصوصیات (پلاٹ۔ کردار نگاری، تہذیب و ماحول کی عکاس) پر بہت سرسری روشنی ڈالی ہے اور اس سے ان کا تجزیہ یک طرفہ اور غیر متوازن ہو گیا ہے۔ ڈاکٹر نورینہ تحریم بابر صاحبہ کا تاریخ نگاری اور رشید اختر پر مقالہ ان کی عمیق نگاہی کا عکاس ہے۔ انہوں نے تاریخ نگاری کی مختلف اقسام پر سیر حاصل گفتگو کی ہے اور اس لڑی میں رشید اختر ندوی کی شخصیت اور فن تاریخ نویسی کے حوالے سے ان کی خدمات کو بہت خوبصورتی سے پرو دیا ہے۔ تاریخ کافی خشک مضمون ہے اور اس پر کچھ لکھنا بھی اتنا ہی خشک ہے لیکن تحریم صاحبہ نے اپنی شگفتہ بیانی سے مضمون کو دلچسپ بنا دیا ہے۔

اسی شمارے میں حج سفرناموں میں حجاز کی زندگی کے نقوش پر مشتمل شہاب الدین صاحب کا مضمون اور گل ناز بانو صاحبہ کی تخلیق ''اُردو ادب میں خاکہ نگاری'' اپنی اپنی جگہ اچھی کوششیں ہیں۔ اپنے موضوع سے متعلق مواد تو دونوں نے مناسب اور کافی فراہم کیا ہے لیکن اندازِ تحریر یکسر بیانیہ ہونے کی وجہ سے قدرے بے مزا ہو گیا ہے جس کے نتیجے میں قاری مضامین سے سرسری گزر سکتا ہے۔ اگر کوئی طالب علم سفرناموں پر کام کرنا چاہے تو ان مضامین میں بہت سے مفید مطلب ماخذات آ گئے ہیں جو مزید تحقیق میں اُس کے لیے بہت کارآمد ثابت ہوں گے۔

اُردو ادب میں غالبیات کی طرح اقبالیات بھی اب ایک مستقل باب کی حیثیت سے اپنی جگہ بنا چکی ہیں۔ الاقرباء کے مذکورہ سہ ماہی شمارہ میں نغمہ زیدی صاحبہ کا مقالہ ''سیاسیات مشرق و مغرب اور اقبالؒ'' اور مسلم شمیم صاحب کا مضمون ''علامہ اقبال اور مسلم نشاۃِ ثانیہ'' اسی سلسلے کی دو کڑیاں ہیں۔ اول الذکر مقالہ نسبتاً مفصل اور نغمہ زیدی صاحبہ نے اقبالؒ کے کلام سے مختلف مقامات پر دلائل فراہم کر کے اپنی تحریر کی اہمیت اور اثر پذیری کو بڑھایا ہے۔ مغرب کی مادی اور اسلام دشمن سیاست نے اُس کے پروردہ معاشی نظام کے ساتھ گٹھ جوڑ کر کے جس طرح ساری دنیا میں عموماً اور دنیائے اسلام میں خصوصاً تباہی پھیلائی ہے اس سے زمانہ واقف ہے اور ہنوز یہ کارروائی جاری ہے۔ اقبالؒ اس نظام سیاست و معیشت کو انسان کے ارتقا کی ایک منزل قرار دیتے ہیں اور اسلامی نظام کو اس سفر میں حرفِ آخر جانتے ہیں۔ اس ضمن میں مسلم نشاۃِ ثانیہ کا تصور بہت

اہمیت اختیار کر لیتا ہے۔ یہ موضوع اتنا اہم اور وسیع ہے کہ ایک مختصر مضمون میں اس کا حق ادا نہیں کیا جا سکتا۔ مسلم نشاۃِ ثانیہ پر اب تک کافی لکھا جا چکا ہے۔ اگر مسلم شمیم صاحب اس کے مطالعہ کے بعد ایک بسیط و جامع مقالہ اس موضوع پر لکھیں جو مسئلہ کی عملی تعبیر کے ایسے جملہ پہلوؤں کو سمیٹ لے جو ہنوز تشنہ ہیں تو ان کی تحقیق کے نتائج کو عام فہم زبان میں اُردو ادب، اقبالؔ کے دیرینہ خواب اور اس کی تعبیر کی ایک بیش بہا خدمت ہو گی۔

اقبالیات پر مشمولات نے سالنامے کو نہایت باوقار اور وقیع بنا دیا ہے۔ اقبال اور عشق رسالت مآب صلعم (محمد اویس جعفری) علامہ اقبال کا تصورِ زماں (طاہر حمید تنولی) ؛ مولانا جلال الدین رومی اور علامہ اقبال (خلیل طوقار)؛ اقبال اور تہذیب حاضر (ڈاکٹر نغمہ زیدی) اپنی اپنی جگہ بہت خوب ہیں۔ جو چیز ان مضامین کو بیش بہا بناتی ہے وہ چاروں مقالہ نگاروں کی اقبال سے والہانہ عقیدت و محبت ہے جس نے اپنے اپنے موضوع پر تحقیق و تنقیح کی صراط مستقیم پر سب کو قائم رکھا ہے۔ فاضل مقالہ نگاروں نے یہ مرحلہ ہمارے لئے بہت آسان کر دیا ہے اور اپنے مضامین میں مہارت سے مقدمات قائم کر کے ان کی وضاحت اور تفہیم کے سامان مہیا کر دئے ہیں۔ تقریباً سبھی نے علامہ اقبال اور دوسرے شعرا کے فارسی اشعار کا اُردو ترجمہ فراہم کر کے بہت سے قارئین کی مشکل آسان کر دی ہے۔ علامہ اقبال کے جو خیالات انگریزی میں درج کئے گئے ہیں ان کا ترجمہ بھی کر دیا جاتا تو بہتر تھا کیونکہ یہ ضروری نہیں ہے کہ ہر اُردو داں انگریزی سے بھی کماحقہ واقف ہو۔

میں خود ایک غزل گو ہوں اس لئے غزلوں کا باب بہت شوق اور غور سے دیکھتا ہوں۔ ہمیشہ کی طرح آج بھی برصغیر ہند و پاک میں غزل کثرت سے کہی جا رہی ہے۔ یہ خوش آئند بات اُردو کے ابلاغ میں معاون ہے اور اس کی بقا و فلاح کی ضامن بھی ہے۔ البتہ یہ ضروری ہے کہ ہم اپنی غزل کو بہتر اور بلند بنانے کے لئے مستقل کوشاں رہیں۔ سب جانتے ہیں کہ غزل سے تغزل، شعریت اور معنی آفرینی منسوب ہے۔ ہر چند کہ 'الاقربا' کے دونوں شماروں میں غزلیں شائع ہوئی ہیں لیکن اونچے پایے کی غزلیں نسبتاً کم نظر آئیں۔ دونوں شماروں کی غزلیات میں کئی اشعار ملتے ہیں جو غزل کی نمائندگی خوبی سے کرتے ہیں۔ طوالت کے خوف سے صرف چند اشعار پر اکتفا کی جاتی ہے۔

ایک اک کر کے بجھے جاتے ہیں کیوں سارے چراغ دفعتاً اہل تمنا کو یہ کیا ہونے لگا
(عطاالرحمٰن قاضی)

زندگی ہم نے تیری راہوں پر کیسے کیسے فریب کھائے ہیں
(انور جہاں برنی)

دیارِ کذب میں حق گوئی ! کیا کیا ضامنؔ یہ قتل کذب ہے ، اب سر قلم تو ہو گا نا
(ضامنؔ جعفری)

خود اپنے خد و خال کو ئی دیکھتا نہیں الزام جس قدر بھی ہیں سب آئینے پہ ہیں
(نسیم سحر)

بزمِ شب تنہائی میں آکثر تم ہوتے ہو، ہم ہوتے ہیں
(کرامت بخاری)

کچھ مسافر سر منزل بھی بھٹک جاتے ہیں حادثے ایسے بھی ہوتے ہیں سفر میں اکثر
(عقیل دانش)

کچھ اس طرح سے آپ نے سلجھائی زندگی سب مسئلے حیات کے دو چند ہو گئے
(سلیم زاہد صدیقی)

'الاقربا' میں ''یادِ رفتگاں'' ایک مستقل باب کی صورت میں قارئین کو دُنیائے ادب کی اُن ہستیوں کی یاد دلاتا رہتا ہے جو اَب اس دُنیا میں نہیں ہیں۔ اس طرح گاہے گاہے ایسے لوگوں سے ایک بار پھر ملاقات سی ہوتی رہتی ہے جنہوں نے اُردو شعر و اَدب کو آبرو بخشی تھی۔ یادِ رفتگاں پڑھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ کیسے کیسے لوگوں نے اُردو کی آبیاری اپنے خونِ جگر سے کی ہے۔ اس باب کو مزید فروغ دینے کی ضرورت ہے تا کہ ہم اپنے اُن ادبا اور شعرا کی بازیافت سے فیض یاب ہوتے رہیں جو اپنی تخلیقات کے توسط سے اب بھی ہمارے درمیان موجود ہیں اگر 'الاقربا' کے ہر شمارے میں کسی ایک فردوس نشیں ادیب یا شاعر پر مفصل مضمون پیش کیا جائے تو شاید ہم ان نامور ہستیوں کا قرض تھوڑا بہت ادا کر سکیں۔

اُردو کا ہر رسالہ آج کل اچھے افسانوی ادب کے فقدان کا شاکی ہے۔ الاقربا بھی اس صورت

حال کا شکار ہے رسالہ کے زیر نظر سہ ماہی شمارے میں ایک انشائیہ (ترتیب خالد صدیقی) اور تین افسانے (جواری بابو: احمد اعجاز الدین رحمت علی؛ محبت موم کی صورت شمع سید: کلین بولڈ: محمد طارق علی) شامل ہیں۔ انشائیہ بہت طویل ہے۔ انشائیہ کی ایک شرط یہ ہے کہ بہت طویل نہ ہو۔ بصورت دیگر اس کا تاثر پھیکا پڑ جاتا ہے۔ جس تندہی سے آپ دنیائے اُردو کے کونے کونے سے لکھنے والوں کو ڈھونڈ کر لاتے ہیں اس کے پیش نظر افسانہ نگاروں کا یہ فقدان ظاہر کرتا ہے کہ اُردو افسانہ شدید اضمحلال کا شکار ہے۔ مغربی ممالک کی تعلیم گاہیں اَدب کی اعلیٰ تعلیم میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتی ہیں اور تنقید، افسانہ نویسی، صحافت وغیرہ کی سنجیدہ تربیت کے مواقع فراہم کرتی ہیں۔ افسوس کہ برصغیر میں ایسا کوئی انتظام نہیں ہے اور نہ ہی کسی کو اس کا خیال آتا ہے۔

پروفیسر محمد ابوخالد-یونیورسٹی آف الابامہ-امریکہ

۸ر ستمبر کی شب جب پاکستان کی خبریں سن رہا تھا تو فوراً آپ یاد آئے اور اسی وقت میں نے آپ کو اور آپ کے توسط سے آپ کے قبیلہ کے تمام سرفروش عشاقانِ اردو کو تحریری طور پر مبارکباد دینے کا فیصلہ کیا۔

پاکستان کی ثقافت، قومی ورثہ، اردو کے فروغ، بقاء، تحفظ اور بطور سرکاری زبان اس کو اس کا جائز حق و مقام دلانے میں آپ کے گرجدار اداریے جو آپ کی ماہرانہ وکالت کے بھی آئینہ دار ہیں، پڑھتا رہتا ہوں۔ خدا کا شکر ہے کہ بہت تاخیر ہی سے سہی مگر قومی زندگی میں وہ مبارک لمحہ آہی گیا جس کا برسوں سے انتظار تھا۔

آپ نے ''افسر شاہی'' کی رخنہ اندازی کا بجا طور پر خدشہ ظاہر کیا ہے۔ یہ وہ ''کالا صاب'' کا طبقہ ہے جو برطانوی سامراج کا ذہنی غلام ہے اور خود کو عوام کا خادم نہیں بلکہ حاکم تصور کرتا ہے۔ مجھے امید ہے کہ بتدریج انہیں ہوش آجائے گا۔ لیجئے میں نے ایک اور مژدہ سنا۔ حکومت کی ذہانت، فطانت اور ملک وملت سے اس کی بے لوث محبت کا اندازہ یوم اقبال کی تعطیل کی تنسیخ سے ہوتا ہے۔ اگر عیدین، ربیع الاول، یوم عاشور، یوم پاکستان، قوم قائداعظم جیسی

تعطیلات بھی منسوخ کردی جائیں تو قوم وملک کا کتنا فائدہ ہوگا اور قومی خزانہ میں کس قدر اضافہ ہوگا۔ اس کا احوال تو آئندہ شمارہ میں آپ کے اداریہ ہی سے ہو سکے گا۔ میں اور میرے ہم خیال قارئین یقیناً اس کے لئے چشم براہ ہیں۔ آج مفکر ومصور پاکستان کو فراموش کیا گیا ہے، کل بانی پاکستان کی باری آسکتی ہے۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ ایک سیاسی جماعت کے رہنما نے فرمایا تھا کہ قائداعظم کا پاکستان سقوط ڈھاکہ کے بعد ختم ہوگیا ہے، اب جو پاکستان ہے اس کا سہرا ان کی جماعت کے بانی کے سر ہے۔

ع خامہ انگشت بدنداں کہ اسے کیا لکھیے ناطقہ سربہ گریباں کہ اسے کیا کہیے

میں حالیہ شمارہ میں محمد غازی صاحب کا طویل مضمون ''تصورت ملت پر ایک نظر'' پڑھ رہا تھا تو یہ دیکھ کر ازحد خوشی ہوئی کہ مصنف نے ایسے بے شمار الفاظ استعمال کئے ہیں جن سے اردو کی وسعت اور محاسن کا اندازہ ہوتا ہے۔ مثلاً ''گمانی دلیل، تعلیمی تشخص، تمثال کاری، سائنسی اساطیری فلم ساز، بعید سرحد خلا، ایمیل کی زبان مخففات پر مبنی ہے'' وغیرہ وغیرہ۔ دو مقامات پر لفظِ ''چودھری'' کا استعمال لطف دے گیا۔ ایک جگہ ''اعلیٰ طبقہ کے منتخب چودھریوں'' اور دوسری جگہ ''پروہتوں، سیاست کار چودھریوں۔۔۔''۔ اردو بھی کیا کمال کی شیریں اور معجز بیاں زبان ہے۔ اللہ تعالیٰ اس کی حفاظت اور اس کو فروغ دینے والوں کو کامرانی سے سرفراز فرمائے۔

ماشاء اللہ الاقربا کے لکھنے والوں کا حلقہ بہت وسیع ہے اور جریدہ کے صفحات پر مشرق ومغرب کے دانشوروں، ادباء اور شعراء سے ملاقات ہو کر ازحد خوشی ہوتی ہے۔ میری اپنی مادر درسگاہ سے وابستہ پروفیسر محمد زاہد کو بھی پڑھنے کا موقع ملتا ہے۔ حالیہ شمارہ میں تو ڈاکٹر محمد شہاب الدین اور حامد رضا صدیقی صاحبان کا بھی اسی درسگاہ سے تعلق ہے۔ ہر شمارہ اقبالیات پر خیال افروز مضامین کا حامل ہوتا ہے۔ دلچسپ افسانوں، انشائیوں، حمد ونعت کے پاکیزہ نمونوں اور معرکتہ الآراء نظموں اور غزلوں کے خالق اور تمام شرکاء محفل الاقربا کو میری اور مہناز خالد کی جانب سے آفرین اور مبارکباد۔

پروین شیر۔امریکہ

انشااللہ آپ بخیر ہونگے۔ الاقرباء پابندی سے مل رہا ہے۔ ابھی جولائی رستمبر ۲۰۱۵ کا شمارہ نظر نواز ہوا ہے۔ بے حد ممنون ہوں۔ ان دنوں اپنی بکھری ہوئی زندگی سمیٹنے کی کوشش کر رہی ہوں۔ یہ دنیا تو ایک ریل گاڑی ہے۔ ہم سب باری باری اپنے اپنے اسٹیشن پر اُترتے جاتے ہیں اللہ کی مرضی کے آگے سر جھکا دیا ہے۔ صبر اور شکر کے ساتھ۔ پروردگار نے یہ توفیق عطا فرمائی کہ آپ سے مخاطب ہوں۔ آپ نے تعزیت نامہ شائع کیا اور میری تخلیق بھی۔ آپ کی عنایت اور خلوص نے مجھے یہ طاقت بخشی کہ آپ کا تہہ دل سے شکریہ ادا کروں۔ قبول فرمائیں۔

الاقرباء مجھے سنسان دنیا سے نکال کر علم وادب اور فکر کی دنیا میں لے جاتا ہے جہاں فرحت حاصل ہوتی ہے۔ ہر شمارے میں قیمتی خزانے ہوتے ہیں۔ اس شمارے کی بہت اہم تخلیق جناب اویس جعفری صاحب کی نظم ''سراپا'' ہے۔ دل کی گہرائی سے نکلی ہوئی یہ آواز کتنے دلوں میں اُترتی جاتی ہے۔ میرے خیال میں یہی کسی تخلیق کی معراج ہے۔ اس میں فنکارانہ جوہر کے ساتھ ساتھ سوگوار بہن کے لئے ایک بھائی کی اتھاہ محبت وشفقت دنیا کے لئے ایک مثال ہے۔ ''داستاں کہتے کہتے'' (پروفیسر حسن عسکری کاظمی) بہت پُر اثر تحریر ہے۔ ابھی یہ شمارہ زیر مطالعہ ہے۔ اب اجازت چاہتی ہوں۔ احباب کی خدمت میں سلام۔

خواجہ مشتاق حسین۔گلبرٹ، اریزونا (امریکہ)

جولائی۔ستمبر ۲۰۱۵ کا شمارہ نظر نواز ہوا۔ ''آخر آخر اک مقام بے مقام آ ہی گیا'' پر دلی مبارکباد قبول فرمائیے۔ اِسے اس کی خرابی یا خوبی کہیے کہ اداریہ کو پڑھنے اور مندرجات کا جائزہ لینے کے بعد میری نظر حصہ حمد ونعت، غزل ونظم ورباعی پر جا کر رک جاتی ہے، اور جب اس کا نشہ عارضی طور پر اتر جاتا ہے تو پھر نثری حصہ سے لطف اندوز ومستفید ہوتا ہوں۔ ہر شمارہ کا شعری حصہ مجھے مجبور کرتا ہے کہ میں اس میں سے سحر انگیز اشعار کا انتخاب کر کے اپنی کتاب ''شعروں کے انتخاب'' کے جدید ایڈیشن کے لئے محفوظ کرلوں یا اس کو جلد دوئم قرار دوں اور حسب سابق

الاقربا کو تبصرہ کے لے ارسال کروں۔ آپ کو یاد ہوگا کہ الاقربا کے جولائی۔ ستمبر ۲۰۰۸ کے شمارہ میں آپ نے میری اس کتاب کو بہت سراہا تھا۔ تو لیجئے زیرِ نظر شمارہ سے چند وہی اشعار ملاحظہ فرمایئے جو میں محفوظ کر رہا ہوں:

ذرے ذرے میں نمایاں ہے نشانی تیری　　ساری دنیا کی حکایات کا عنوان ہے تو
(نورین طلعت عروبہ)

اک خیال آتے ہی کچھ خلش نہیں رہتی　　ہم بُرے تو ہونگے ہی آپ کے حوالے تا
(عرش ہاشمی)

المدد، اے غمگسار کلمہ گویانِ وفا　　ہم سپر انداختہ اور ناصر و صفدر ہیں آپ
(حسن عسکری کاظمی)

خاک پھر اڑنے لگی معبدِ جاں میں ہر سو　　چاک پھر پیرہنِ برگِ دعا ہونے لگا
(عطاالرحمٰن قاضی)

ابھی ایک نام آیا تھا زباں پر　　مشامِ دل میں رقصِ مشکبو ہے
(محمد طارق غازی)

آپ آئے نہیں تو پلکوں پر　　ہم نے شب بھر دیے جلائے ہیں
(انور جہاں برنی)

مل ہی جائے گا نشاں اپنی گلی کا راحت　　جس طرف کوئی نہ جاتا ہو ادھر کو چلیے
(امین راحت چغتائی)

دیارِ کذب میں حق گوئی، کیا کیا ضامن　　یہ قتلِ کذب ہے، اب سر قلم تو ہو گا نا
(ضامن جعفری)

تمام راستے خوشبو میں ڈوب جاتے ہیں　　ترا پیام لئے جب صبا گزرتی ہے
(صابر عظیم آبادی)

کچی محبتوں کے سفر آج بھی نسیم　　پانی کی سرکشی میں ہیں، کچے گھڑے پہ ہیں
(نسیم سحر)

کچھ نہیں دیکھتے خوابوں کے سوا آپ شعور　　دن کو بھی رات سے اوپر نہیں اٹھنے دیتے
(انور شعور)

تمہارے خیر کی ملتی رہی خبر ہم کو　　کہ ہم رقیب سے بھی رسم و راہ رکھتے ہیں
(سلیم زاہد صدیقی)

جن لفظوں کو میں نے بچپن میں گہنے کی طرح پہنا انجم　　ہر لفظ مرے ہر گہنے کا اس دور سے قیمت مانگے ہے
(صوفیہ انجم تاج)

چھوڑ کے اس کا آستاں، خود ہی تو در بدر ہوا　　کاہے کو روئے ہے حسن، کرتا ہے ہائے ہائے کیوں
(حسن چشتی)

کبھی افق پہ یہ خورشید بن کے چمکے گا　　ردائے وقت پہ ٹپکا ہے جو حیات کا خوں
(رشید آفریں)

یہ کس مقام پہ پہنچی ہے جستجو دل کی　　وصال رُت تھی مگر سوگوار گزری ہے
(اویس الحسن)

بچا بچا کے میں رکھتا ہوں پھر بھی ڈرتا ہوں　　ہوائے وقت نہ کردے اِدھر اُدھر مرے خواب
(افتخار یوسف)

جانے کیوں مجھ سے وہ خفا ہیں جمیل　　بات میری تو بے ضرر سی ہے
(ڈاکٹر جمیل احمد)

تاروں کو ہم شی کا اگرچہ ملے شرف　　مژگانِ دل کو اس طرح ویراں نہ کیجئے
(نازیہ خلیل عباسی)

چھپتی ہی جاتی ہے نگہت منزلوں کی گرد میں　　زندگی کا یہ سفر کیا رائیگاں ہو جائیگا
(نگہت زیبا)

اس شمارہ میں جو آزاد نظمیں ہیں ان پر اظہار رائے کرنے سے قبل یہ بتاتا چلوں کہ یہ صنفِ

سخن لاطینی اور قدیم یونانی زبان کی کوکھ سے پیدا ہوئی اور پھر سولھویں صدی سے اس نے انگریزی زبان کی آغوش میں پرورش پائی۔ اب یہ حال ہے کہ انگریزی کی تین چوتھائی شاعری آزاد نظم کا ملبوس زیب تن کئے ہوئے ہے۔ سب سے پہلے ہنری ہوورڈ نے ۱۵۴۰ کے لگ بھگ ورجل کی اینیڈ کا آزاد نظم میں ترجمہ کیا، اس کے بعد کرستوفر مارلو نے خصوصی طور پر اس کو فروغ دیا اور اس کے بعد شیکسپیر، ملٹن (فردوسِ گمشدہ)، اور رومانی شعراء ورڈس ورتھ، شیلے اور کیٹس نے اسے بلندیوں تک پہنچا دیا اور اس کے بعد ٹینیسن نے اس کو پرنسز اور یولیسس کے ذریعہ مزید عروج تک پہنچایا۔ اردو شاعری میں آزاد نظم کے تجربات شروع ہوئے اور ترقی پسند تحریک اور حلقۂ اربابِ ذوق نے اس کے فروغ میں کلیدی کردار ادا کیا۔ ن۔ م۔ راشد، میرا جی، فیض، مجاز، ندیم، ساغر، منیر نیازی، جیلانی کامران، ساقی فاروقی، مجید امجد، اور وزیر آغا جیسے معروف و ممتاز شعراء نے اس کو ذریعہ اظہار بنایا۔ ہر چند کہ اس میں قافیہ اور ردیف کی کوئی پابندی و بندش نہیں ہوتی، لیکن اس میں بحر کے ارکان، اس کے اوزان، ایک ربطِ مسلسل، غنائی کیفیت، لطافتِ زبان، جاذبیت اور مجموعی حسن کی سحرکاری ہوتی ہے اگر یہ اوصاف نہ ہوں تو وہ آزاد نظم نہیں بلکہ نثری نظم ہوتی ہے جسے نثرِ لطیف کہا جا سکتا ہے۔ شمس الرحمٰن فاروقی اس کا رشتہ غالب کے خطوط اور آزاد کی تحریروں سے جوڑتے ہیں۔ زیرِ نظر شمارہ میں اویس جعفری کی ''سراپا''، پروین شیر کی بغیر عنوان نظم (جس کا عنوان ''سورج کی شکست'' یا ''آغوشِ مادرِ گیتی'' ہونا چاہئے تھا) اور فیروز ناطق خسرو کی ''قرض میری مٹی کا'' بہت ہی کامیاب نظمیں ہیں۔ نظم ''سراپا'' میں ہمارے مشرقی خاندانوں کے پاکیزہ اور دیندار ماحول کی نمائندہ خواتین کی شخصیت کا پیکر اُبھر کر آتا ہے اور ہم میں سے شاید ہی کوئی ہو جو اپنے گھرانے میں کسی ایسی شخصیت کا پیکر ابھر کا آتا ہے اور ہم میں سے شاید ہی کوئی ہو جو اپنے گھرانے میں کسی ایسی شخصیت کی نشاندہی بہن، ماں، خالہ، چچی، پھوپھی کے روپ میں نہ کر سکے، نظم کی ابتدا بارگاہِ خداوندی میں تصور کی ترجمانی کی آرزو کے بعد ایک دعا سے ہوتی ہے اور پھر تقدس کی تصویر کشی کے لئے جو تشبیہ اور استعارے استعمال کئے گئے ہیں وہ

بہت پُر تاثیر سحر آگیں ہیں۔ میں نے اپنے محدود مطالعہ میں لفظ ''پوروے'' کا استعمال نہ نظم میں اور نہ نثر میں دیکھا ہے۔ نظم کے آئینہ میں ایک مومن کا کردار ابھرتا ہے جو صبر و تسلیم و رضا کا پیکر ہے اور زندگی کے نشیب و فراز اور آزمائشوں سے ستیز آزما اور اللہ پر نظر رکھتے ہوئے بے خطر، مطمئن اور خندہ و شاداں ہے۔ ابتدا اور انتہا دونوں ہی حمدِ باری تعالیٰ سے مزین ہیں اور پوری نظم تسلسل، روانی اور غنائیت کا ایک شاہکار ہے۔ پرین شیر کی نظم گو مختصر ہے مگر سادہ و سہل زبان میں گردشِ روز و شب میں سورج کے مرکزی کردار کے علاوہ اس کو ایک علامت کے طور پر بھی استعمال کیا گیا ہے۔ زمین کو مختلف مذاہب میں ماںتا اور آغوشِ مادر سے تعبیر کیا گیا ہے۔ نظم میں لفظ ''تکبر'' انسانی تاریخ کے پس منظر میں معنی آفرینی کا حامل ہے۔ پس نظم پیغام تعزیت پڑھ کر بہت دکھ ہوا۔ اللہ انہیں صبر جمیل عطا فرمائے۔ فیروز ناطق خسرو کی نظم ''قرض میری مٹی کا'' ایک تصویر ہے جو گئی دہائیوں نہ صرف ''عروس البلاد'' کے باسیوں بلکہ پوری قوم کے ذہن پر ایک لا متناہی درد و کرب اور اذیت کا آئینہ دار ہے۔ الفاظ کے در و بست اور روانی قاری کو اپنے فسوں میں گرفتار کر لیتے ہیں اور وہ شہر جس کا جادو غضب کا ہے اپنے اسیرانِ زلف کو حیاتِ جاوداں کی نوید دیتا ہے۔ اویس الحسن کی نظم ''رومان کا ٹانکا ہوا'' کا ایک بند جس میں ''زلفِ جاں، مہکے ہوئے آنچل، اور چوڑی کی کھنک'' کا ذکر ہے، بطور خاص مجاز، اختر شیرانی و ساحر اور اسی قبیل کے دوسرے رومانی شعراء کی یاد دلاتا ہے۔ صوفیہ انجم تاج نے آپ کے مجلّہ کو نرم و نازک کلام سے مزین کیا ہے، ان کی غزلیں بھی ادب عالیہ کی نمائندگی کی جانب گامزن ہیں ''رکھ رکھاؤ'' ہماری مشرقی وضع داری، احتیاط اور جذبہ محبت کے اخفا کے لطیف اشاروں کا مظہر ہے۔ ''قافلہِ فصل گل'' اور ''خوشبوؤں کا پیام'' جیسی علامتوں نے نظم کی لطافت میں خوش آئند اضافہ کیا ہے۔ میں آپ کو اور آپ کے جریدہ کے اہل قلم کو دلی مبارکباد پیش کرتا ہوں۔ ارادہ تو نہیں تھا مگر خط کچھ طویل ہو گیا ہے۔ والسلام

عثمانہ جمال۔ امریکہ

''الاقربا'' کے شمارہ جولائی۔ ستمبر ۲۰۱۵ء میں شامل جناب محمد اویس جعفری کی نظم ''سراپا''

واقعی ہر بہن کے لئے باعث فخر ہے ایک ایسی نظر جو الفاظ کے ایسے سانچے میں ڈھل کر نمودار ہوئی ہے کہ ہر لفظ ایک دوسرے پر سبقت لے جاتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ یہ نظم تشبیہ، تلمیح اور استعاروں کی ایک ایسی انوکھی دنیا کی سیر کراتی ہے جو اپنی مثال آپ ہے۔ ایک ایک لفظ تخیل و تصور کی ایسی حسین لڑیوں میں پرویا ہے جو بے مثال ہیں۔ پڑھنے والے کے منہ سے شاعر کی عظمت کے لئے بے ساختہ واہ نکل جاتی ہے۔ ہر پڑھنے اور سننے والے کو اس میں اپنی بہن نظر آتی ہے۔ میں نے انڈیا میں مقیم اپنی بہن کو یہ لاجواب نظم ٹیلیفون پر پڑھ کر سنائی تو انہوں نے ایک ایک لفظ پر بے ساختہ داد دی۔ اس میں اُنہیں خود اپنی بہن کا سراپا نظر آیا۔ دوستوں کو پڑھ کو سنایا ان کو بھی اس نظم میں اپنی بہنوں کا سراپا دکھائی دیا۔ لیکن میں نے کہا جعفری صاحب جیسے شاعر کی بہن سے بڑھ کر کون بہن ہو سکتی ہے؟ یہ خوبصورت الفاظ صرف ان کی بہن کا حق ہے جو ان کے تخیل اور تصور سے ایک نیا اور خوبصورت انداز لے کر صفحہ قرطاس تک پہنچے ہیں۔ ''سراپا'' جیسی بیش قیمت نظم پڑھ کر مجھے بھی فخر ہوا گویا میں بھی شاعر کی بہن ہوں۔ نظم کی جتنی تعریف کی جائے کم ہے۔ میری طرف سے محترم شاعر کو مبارکباد پہنچا دیجئے۔ ارباب ''الاقربا'' کو میرا سلام۔ آئندہ شمارے کے لئے ایک افسانہ سپردِ قلم کر رہی ہوں، ان شاء اللہ جلد روانہ کرونگی۔

مسعود صدیقی۔ کرک لینڈ (امریکہ)

تازہ شمارہ وصول ہوا، بعض اوقات ڈاک میں تاخیر تشویش کا موجب ہو جاتی ہے۔ ''نفاذ اردو'' پر آپ کا اداریہ پڑھا۔ مبارک ہو۔ اردو کے فروغ اور ترویج میں ابتدائی تعلیم اور ذرائع ابلاغ کلیدی کردار ادا کر سکتے ہیں بشرطِ وہ اپنی زبان سے محبت رکھتے ہوں اور اس کی اہمیت کے قائل ہوں۔ ان تک نورین طلعت عروبا کا یہ شعر پہنچا دیجئے:

اردو زباں کا حق ہے ملے اس کو قومیت　　　یہ بھی ہمارے ساتھ ہے پہچان کی طرح

الاقرباء (صفحہ ۲۳۲)

اب سربراہانِ مملکت کو اگر وہ فی البدیہہ قومی زبان میں تقریر کرنے پر قادر ہیں، تو غیر ملکی

میزبانوں کے سامنے جیب سے پیشگی انگریزی میں تحریر شدہ ورق نکال کر پڑھنے کی زحمت نہیں کرنا پڑے گی۔ گزشتہ دنوں ڈاکٹر جاوید اقبال اور جمیل الدین عالی ہم سے جدا ہوئے۔ اللہ مغفرت فرمائے۔ مجھے یقین ہے کہ اردو زبان وادب کے ناطہ آپ کی ان سے رسم وراہ رہی ہوگی۔ جاید اقبال مرحوم کو سنا بھی ہے اور پڑھا بھی ہے، لیکن ان کے بعض ارشادات محلِ نظر ہیں اور رہینگے۔ افسوس ہے اس سال یومِ اقبال پر تعطیل نہیں ہوئی۔ اقبال، قائد اعظم اور تحریک و قیام پاکستان کو ایک دوسرے سے جدا نہیں کیا جاسکتا۔ کیا کل یومِ قائد اور یوم پاکستان کی تعطیل بھی منسوخ کردی جائے گی؟ ملکی قیادت کے ذہنی دیوالیہ پن کی انتہاء ہے۔ عالی جی کا اردو شاعری میں دوہوں کے حوالے سے ایک منفرد اور غیر فانی مقام ہے اور اخبارات میں ان کے مضامین بھی ان کے منفرد اسلوب کے مظہر ہیں۔ مجھے یاد ہے انھوں نے اپنے ایک مضمون میں الاقربا پر بھی اظہار خیال کیا تھا۔ امید ہے آئندہ شمارہ میں ''یادِ رفتگاں'' میں ان دونوں مشاہیر سے ملاقات ہوگی۔ خوش رہیے اور دعا میں یاد رکھیے۔

صوفیہ انجم تاج (امریکہ)

میں تازہ شمارہ کے دیدار کی تمنا آنکھوں سے باندھے بیٹھی تھی کہ ایک دن قبل مجھے الاقربا' ملا جو ماشا اللہ بہت ہی دیدہ زیب ہے اور مواد کے لحاظ سے قوسِ قزح کی طرح رنگ و نور سے بھرپور ہے۔ میری جانب سے دلی مبارکباد قبول فرمائیے۔ آج کل آپ جیسے مخلص اور اردو زبان و علم وادب سے محبت کرنے والے اور اس کی بے لوث خدمت کرنے والے خال خال ہی نظر آتے ہیں۔ پچھلی بار جب آپ کا فون نیوجرسی سے آیا تھا تو میں کپڑوں کی دکان میں خریداری میں مصروف تھی اور وہیں کھڑے کھڑے آپ سے دیر تک گفتگو کرتی رہی۔ آپ سے ملے بغیر ہی آپ کی شخصیت جیسے ابھر کر میرے سامنے آ گئی تھی۔ زندگی رہی تو کبھی انشاء اللہ ملاقات بھی ہو جائے گی۔ آئندہ کبھی تشریف لائیں تو ہمیں بھی اپنی میزبانی کے شرف سے نوازیئے گا۔

اس قدر دیدہ زیب اور ادبِ عالیہ کے نمائندہ جریدہ میں اپنی نظم اور غزل کو دیکھ کر بے

حد خوشی ہوئی۔آپ کی ممنون ہوں کہ آپ میری قلمی کاوش کو شریک اشاعت کرتے ہیں۔اس ہمت افزائی کے لیے میں آپ کی بے حد ممنون ہوں۔نظم اور نثر کی تمام تحریریں قابلِ ستائش ہیں۔کس کس کی تعریف کی جائے اور کہاں تک کی جائے۔منظومات میں بطور خاص اویس جعفری صاحب کی نظم جو اپنی تمام نیرنگیوں کو سمیٹے ہوئے، دکھ سکھ کے گنگا جمنی جھلمل میں لکھی گئی ہے مجھے بے حد پسند آئی۔وہ خود ایک عظیم شخصیت کے مالک ہیں۔ان کی سادگی ان کا لب ولہجہ، ہر قسم کی بناوٹ اور تصنع سے مبرا ان کا انداز دل کو چھو جاتا ہے۔ان کو فون کر کے مبارک باد دی تو ان کا بے ساختہ یہ کہنا کہ اس نظم کو لکھتے وقت میری بہن آپکا بھی پورا سراپا میرے روبرو تھا۔میں نے یہ نظم کسی ایک بہن کے لئے نہیں بلکہ اپنی تمام بہنوں کے لئے لکھی ہے۔ان کے اسطرح کے والہانہ پن، ان کے خلوص اور انکی اپنایت سے میری آنکھیں بھیگ گئیں۔اللہ ایسے بھائی سب بہنوں کو عطا کرے۔

میں ایک نظم اور دو غزلیں روانہ کر رہی ہوں اور گزارش ہے کہ اگر وہ جریدہ کے معیار پر پوری اترتی ہیں تو انہیں آئندہ شمارے میں شریک اشاعت کر لیجئے گا ممنون کرم ہوں گی۔الاقربا کے لیے اور شریکان کار کے لیے نیک خواہشات اور دعائیں۔

سید محبوب حسن واسطی۔کراچی

انتہائی مستند و تحقیقی معلومات پر مبنی "الاقرباء" کا یہ اداریہ جس پر سید منصور عاقل بجا طور پر مبارکباد کے مستحق ہیں ہمارے فکری انحطاط کو انتہائی خوبصورتی سے ظاہر کرتا ہے ہر چند حضرت قائداعظمؒ نے اپنی ۲۱ مارچ ۱۹۴۸ء کی ڈھاکہ کی یادگار تقریر میں دو ٹوک انداز میں واضح کر دیا تھا:

"مجھے یہ بات بھی بالکل واضح کرنے کی اجازت دیجئے کہ پاکستان کی سرکاری زبان اُردو ہوگی اور کوئی زبان نہیں ہوگی جو کوئی بھی آپکو گمراہ کرنیکی کوشش کرتا ہے وہ حقیقت میں پاکستان کا دشمن ہے۔جب تک ایک سرکاری زبان نہ ہو کسی قوم میں بھی پائیدار اتحاد قائم نہیں ہوسکتا"

سید منصور عاقل نے صحیح فرمایا کہ خود اقوام متحدہ کا ذیلی ادارہ یونیسکو اپنے ایک عالمگیر

سروے (۲۰۰۸ء) میں بتا چکا ہے کہ اُردو دنیا بھر میں سب سے زیادہ بولی اور سمجھی جانیوالی تیسری عالمی زبان ہے۔ کتنا افسوس ہے کہ بار بار توجہ دلانے کے باوجود ہماری وزارتِ خارجہ نے اس حوالے سے اقوام متحدہ میں ہمارے سفارتی مشن کو نہ متحرک کیا اور نہ یہ مطالبہ کیا کہ اُردو کو اقوام متحدہ کی سرکاری زبانوں میں شامل کیا جائے کہ اب یہ اُردو کا ناقابلِ تردید حق ہے۔

انتہائی افسوس کا مقام یہ ہے کہ ابتداء ہی سے وفاقی حکومت کا روّیہ غیر سنجیدہ رہا۔ احکامات کے باوجود وفاقی حکومت نے تاحال یہ واضح نہیں کیا کہ گزشتہ ۴۲ برس میں آئین کے آرٹیکل ۲۵۱ کے نفاذ کیلیے کیا اقدامات کیئے گئے اور اگر نہیں تو اس کا ذمہ دار کون ہے؟

اشرف علی۔ راولپنڈی

عرصہ دراز کے بعد فون پر آپ کی مسحور کن آواز سن کر بے حد مسرت حاصل ہوئی۔ دل کو محسوس ہوا کہ آپ اپنے مشن پر پوری طرح ڈٹے ہوئے ہیں بقول حالی ایسا محسوس ہوا:

بہت جی خوش ہوا حالی سے مل کر　　ابھی کچھ لوگ باقی ہیں جہاں میں

سہ ماہی 'الاقرباء' جس پابندی اور تسلسل سے خادم کو بھیجوایا جا رہا ہے اس کے لیے بہت ممنون ہوں۔ سالنامہ ۲۰۱۵ بھی حال ہی میں موصول ہوا۔ جس کے مطالعہ میں مصروف ہوں۔ اس میں اداریہ۔ مضامین۔ افسانے۔ ادبی شخصیات۔ حمد و نعت اور غزلیات جیسے موضوعات کا احاطہ کیا گیا ہے جن شخصیات کی تحریریں شامل کی گئی ہیں وہ دلچسپ اور نئی معلومات لئے ہوئے ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آپ نے مشرق و مغرب کے اہل قلم کے لئے ایک چمن زار فراہم کردیا ہے۔

اداریہ ''اردو ایوان عدل میں'' بہت خوب ہے اس سلسلے میں قائم مقام چیف جسٹس آف پاکستان کی کاوشیں قابل داد ہیں۔ اس ضمن میں آپ کی کاوشیں بھی بار آور ہوتی دکھائی دے رہی ہیں جو آپ عرصہ دراز سے مجلس شوریٰ ہمدرد اور دوسرے محاذوں پر کرتے چلے آرہے ہیں۔

آپ کی ہدایت کے مطابق یہ بندہ حقیر بھی 'الاقرباء' کے لئے کچھ تحریر کرنے کی کوشش کریگا۔ سرورق بہت خوب ہے۔

بندہ سردست اپنی کتاب، ''کتب اور کتب خانوں کی تاریخ'' آپ کی خدمت میں پیش کرنے کی سعادت حاصل کر رہا ہے۔ امید ہے کہ پسند آئیگی۔

قاضی ظہیر احمد۔ لاہور

'الاقربا' کا شمارہ جولائی۔ ستمبر ۲۰۱۵ء چند روز قبل میرے نئے پتے پر مل گیا۔ آپ کی اس نوازش کے لئے میں سراپا سپاس ہوں۔ ابھی مضامین سرسری طور پر دیکھے ہیں۔ جب لکھنے والے موقر ہوتے ہیں تو مضامین بھی اس کی عکاسی کرتے ہیں۔ اردو کو عدالت عظمیٰ کی ہدایت پر پاکستان میں بطور سرکاری زبان نافذ کرنے کے احکامات پر آپ کا سیر حاصل اداریہ پڑھا۔ آپ نے بجا طور پر اس موقع پر ہر اردو داں کے جذبات کی عکاسی کی ہے۔ کس قدر افسوس اور شرم کی بات ہے کہ وہ زبان جو ساری دنیا میں تیسرے نمبر پر بولی اور سمجھی جاتی ہے اسے نافذ کرنے کے لئے اسلامی جمہوریہ پاکستان میں عدالت سے رجوع کرنا پڑا۔ ابھی تک جس طرح سے لیت ولعل سے کام لیا جارہا ہے وہ حیرتناک ہے۔ غلامانہ ذہنیت ۶۸ سال گزرنے کے بعد بھی ختم نہ ہو سکی۔ سچ تو یہ ہے کہ اگر پاکستان میں اردو سرکاری زبان کے طور پر رائج ہوگئی تو آکسفورڈ اور کیمبرج کے تعلیم یافتہ یہاں جہلا میں شمار ہونے لگیں گے۔ کیونکہ انہیں 'قسطنطنیہ' لکھنا ایک جوئے شیر لانے کے مترادف ہوگا اور نسل در نسل حکمرانی کے خواب بکھر جائینگے۔ آپ نے سرورق پر قائداعظم کی تصویر اور اردو کو پاکستان کی سرکاری زبان کا حکم بجا طور پر رقم کیا ہے۔

امجد قریشی۔ بہاولپور

طالب خیریت بخیریت، سب سے پہلے یہ اعتراف کہ مجھ سے آپ کی نوازشات کا شکریہ ادا کرنے میں تاخیر ہوئی۔ میری بیماری، کچھ کوتاہی اس کا سبب بنی۔ بہر حال 'الاقرباء' کا تازہ شمارہ موصول ہوا، اس سے پہلے آپ کی کتاب مل چکی ہے۔ میرے پاس الفاظ نہیں ہیں جن سے میرے جذبات کا اظہار ہو۔ آپ کو دل کی گہرائیوں سے اردو کے شیدائیوں کی مبارکباد کہ آپ نے اردو بولنے والوں کی جنگ جیت لی ہے۔ اردو کے ساتھ جو زیادتی ہو رہی ہے اس کا ازالہ ہو

سکے گا اور اردو حقیقی معنوں میں ایک قومی، سرکاری دفتری زبان بن جائے گی۔ یہ کام بہت پہلے ہو جانا چاہیے تھا، ۱۹۷۳ء کے دستور میں یہ واضح کیا گیا تھا کہ دس سال کے اندر اردو کو قومی سرکاری زبان بنا دیا جائے گا لیکن کئی سال گزر گئے کوئی پیش رفت نہ ہوئی حالانکہ پنجاب میں ایک ادارہ بنایا گیا جس کے ذمے یہ کام لگایا گیا کہ دفتری اصطلاحات کا اردو میں ترجمہ کیا جائے، آپ بھی اس کے سربراہ رہے۔ خاصا کام ہوا، اسی طرح وفاقی سطح پر مقتدرہ قائم کی گئی جس نے دفتری اصطلاحات کو اردو میں ڈھالنے کا کام کیا اور حکومت کو یقین دلایا کہ اردو زبان یہ صلاحیت رکھتی ہے کہ اسے سرکاری دفتری زبان بنا دیا جائے، لیکن ملک کی بیوروکریسی نے دستور کی خلاف ورزی کرتے ہوئے اردو کو وہ مقام نہ دیا جو اس کا حق تھا۔

سید صاحب! آپ کو یاد ہوگا کہ جب آپ بہاولپور میں تھے تو ہم سب دوستوں نے مل کر ایک ادبی ادارہ ''حلقہ ارباب ادب'' قائم کیا جس کے زیر اہتمام کل پاکستان اردو کانفرس منعقد ہوئی۔ اس ادارے کے صدر سید شہاب دہلوی مرحوم تھے، راقم امجد قریشی کو جنرل سیکرٹری منتخب کیا گیا۔ کل پاکستان اردو کانفرس کی صدارت بابائے اردو مولوی عبدالحق نے کی، جس میں قرارداد منظور کی گئی کہ بانی پاکستان قائداعظم محمد علی جناح کے حکم کے مطابق اردو کو سرکاری و قومی زبان بنایا جائے۔ جبکہ قائداعظم نے ڈھاکہ میں خطاب کرتے ہوئے اعلان کیا تھا کہ کوئی یہ نہ سمجھے کہ پاکستان کی زبان اردو نہیں ہوگی، میں واضح اعلان کرتا ہوں کہ اردو ہی پاکستان کی قومی و سرکاری زبان ہوگی۔ تاہم ہزاروں کیوسک پانی پلوں سے گزر گیا لیکن حکومت نے کوئی کاروائی نہیں کی، یہ افسوسناک بات تھی۔ اللہ تعالیٰ کی مہربانی ہے کہ آزاد عدلیہ نے سوموٹو ایکشن لیتے ہوئے حکومت کو حکم دیا کہ فوری طور پر اردو کو سرکاری و دفتری زبان بنا دیا جائے۔ آزاد عدلیہ کے اس حکم کے بعد پیش رفت ہوتی دکھائی دے رہی ہے، آزاد عدلیہ نے یہ بھی حکم دیا کہ ماتحت عدالتوں سے لے کر اعلیٰ عدالتوں تک کی زبان اردو ہونی چاہیے، چنانچہ یہ ذکر ضروری ہے کہ گذشتہ سال عدالت عالیہ کے ایک جج نے اردو میں فیصلہ لکھ کر یہ ثابت کر دیا کہ اردو زبان سرکاری و دفتری

زبان بننے کی صلاحیت رکھتی ہے میری تجویز ہے کہ اردو کو اس کی حیثیت دلوانے کے لیے ضروری ہے کہ مقابلے کا امتحان اردو میں لیا جائے۔ اس کے علاوہ دارالترجمہ قائم کیا جائے جس کے لیے اردو کے ماہرین کی خدمات حاصل کی جائیں جو سائنس اور میڈیکل کی کتابیں اردو میں ترجمہ کریں، اس کا کامیاب تجربہ حیدرآباد میں ہو چکا ہے۔ حیدرآباد (دکن) میں قانون اور میڈیکل کی تعلیم اردو میں دی جاتی تھی۔ اب بھی ایسا ممکن ہے، اردو زبان کے ایسے ماہرین موجود ہیں جو یہ کام کر سکتے ہیں، اس لیے ضروری ہے کہ جتنی جلد ہو سکے یہ کام کیا جائے۔

سید صاحب! یہ خط طویل ہو گیا ہے 'الاقرباء' کے بارے میں کہنا یہ ہے کہ تازہ شمارہ اپنی روایت کے مطابق تشکیل دیا گیا ہے، اعلیٰ مقالات، افسانے، حمد و نعت، غزل و نظم کا ایک خوبصورت گلدستہ ہے۔ جس طرح رنگ برنگ پھولوں کو چنا جاتا ہے اسی طرح آپ نے 'الاقرباء' کو ادب کا خوبصورت گلدستہ بنا دیا ہے۔ آپ مبارک باد کے مستحق ہیں، آپ نے ایک مشکل کام کو آسان کر دیا ہے۔ اس شمارے میں ''اُمت کا ارتقاء'' کے عنوان سے ایک مقالہ شائع ہوا ہے جو خصوصی اہمیت کا حامل ہے، یہ مقالہ معلومات کا مرقع ہے، اسی طرح علامہ اقبال کے فلسفے کے بارے میں ایک مضمون شائع ہوا ہے وہ بھی قابل قدر ہے۔

سید صاحب! اپنے بارے میں کیا عرض کروں۔ بیمار ہوں اور تنہائی کا شکار ہوں، لکھنا مشکل ہے اور چلنا پھرنا محال، تنہائی کا زہر خون بن کر رگوں میں دوڑتا ہے، اس کا تریاق کتاب میں ہے جو میں نے اختیار کیا ہے پہلے اللہ تعالیٰ کی کتاب قرآن کریم اور سیرت نبی ﷺ اور اسلامی کتابوں کے علاوہ افسانے، نثر کی جو بھی کتاب آتی ہے پڑھ لیتا ہوں۔ ایک نیک تمنا کے ساتھ اجازت کہ اللہ آپ کو زندگی اور صحت عطا فرمائے، آپ اسی طرح اردو کی خدمت کرتے رہیں۔ (آمین)

محمد فیصل مقبول عجز۔ لاہور

آپ نے علمی و ادبی جریدہ "الاقرباء" جلد نمبر :۱۸ شمارہ نمبر:۱ (جنوری۔ مارچ ر اپریل۔ جون) میں مضمون بہ عنوان "داغ دہلوی اور نظام شاہ رام پوری" شائع کر کے بندۂ ناچیز کو

شکریہ کا موقع دیا۔ میں بے حد شکر گزار ہوں کہ آپ نے مضمون کو دقیق نظری سے مطالعہ کیا اور چند اشعار کی تصحیح کی جانب توجہ مبذول کروائی۔ بندہ ان اشعار کی تصحیح ضروری سمجھتا ہے۔

۱۔۔۔ صفحہ نمبر ۷۶ پر دیوان گلزار داغ غزل نمبر:۴۹ کا مطلع یوں ہی درج ہے۔

کن بے کسوں کا پردہ یہ چرخ کہن ہوا ‏ ‏ جیتوں کا پیرہن نہ مردوں کا کفن ہوا

۲۔۔۔ صفحہ نمبر ۷۲ پر استاد ذوق کی غزل نمبر:۱۸۹ کا درست مطلع یوں ہے۔

حالت نشے میں دیکھنا اس بے حجاب کی ‏ ‏ ہر ناز و ہر ادا میں ہے مستی شراب کی

۳۔۔۔ صفحہ نمبر ۷۳ پر گلزار داغ غزل نمبر:۲۶۷ کا درست مطلع یوں ہے۔

جنوں میں تن پہ لباسِ غرور باقی ہے ‏ ‏ کب اپنے پاس کفن کو بھی تار باقی ہے

۴۔۔۔ صفحہ نمبر ۸۲ پر نظام رام پوری کی غزل نمبر:۲۰ کا درست مطلع یوں ہے۔

یوں غیر کا حال زار ہو گا ‏ ‏ تم کو ہی اعتبار ہو گا

ناچیز آپ کی بے حد حوصلہ افزائی کا شکر گزار ہے۔ شمارہ میں شامل مضامین کی درجہ بندی اور جملہ مضامین بہت علمی، ادبی اور معیاری ہیں بالخصوص اُردو زبان (لسانیات) کے حوالے سے مفید سفارشات اور سیر حاصل بحث کی گئی ہے۔ امید ہے آپ اپنی مشفقانہ رائے سے آگاہ کریں گے۔ دعاؤں میں یاد رکھیں۔

صابر عظیم آبادی۔ کراچی

الاقرباء کا تازہ شمارہ جولائی تا ستمبر ۲۰۱۵ء موصول ہو۔ زیر نظر شمارے میں نفاذ اردو سے متعلق آپ کا اداریہ قابل تحسین ہے۔ اس میں حکومت کی جانب سے جو کوتاہی برتی گئی ہے اس کا محاسبہ آپ نے بڑے اچھوتے انداز میں کیا ہے۔ شمارے میں شامل مضامین اور مقالات بہت معیاری اور جامع ہیں جو بڑی عرق ریزی سے لکھے گئے ہیں۔

''تصور ملت پر ایک نظر'' میں محمد طارق غازی نے مختلف نظریات کا احاطہ کیا ہے جو معلومات

میں اضافہ کرتا ہے۔ مضمون ''حج سفرناموں میں حجاز کی سماجی، تہذیبی اور ثقافتی زندگی کے نقوش''
میں ڈاکٹر محمد شہاب الدین نے حجاز کے مختلف علاقوں کی سیر کرائی ہے اور وہاں کی سماجی، تہذیبی اور
ثقافتی زندگی کو بڑے عمدہ طریقے اور تفصیل سے اجاگر کیا ہے۔ گوشۂ اقبالیات کے دونوں مضامین
قابلِ مطالعہ ہیں۔ نظموں اور غزلوں کا حصہ بے حد معیاری ہیں۔ کتابوں پر آپ کا تبصرہ بہت خوب
ہے۔ چند تخلیقات ارسالِ خدمت ہیں۔

کرامت بخاری۔ لاہور

الاقرباء نظر نواز ہوا اور زیرِ مطالعہ رہا۔ مقالات میں ڈاکٹر نورینہ تحریم بابر اور ڈاکٹر گل
ناز بانو اور اقبالیات میں برادرم مسلم شمیم کا مضمون بہت فکر انگیز ہے۔ یادِ رفتگان میں چھپنے والی نادر
ونایاب تصویر اگر تھوڑا سا (Enlarge) کردی جائے اور ٹائٹل کے اندرونی کارڈ پر یا Back
Title کے کارڈ پر چھاپ دی جائے تو زیادہ واضح ہو جائے گی، کیونکہ یہ Glazed پر آجائے گی۔
جسے لوگ اپنے پاس محفوظ کرسکتے ہیں۔ پروفیسر انوار صاحب اور حسن عسکری صاحب نے مرحومین کو
یاد کیا اور بہت ہی اچھے انداز میں یاد کیا۔ یہ ہمارا ادبی ورثہ ہے اور سب راہِ رفتگاں پر ہیں:

میرا پیچھا نہ کرائے زندگانی
میں راہِ رفتگاں پہ چل رہا ہوں

انشائیہ، متفرقات، حمد و نعت، غزل، نظم، سارے مندرجات بہت مؤثر ہیں، دل کو
چھو لینے والی تخلیقات ہیں۔ اویس الحسن کی غزل سے وہ مشہور غزل ''تم آئے ہو نہ شبِ انتظار
گزری ہے'' جسے گایا گیا ہے یاد آئی۔ صابر صاحب کی رباعیات بہت اچھی ہیں۔ رباعی کے بہت
سے اوزان ہیں مگر یہ سب سے زیادہ مقبول وزن ہے اور رباعی بہت کم کم لکھی جارہی ہے۔

برادر مکرم نوید سروش اور محترم زہیر کنجاہی نے یاد فرمایا اس کے لئے ممنون ہوں۔
دعاؤں کے ساتھ کہ اللہ تعالیٰ اِن کے نام، کام، مقام اور کلام میں اضافہ و برکت عطائے فرمائے۔
ایک مضمون اور تخلیقات روانہ کررہا ہوں ''گر قبول افتد زہے عز و شرف''۔

حکمت اور گھریلو چٹکلوں کا سلسلہ بہت ہی مفید ہے اسے جاری رکھئے۔ میں خود پولن

الرجی کا شکار ہو کر اسلام آباد سے بھاگا ہوں۔ اس کا بھی ضرور کوئی حل نکالئے۔

ڈاکٹر سید قاسم جلال۔ لاہور

اس سے قبل اپنا حال ہی میں شائع ہونے والا فارسی شعری مجموعہ (دو نسخے) آپ کو ارسال کر چکا ہوں لیکن تا حال اس پر تبصرہ نہیں ہوا۔

براہِ کرم اس پر کسی قریبی شمارے میں تبصرہ کرا دیں۔ ممنون و شکر گزار ہوں گا۔ الاقرباء کا تازہ شمارہ نظر نواز ہوا۔ "الاقرباء" کی نگارشات کا معیار حسب سابق نہایت بُلند ہے۔ آپ اور آپ کی ادارتی ٹیم مبارکباد کی مستحق ہے۔ خداوند تعالیٰ آپ کو تندرست رکھے اور دنیاوی و اُخروی کامرانیوں سے ہم کنار کرے۔ اپنی دو غزلیں برائے اشاعت ارسال کر رہا ہوں۔ حضرت سید منصور عاقل صاحب کو میرا خصوصی سلام عرض کر دیں ممنون ہوں گا۔

رشید آفرین۔ سیالکوٹ

وہ لمحہ میرے لئے کتنا خوش آئند تھا جب میں نے محترم جناب ڈاکٹر تصدق حسین صاحب (المعروف بسم اللہ سرکار) کی زبان سے آپ ایسی ادب شناس اور ادب پرور شخصیت کا اور آپ کے منفرد اور مثبت اندازِ فکر کے حامل عالمی جریدے سہ ماہی الاقرباء کا ذکر سنا اور جب پہلے پہل میں نے آپ سے فون پر رابطہ کیا تو ایک خوشگوار حیرت کا سامنا کرنا پڑا۔ آپ نے اس قدر اپنائیت اور خوش دلی سے بات کی کہ میں آپ کی عظمت اور خلوص و محبت کا گرویدہ و شیدا بن کر رہ گیا۔ آپ نے مجھے دنیائے ادب کی نامور ہستیوں کے کاروانِ شوق میں شامل کرنے کا اعزاز بخشا جس کے لئے میں آپ کا تمام حیات احسان مند رہوں گا۔

لیجئے ۱۲ اکتوبر ۲۰۱۵ء کو ٹیلی فون پر ہونیوالی گفتگو کے پیشِ نظر ایک غزل اور ایک رومانوی نظم دونوں حاضر ہیں۔ فیصلے کا حق آپ کو حاصل ہے جو مجھے من و عن قبول و منظور ہو گا۔

صبیحہ رحمان ۔ کراچی

پچھلے دنوں اپنی بھتیجی کی شادی میں شرکت کے لئے امریکی ریاست ساؤتھ کیرولائنا جانے کا اتفاق ہوا۔ خاندان کے افراد پر مشتمل خوش آئند یادگار محفلوں میں موسیقی اور چند ادبی و شعری نشستیں بھی منعقد ہوئیں۔ اس دوران 'الاقربا' سے متعارف ہونے کا موقع بھی ملا۔ امّی کی لائبریری میں گزشتہ چند سالوں کے دیدہ زیب شماروں اور اس کے مندرجات کے تنوع اور معیار کو دیکھ کر بہت متاثر ہوئی۔ دل چاہتا تھا کہ تقریب کی گہما گہمی سے فرصت ملے تو پہلے ان کی ورق گردانی کی جائے اور پھر اطمینان سے مطالعہ کیا جائے۔ مگر ایسا نہ ہو سکا اور یہ حسرت لئے کراچی واپس ہوئی۔ یہاں پہنچنے کے بعد اچانک دو دن قبل جولائی۔ ستمبر ۲۰۱۵ کا شمارہ جلوہ افروز ہوا۔ اِلّا ماشا اللہ۔ حیران ہوں کہ اپنی جانب سے کسی تگ و دو کے بغیر یہ دلی آرزو کس طرح بر آئی، اور آپ کو میرے ادبی ذوق اور 'الاقربا' کی پسندیدگی کا کس طرح علم ہوا؟ اس رازِ سربستہ پر آپ ہی کچھ روشنی ڈال سکتے ہیں۔ بے حد ممنون ہوں اس لئے کہ نہ صرف مجھے بلکہ جاوید کو بھی شعر و ادب سے بے حد دلچسپی ہے۔ یہاں آکر کچھ شب بیداریوں کا قرض اتار رہی ہوں اور کچھ طبیعت بھی ناساز ہوگئی ہے۔ جو کچھ اب تک پڑھا ہے وہ بہت معیاری ہے۔ صحت یابی پر انشا اللہ جلد اس کا باقائدہ مطالعہ کروں گی۔ اس وقت صرف رسید سے مطلع کر رہی ہوں۔ سرورق پر بابائے قوم رحمتہ اللہ علیہ کی ۱۹۴۸ کی تقریر کا اقتباس اور آج قومی زبان کو سرکاری طور پر قومی زبان قرار دینا ہماری قیادت کی مستعدیٔ فکر کی آئینہ دار ہے۔ رسالہ جاوید کے قبضہ میں ہے جو اس کے معترف و مدّاح بھی اور آپ کے بے حد شکر گزار بھی ہیں۔

خبرنامہ

الاقرباء فاؤنڈیشن

(اراکین کیلئے)

مرتبہ
سیدہ سارہ سلمان

احوال وکوائف

○ نائب صدر الاقرباء فاؤنڈیشن اور مدیر مسئول سہ ماہی 'الاقرباء' محترمہ شہلا احمد صاحبہ امریکہ میں اپنے اعزاء کے پاس قیام کے بعد ۴ ستمبر ۲۰۱۵ء کو واپس پاکستان تشریف لے آئیں تھیں لیکن کچھ ہی دنوں بعد ہائی بلڈ کے باعث بائیں جانب سٹروک ہوا اور الحمداللہ چند ہفتوں کے بعد علاج کے بعد بڑی حد تک اُن کی صحت بحال ہوگئی۔

آج کل وہ اپنی بھانجی کے بیٹے کی شادی میں شرکت کے لئے کراچی گئی ہوئی ہیں۔ ادارہ اُنکی مکمل صحت یابی کے لئے دعا گو ہے اور اُنھیں بھانجی کے بیٹے کی شادی پر دلی تہنیت پیش کرتا ہے۔ اُمید ہے وہ وسط جنوری ۲۰۱۶ء تک واپس اسلام آباد پہنچ جائیں گی اور حسبِ معمول اپنے اہم تنظیمی اور صحافی فرائض کی انجام دہی میں مصروف ہو جائیں گی۔ قارئین 'الاقربا' سے التماس ہے کہ وہ اُن کی صحت وتندرستی کے لئے دعا فرمائیں۔ شکریہ!

○ تقریبات

الاقرباء فاؤنڈیشن کے رکن سید و بیگم منور عالم کی بڑی بیٹی سیدہ شیبہ فاطمہ اور بیٹے سید مہروز عالم کی منگنی کی پُر رونق تقریبات رواں سہ ماہی میں منعقد ہوئیں جن میں فریقین کے قریبی اعزاء و اقارب اور مخصوص احباب کے افرادِ خاندان نے شرکت کی۔ میزبان گھرانے کی طرف سے پُر تکلف عشائیہ کا اہتمام کیا گیا تھا۔ شرکاء نے متعلقہ خاندانوں کو مبارکباد پیش کی اور اجتماعی دعاؤں اور نیک تمناؤں کا اظہار کیا۔

ادارہ سہ ماہی 'الاقرباء' اس مبارک موقع پر دل کی گہرائیں سے سید منور عالم۔ اہلیہ اور خاندان کے جملہ اراکین کو تہنیت پیش کرتا ہے اور دعا گو ہے کہ عزیزہ شیبہ فاطمہ اور عزیزی مہروز عالم کے ازدواجی زندگی کی اس نوید کو رب العزت متقبل کی مسرتوں اور شادمانیوں کا پیش خیمہ بنا دے۔ (آمین)

مرتبہ

سیدہ سارہ سلمان

گھریلو چٹکلے

- **ہائی بلڈ پریشر کے لئے:** صبح روزانہ لہسن کے دو جوئے اور ایک چمچ شہد کھانے سے بلڈ پریشر کنٹرول رہتا ہے۔
- **موٹاپا دور کرنے کے لئے:** کھانا کھانے کے بعد تھوڑی سی اجوائن پانی کے ساتھ کھالی جائے تو موٹاپا دور ہو جاتا ہے۔
- **ہاتھوں سے لہسن کی بدبو دور کرنا:** ہاتھوں میں سے اگر لہسن اور پیاز کی بدبو آ رہی ہو تو ٹوتھ پیسٹ سے ہاتھ دھو لیں بدبو ختم ہو جائے گی۔
- **اخروٹ کے فائدے:** اخروٹ کا روزانہ استعمال کینسر، یورک ایسڈ اور ہائی کولیسٹرول سے بچاتا ہے۔
- **دماغی کمزوری اور دائمی نزلہ کا علاج:** سات عدد بادام اور سات عدد کشمش رات کو بھگو کر رکھ دیں۔ صبح دونوں چیزیں نہار منہ کھالیں۔ ۲ سے ۳ ماہ میں انشاء اللہ نزلہ اور دماغی کمزوری دور ہو جائے گی۔
- **میتھی کی کڑواہٹ دور کرنے کے لیے:** میتھی کی کڑواہٹ دور کرنے کے لیے اُس کو ۱۵ منٹ کے لئے ہلدی اور نمک والے پانی میں بھگو دیں اور دھو کر استعمال کریں۔
- **شہد کی مکھی کے کاٹے کا علاج:** اگر شہد کی مکھی یا کوئی اور کیڑا کاٹ لے تو اُس جگہ فوراً ہلدی کا لیپ کر دیں۔ سوجن اور تکلیف ختم ہو جائے گی۔